نیرنگیٔ بخت
یعنی
میری اپنی کہانی
وزیر سلطان جالندھری
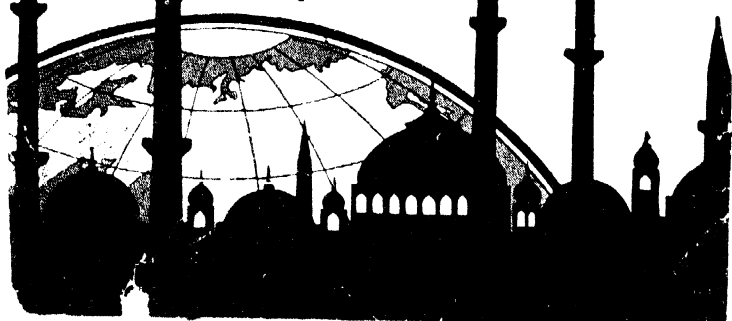
نیرنگیٔ بخت

یعنی

میری اپنی کہانی

حصہ اول

از خامہ

وزیر سلطان بیگم جالندھری

سنہ ۱۹۴۲ء

پبلشر

سید ذکاءاللہ شاہ۔ کوٹ لپشکہ۔ جالندھر

قیمت دو روپے

”دنیا میں حقیقت افسانے سے زیادہ تعجب خیز“

”رسکن“
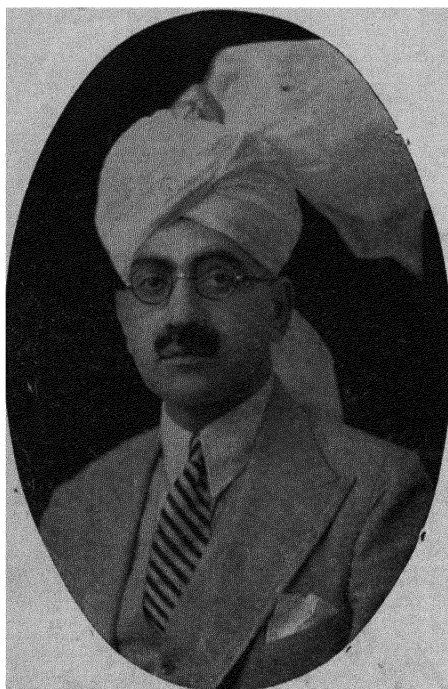
آنریبل خان بہادر میجر سردار سر سکندر حیات خان
کے۔بی۔ای وزیر اعظم پنجاب

Printed by The Taj Company Ltd. Lahore

پیشکش!

سیاہی اور کاغذ کے اس بے وقعت انبار کو جس میں دادا جان قبلہ کی شان وشوکت کے ہمرکاب میری کرب آمیز زندگی سسکیاں بھر رہی ہے۔ اپنی کم مائیگی کا اعتراف کرتے ہوئے اپنے عزیز ترین وگرامی قدر پھوپھی زاد بھائی آنریبل خان بہادر میجر سردار سر سکندر حیات خان بالقابہ وزیر اعظم پنجاب کے نام نامی سے معنون کرنے کی جسارت کرتی ہوں۔

ایں ہدیۂ ناچیز اگر افتد قبولِ خاطرش
باشم عزیز ومفتخر تا زم نصیبِ خویش را

وزیر سلطان

جالندھر شہر
یکم جنوری ۱۹۴۲ء

د

تعارف

ذرہ ذرہ دہر کا زندانیِ تقدیر ہے
پردہ مجبوری و بے چارگی تدبیر ہے
آسماں مجبور ہے شمس و قمر مجبور ہیں
انجمِ سیماب پا رفتار پر مجبور ہیں
"اقبال"

اس حقیقت کے تحت میں انسان بھی ان حیرت انگیز واقعات کو برداشت کرنے پر مجبور ہے۔ جو اس عالمِ فانی میں اسے درپیش رہتے ہیں۔ لہذا ایک مشہور و معروف انگریز مصنف کا قول ہے۔ کہ

"حقیقت افسانے سے زیادہ تعجب خیز ہوتی ہے"

یوں تو ہر داستان اپنے اندر التفات کی ایک لازوال قوت رکھتی ہے۔ مگر وہ حکایت جو حقیقت پر مبنی ہو۔ اور وہ روئیداد جو صداقت کی حامل ہو۔ ایک سحرِ حلال ہے۔ جس کی کشش انسانی دل و دماغ کو اس طرح اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے۔ جیسے مقناطیس لوہے کو۔ اور چاند کی کرنیں سمندر کی لہروں کو۔

عرض

''نیرنگیٔ بخت'' یعنی اس کتاب کا عنوان بذاتِ خود ایک مکمل افسانہ ہے۔ جس میں انسانی زندگیوں کے نشیب و فراز اور عروج و زوال کی عبرت انگیز داستان پوشیدہ ہے۔ جس میں بیک وقت لاکھوں اُمیدیں دم توڑتی ہیں۔ اور کروڑوں بلائیں کروٹیں لے رہی ہیں۔ جس میں کامرانی کا ہر دور موسمِ بہار کی طرح چشم زدن میں خزاں رسیدہ ہو کر رہ جاتا ہے۔

یہ کتاب ایک ایسی معزز اور جلیل القدر و محترم خاتون کی روئیدادِ حیات ہے۔ جس کے در پر کبھی آسمان جیسے بلند عزم والی شخصیتیں جبیں سائی کرنا باعثِ صد افتخار سمجھتی تھیں۔ مگر آج اصولِ دنیا کے مطابق ان کی معراجِ زندگی انجام کی طرف مائل ہے۔

۱۹۳۶ء میں ''الزہرا'' کے اجراء کے بعد سب سے پہلے میرا خیال جس طرف ملتفت ہوا۔ وہ مکرمہ مخدومہ وزیر سلطانہ صاحبہ کا یہ افسانہ زندگی تھا۔ جسے میں نے کسی نہ کسی طرح شائع کرنے کی اجازت حاصل کر لی۔ لیکن مسودے کی عبارت بہت کچھ اصلاح طلب تھی۔ اور میرے پاس فرصت عنقا۔ بہر کیف میں نے پوری توجہ صرف کر کے مسلسل پانچ باب ''الزہرا'' میں شائع کئے جس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ میرے پاس بے شمار خطوط آنے لگے۔ کہ ''اس طویل افسانے کو کتابی صورت میں ہونا چاہیئے''۔

آخر ۱۹۳۹ء میں میری پُر زور سفارش پر محترمہ موصوفہ اپنی روئیدادِ زیست کو کتابی شکل میں شائقین تک پونچانے کے لئے رضامند ہو گئیں۔ مگر

ان کی نظرِ انتخاب نے ؎

"قرعۂ فال بنامِ منِ دیوانہ زدند"

کے مصداق پورے مسودے کا پلندہ مجھے سونپ دیا۔ اسے قسمت کا چکر کہئے یا محض اتفاق۔ کہ ۱۹۴۰ء تک تو میں اپنی خانگی اُلجھنوں میں ہی کچھ اس حد تک گرفتار رہی۔ کہ مجھے ایک لمحہ بھر کی بھی مہلت نہ مل سکی۔ اس کے بعد خرابیِ صحت کے باعث دماغی کاوشیں طبیعت پر بار معلوم ہونے لگیں۔ غرضیکہ "نیرنگیٔ بخت" کی تاثیر مؤثر طریق پر برابر سدِ راہ بنتی رہی۔ بارے اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ آج اس اہم فرض کے ایک حصّہ کی تکمیل ہوگئی۔ اور عزم و ارادے کی لگاتار جد و جہد نے ناممکن امور کو ممکن کر دکھایا۔

کاغذ کے قحط اور اس گراں باری کے زمانہ میں کسی کتاب کی اشاعت کے اخراجات اور تکالیف کا صرف وہی لوگ اچھی طرح اندازہ لگا سکتے ہیں جنہیں کبھی اخباری دنیا سے واسطہ رہا ہو۔ بہرکیف میں محترمہ موصوفہ کے فراخ حوصلہ کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ کہ انہوں نے ان تمام مشکلات پر صرف اپنے "ایفائے عہد" کو ترجیح دی۔

یہ کتاب انسانی زندگی کے مد و جزر کی مکمل تصویر ہے۔ اسمیں ہندوستانی عورت کی بیچارگی کا جسقدر ماتم کیا گیا ہے۔ وہ بذاتِ خود ایک عریاں حقیقت ہے محترمہ موصوفہ نے ابتدا سے لیکر انتہا تک من و عن اپنی "آپ بیتی" صفحۂ قرطاس پر آپ کے سامنے پیش کر دی ہے۔ اور محض داستان کی زیبائش کے لئے انہوں نے حقیقت حال میں کوئی رنگ آمیزی نہیں کی۔

ش

اس کتاب میں تین عکسی تصاویر ان کی صداقت کی شاہد ہیں جن کی ترتیب حسب ذیل ہے :-

(۱) ان کے پھوپھی زاد بھائی آنریبل خان بہادر میجر سردار سر سکندر حیات خاں صاحب وزیر اعظم پنجاب (لاہور)

(۲) ان کے دادا جان قبلہ میاں غلام جیلانی صاحب مرحوم سابق وزیر اعظم ریاست کپور تھلہ) پنجاب -

(۳) برات کے چند معززین اور ان کے مرحوم شوہر عالی وقار میاں قمر الزمان صاحب اعلیٰ فوجی آفیسر - ریاست پونچھ -

نیز میاں بخت نصر و فرخ سیر کے علاوہ اور چند دیگر معزز اصحاب بھی اس گروپ میں شامل ہیں - جن کے اسمائے گرامی تصویر کی پشت پر لکھے ہوئے ہیں -

میں تمام علم دوست بھائی بہنوں سے پُرزور اپیل کرتی ہوں - کہ وہ خود اس کتاب کا مطالعہ کریں - نیز اپنے عزیزوں اور دوستوں کو توجہ دلائیں کیونکہ یہ کتاب جسمیں ہندوستان کی ایک معزز خاتون نے اپنی روئیداد حیات قلم بند کی ہے - اس کا تمام ہندوستانی شریف گھرانوں میں پڑھا جانا انتہائی عبرت انگیز اور بے حد سبق آموز ہوگا - مجھے اُمید ہے کہ میری یہ درخواست صدائے صحرا ثابت نہ ہوگی -

شمیم جالندھری منشی فاضل -

"مدیرہ الزہرا"

جالندھر ۴۱۳۲

عرض حال

مجھے اپنی داستانِ زندگی لکھنے کا خیال کس طرح پیدا ہوا؟

میرے متعلقین اور متعارفین خوب اچھی طرح جانتے ہیں۔ کہ میری تعلیم اس قابل نہ تھی۔ کہ میں اپنی سوانح حیات قلمبند کر سکتی۔ مگر اس سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔ کہ مجھے ہمیشہ ادبی اور علمی رسائل سے بیحد دلچسپی رہی ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ شاید اسی مطالعہ ہی کا نتیجہ ہے۔ جسے میں اب آپکی خدمت میں پیش کرنے کی جرأت کر رہی ہوں۔

یاد ش بخیر۔ مجھے جب کبھی اپنی بہنوں اور سہیلیوں سے ملاقات کا موقعہ ملتا۔ ان میں سے اکثر میرے حالاتِ زندگی افسانہ کی صورت میں میری زبان سے سننے کی مشتاق رہتی تھیں۔ عموماً جلسوں یا خاص خاص اجتماعوں کے بعد ہمارے فرصت کے چند گھنٹے آپ کی روئیداد زندگی سننے میں گزر جایا کرتے تھے۔

اسے اتفاق کی بات کہیئے یا تقسیم ازلی۔ ایک دن حسب معمول ایک شاندار زنانہ اجتماع میں شرکت کرنے کے بعد دستور کے مطابق ادھر ادھر کی خوش گپیاں ہو رہی تھیں۔ دورانِ گفتگو میں میری عزیز ترین بہن محترمہ "فردوس جہاں" نے میری زندگی کے چند اہم واقعات کی طرف میری توجہ مبذول کراتے ہوئے کہا۔
"آپ کی تمام زندگی ایک عجیب افسانہ ہے۔ میں اکثر سوچا کرتی ہوں۔ کہ اگر اس افسانے کو دنیا کے سامنے پیش کر دیا جائے۔ تو کتنی عبرت خیز چیز ہوگی"! ۔ میں نے محترمہ موصوفہ کے استفسار کے جواب میں عرض کیا۔ "کہ ساری دنیا بذاتِ خود ایک عجائب خانہ

ہے۔ ہر چیز کے تغیر و تبدل۔ اور ہر انسان کی زندگی کے انقلابات رنج و راحت کی ایک ایک مکمل داستان ہو سکتی ہے۔" مگر میری اس دلیل سے محترمہ موصوفہ کی تسلی نہ ہوئی۔ انہوں نے پھر کہنا شروع کیا: "اگرچہ انسانی زندگی کے تغیرات کو قدرت نے علیحدہ علیحدہ اصولوں میں محبوس کر رکھا ہے۔ مگر آپ کے حالات تو کچھ ایسے روح فرسا ہیں۔ کہ اگر مجھے مکمل طور پر معلوم ہو جائیں۔ تو میں ضرور اس دردناک افسانے کو احاطۂ تحریر میں لا کر پبلک کے سامنے پیش کر دوں۔ کیونکہ میں ایسے حقیقی واقعات کو قابل تحریر سمجھتی ہوں۔ علاوہ ازیں آپ کے ننہال۔ ددھیال اور سسرال کے شاہانہ حالات اس داستان میں چار چاند لگا دینگے۔"

یہ سنکر میں نے عرض کیا۔ کہ میں اپنی سیاہ بختیوں کے ساتھ اپنے ذی شان بزرگوں کے اسم ہائے گرامی کی تذلیل گوارہ نہیں کر سکتی۔ آخر میں اپنے شومی بخت کی کونسی تعریف کرونگی؟"

اس کے جواب میں محترمہ موصوفہ نے فرمایا۔ کہ "یہ کوئی ضروری امر نہیں ہے کہ آپ اپنی تعریف ہی لکھیں۔ اگر آپ اپنی زندگی کے حالات من عن قلمبند کر لیں۔ تو یہ ایک عبرت خیز حقیقی داستان کہلائے گی۔"

یہ تھی وہ زور دار تحریک جس نے میرے دماغ پر دھندلے نقوش چھوڑ دیئے اس گفتگو کے بعد ایک طویل عرصہ گزر گیا۔ مگر میری طبیعت "عمل" کی طرف کسی طرح بھی راغب نہ ہوئی۔

سنہ ۱۹۲۷ء میں رمضان المبارک کی ابتدائی تاریخیں تھیں اور کچھ مدت کے لئے مجھے بالکل تنہا رہنے کا اتفاق ہوا۔ طبیعت پر اداسی کا عنصر غالب تھا۔ لہذا میں

مشاغل کے طور پر کتب و رسائل کی پابند ہو کر رہ گئی۔

ایک شب سحری کے بعد طبیعت میں ہیجان سا برپا تھا۔ میں نے بغیر کسی ارادہ کے قلم اُٹھائی۔ اور اپنی زندگی کے کچھ حالات لکھنے شروع کر دئے۔ مگر یہ خیال بار بار میرے دل میں چٹکیاں لے رہا تھا "کہ کیا میری یہ پھیکی سی بے کیف تحریر کسی کو دکھانے کے قابل ہو سکتی ہے؟" مگر میرے ضمیر کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ قصہ مختصر میں انہیں خیالات میں غرق رہنے کے باوجود لکھتی گئی۔ حتّٰی کہ ایک ہفتہ عشرہ کے اندر میں نے پورے سائز کے کئی صفحات سیاہ کر ڈالے۔

حسن اتفاق سے ایک دن محترمہ فردوس جہاں صاحبہ کو (جو ایک علم دوست اور صاحبِ قلم خاتون ہیں) میں نے وہ مسودہ دکھایا۔ انہوں نے میرے طرزِ تحریر پر نکتہ چینی کئے بغیر میری بے حد حوصلہ افزائی کی۔ اس کے بعد اور بھی چند عزیزوں کو مسودہ دکھا لینے کے بعد میرا مکمل اطمینان ہو گیا۔ لہٰذا اب میں نے دلجمعی کے ساتھ سلسلہ وار زندگی کے واقعات و انقلابات لکھنے شروع کر دئے مجھے اپنی سوانح حیات میں عالمانہ خیالات اور تحریر کی رنگینی تو دکھانی مقصود نہ تھی۔ اس لئے میں نے اپنی زندگی کے نشیب و فراز کی ایک بے ربط سی داستان کو احاطۂ تحریر میں لا کر من و عن پیش کر دیا ہے۔ میں نہیں جانتی۔ کہ اپنی اس کوشش میں کہاں تک کامیاب ہوئی ہوں۔ البتہ اتنا ضرور کہوں گی۔ کہ ایک نامعلوم جذبہ تھا جس نے مجھ سے یہ طویل داستان لکھوا دی۔ اور مسلسل ڈیڑھ ماہ کی لگاتار جدوجہد سے کئی سو صفحات کی دکھ بھری داستان کا

ایک رف مسودہ تیار ہو گیا۔ مگر قسمت کا چکر دیکھئے کہ اس کے بعد کئی سالوں تک یہ مسودہ میرے تغیر حالات کے باعث صندوق کی زینت بنا رہا۔ اور اسے شائع کرنے کی نوبت نہ آئی۔ حتیٰ کہ ۱۹۳۶ء میں جب جالندھر سے عزیزہ شمیم جالندھری نے ایک ماہانہ مجلہ "الزہرا" کا اجرا کیا۔ تو مدیرہ موصوفہ کی فرمائش پر میں نے اپنا مسودہ انہیں سونپ دیا۔ میرے افسانہ زندگی کی مسلسل پانچ قسطیں "نیرنگی بخت" کے عنوان سے مدیرہ موصوفہ کی اصلاح کے بعد "الزہرا" میں شائع ہوئیں۔ اس پر ناظرات "الزہرا" کے متعدد خطوط اس افسانہ کو کتابی صورت میں شائع کرنے کے لئے دفتر "الزہرا" میں آنے لگے۔ لہٰذا مدیرہ موصوفہ نے مجھے پُرزور مشورہ دیا۔ کہ میں اپنی زندگی کی اس داستان کو کتابی صورت میں شائع کر کے پبلک کے سامنے پیش کر دوں۔ مگر اس طویل مسودے کی اصلاح کیلئے عزیزہ شمیم کے پاس بھی اتنا وقت نہ تھا۔ کہ وہ اسے سکون و اطمینان سے دیکھ سکتیں۔ تاہم انہوں نے اس کی تکمیل کا وعدہ کر لیا۔

یہ واقعہ مئی ۱۹۴۲ء کا ہے۔ مگر قسمت کی خوبی دیکھئے کہ عزیزہ محترمہ اس بار کو دوش پر لینے کے کچھ دنوں بعد ہی ایسی صاحب فراش ہوئیں۔ کہ تا دیر دہ کتاب کی طرف متوجہ ہی نہ ہو سکیں۔ جسکا لازمی نتیجہ یہ ہُوا۔ کہ مسودے کا ایک بڑا حصہ جو کتابت ہو چکا تھا۔ دیر تک پڑا رہنے کے باعث طباعت کے قابل ہی نہ رہا۔ لہٰذا دوبارہ کتابت کروانی پڑی۔ اس طرح تاخیر اشاعت کے علاوہ اس گرانباری کے زمانہ میں مصارف بھی کئی گنا بڑھ گئے۔ لیکن میں عزیزہ شمیم کی بے حد شکر گزار ہوں۔ کہ انہوں نے باوجود عدیم الفرصت ہونے کے اس کتاب کی تکمیل میں

ع

آخرکار پوری توجہ دیکر ہر ممکن طریق سے میرا ہاتھ بٹایا۔ اور حقیقت تو یہ ہے۔ کہ انہی کی کوششِ پیہم سے میرے "افسانہ زندگی" کی تکمیل ہوگئی۔ اور آج بفضل خدا میں اپنی حقیقی روئیدادِ حیات کو بغیر کسی حاشیہ آرائی کے ناظرین و ناظرات کی خدمت میں پیش کرنے کی جرأت کرتی ہوں ؎

حقیقت سے معمور ہے یہ کہانی!
سناتی ہوں دنیا کو اپنی زبانی!   شمیم

خاندان کے چند افراد کے سوائے باقی میں نے تمام اصل نام تبدیل کر دئے ہیں۔ تاکہ بزرگوں کی شہرت کو میری بدنصیبی کے باعث دھبہ نہ لگے۔

اگر میری یہ ناچیز سعی قبول خاطر ہوئی۔ تو اس کا دوسرا حصّہ بھی انشاءاللہ عنقریب قارئین کرام کی خدمت میں پیش کروں گی۔

خاک آگین

وزیر سلطان

غ

تبصرہ!

از محترمہ جنابہ لیڈی سر عبدالقادر

سابق جج ہائی کورٹ لاہور و ممبر کونسل سیکرٹری اوف سٹیٹ ہند (انگلینڈ)

نیرنگیٔ بخت

جس کا حصہ اوّل پیش نظر ہے۔ اس کی مصنّفہ محترمہ وزیر سلطان صاحبہ جالندھری نے اپنی آپ بیتی بہت مؤثر اور دلچسپ پیرائے میں لکھی ہے۔ انہوں نے اس قصّے کو بیان کرتے ہوئے انگلستان کے مشہور ادیب "رسکن" کے اس قول کو سنداً پیش کیا ہے کہ بسا اوقات "حقیقت افسانہ سے زیادہ تعجب خیز ہوتی ہے"۔ وزیر سلطان نے اپنی زندگی کے مختلف مراحل کے نشیب و فراز دیکھے ہیں اور اِس کتاب کے ذریعہ پڑھنے والوں کو دکھائے ہیں۔ وہ اس قول کی بہت تصدیق کرتے ہیں۔ ان کی قسمت نے جو پلٹے بارہا کھائے وہ یوں تو ایسے ہیں کہ ان میں سے ایک ایک تو کئی اور لوگوں کو بھی پیش آئے ہوں گے مگر بخت کی نیرنگی کا اتنا مجموعہ عام طور پر یکجا نہیں ہوتا۔ وزیر سلطان بچپن میں ایک بڑے گھرانے کی اکلوتی بیٹی ہے جو ناز و نعم میں پلتی ہے۔ جس کا باپ ایک ریاست کے وزیر کا بیٹا اور جس کی ماں کابل کے شاہی خاندان کی لڑکی ہے۔ جب وہ جوان ہوتی ہے تو اس کی شادی بہت

ف

دھوم دھام اور بڑی شان سے ایک خوش رو اور خوش خو نوجوان سے ہوتی ہے۔ جو ایک دوسری ریاست کے وزیر کا بیٹا ہے اور ایک بڑی جائداد کا مالک ہے۔ میاں بیوی کی آپس میں خوب بن آتی ہے۔ مگر چند سال تک کوئی اولاد نہ ہونے سے بیوی کو تردد لاحق ہوتا ہے اور وہ اپنے شوہر کی خیر خواہی اس میں سمجھتی ہے کہ وہ کسی طرح صاحب اولاد ہو جائے۔ اور وہ خود اپنے دل پر جبر کر کے اپنے شوہر کو یہ مشورہ دیتی ہے کہ وہ نکاح ثانی کرے۔ وہ پہلے تو نہیں مانتا۔ مگر پھر اس کے اصرار سے مان جاتا ہے۔ اور دوسری شادی کر لیتا ہے جس سے اس کی جائداد کا وارث ایک لڑکا پیدا ہوتا ہے۔ مگر اس کے جلد بعد وہ وفات پاتا ہے اور اس بے وقت موت کا سب سے بڑا باعث شراب کی عادت اور اس کی غیر معمولی کثرت ہوتی ہے۔ اس حادثہ سے اس گھر کا تار و پود بکھر جاتا ہے۔ اور ان لوگوں کی امیری غریبی سے بدل جاتی ہے۔ کیونکہ اس کے شوہر کا بڑا بھائی جو خاندان بھر کا نگران ہوتا خلل دماغ میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اور ان دونوں کی بربادی سے جائداد کا انتظام خراب ہو کر قرضخواہوں کے مطالبوں کی بدولت اس خاندان پر مصائب آ ٹوٹ پڑتے ہیں۔ ادھر وزیر سلطان کے والد جو اس کی خبر گیری کر سکتے تھے دفعتاً بیمار ہوتے ہیں اور اس دنیا سے رحلت کر جاتے ہیں۔ اس کے شوہر کی وفات کے بعد ایک خوشحال اور امیر رشتہ دار وزیر سلطان کو اپنے نکاح میں لانے کی خواہشمند ہوتے ہیں۔ مگر اسے اپنے پہلے شوہر کی محبت اور وفاداری مانع رہتی ہے

ق

باپ کے گذرنے کے بعد اس کی والدہ بھی بیمار ہو جاتی ہیں اس وقت اسے بڑی مصیبت کا سامنا ہوتا ہے۔ کوئی مونس و غمخوار نظر نہیں آتا۔ اور جوان بیوہ ہونے کی حیثیت سے اسے زندگی کی منزل بہت کٹھن نظر آتی ہے۔ اس وقت ایک اور شریف خاندان کے ایک تعلیم یافتہ نوجوان کو اس بیوہ سے ہمدردی پیدا ہوتی ہے اور وہ اسے پیغام نکاح دیتا ہے۔ اب حالات اسے مجبور کرتے ہیں کہ وہ اس پیغام کو بے توجہی سے نہ سنے۔ یہاں تک حال سننا کہانی کا حصہ اول ختم ہو جاتا ہے۔ باقی قصہ دوسرے حصے میں چھپے گا۔ غرض حصہ اول کے متعلق اتنا کہنا کافی ہے۔ کہ اس میں حسن و عشق کا عنصر جو عموماً فسانوں کی جان ہوتا ہے "موجود بھی ہے اور نہیں بھی" "نہیں" اس لئے کہ وزیر سلطان اور اس کے شوہر کا بیاہ پرانے طریق سے ہوا جس میں نہ دولہا نے دولہن کو دیکھا اور نہ دولہن نے دولہا کو۔ دونوں نے اپنے ماں باپ اور رشتہ داروں کے اعتبار پر ایک دوسرے کو اپنا سمجھ لیا تھا۔ مگر شروع ہی سے دونوں میں سچی الفت ہو گئی جو دن بدن بڑھتی گئی۔ شوہر بیوی کا دلدادہ ہو گیا اور بیوی شوہر کی جان نثار بن گئی۔ اور اس طرح حسن و عشق کا ملاپ ہو گیا۔ مگر افسوس آسمان اس ملاپ کو دیر تک نہ دیکھ سکا۔ وزیر سلطان صاحبہ نے روزمرہ کی زندگی کے معمولی واقعات کو ایسی اچھی طرح لکھا ہے کہ ان میں افسانہ کا سا لطف پیدا کر دیا ہے۔ اور

ک

کتاب کو ختم کئے بغیر چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ زبان سادہ اور عام فہم ہے۔ اور پڑھنے والوں کے لئے بعض اخلاقی سبق ضمناً اس تصنیف میں آگئے ہیں۔ مثلاً شراب سے جس درجہ خانہ خرابی ہوئی وہ اس میں بہت وضاحت سے درج ہے۔ تعلیم نسواں کی ضرورت اور اہمیت کو بھی اس میں واضح کیا گیا ہے۔ وزیر سلطان نے گو اپنی اچھی تربیت اور خلقی خوش فہمی کی بدولت اپنے سسرال میں بہت ہردلعزیزی حاصل کی۔ مگر اسے زندگی کے ہر مرحلے پر تعلیم کی کمی کا احساس ہوتا رہا۔ اور اپنی بیوگی کے بعد اسے یہ کمی اور بھی زیادہ محسوس ہوئی۔ اس کا خود اپنے شوہر کو نکاح ثانی پر مجبور کرنا بھی دراصل اسکی تعلیم کی کمی اور بعض دقیانوسی خیالات کے اس کے دماغ پر مسلط ہونے کا نتیجہ تھا۔ گو اس نے بڑی ہمت سے اپنی سوت کے ساتھ اچھا سلوک کیا۔ مگر جدید خیالات کی رو سے اس کا یہ عمل دانشمندانہ نہیں کہا جا سکتا۔ مگر اس کا جذبۂ ایثار پھر بھی اس کے دل کی خوبی کا پتہ دیتا ہے۔ اس کتاب کی اشاعت میں محترمہ شمیم صاحبہ کی کوشش کا بھی معتدبہ حصہ ہے۔ وزیر سلطان صاحبہ نے اسکی اشاعت کی اجازت بھی شمیم صاحبہ موصوفہ کی ترغیب سے دی ہے۔ اور مصنفہ کا مسودہ جو صاف شدہ نہ تھا۔ اور محتاج تصحیح تھا وہ بھی شمیم صاحبہ ہی نے صاف کیا ہے۔ دونوں کی محنت قابل داد ہے امید ہے کہ اردو خوان لڑکیوں کے لئے یہ کتاب خاص طور پر

دلچسپ ہوگی +

راقمہ

ا۔ ب عبدالقادر

لاہور

رائے گرامی

جناب رائیزادہ ہنسراج صاحب۔ ایم۔ ایل۔ اے
سنٹرل رئیس اعظم جالندھر شہر

بی بی وزیر سلطان بیگم ہمارے شہر جالندھر کے ایک نہایت ممتاز مسلمان گھرانے کی خاتون ہیں۔ ان کے دادا صاحب میاں غلام جیلانی ریاست کپورتھلہ میں وزیر اعظم اور نانا صاحب شہزادہ گوہر ملوک شاہ شجاع الملک والئے افغانستان کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے۔ وزیر سلطان بیگم کی شادی میاں نظام الدین وزیر اعظم ریاست پونچھ کے فرزند سے ہوئی تھی۔ مجھے ان کی کتاب نیرنگیٔ بخت یعنی "زندگی کی کہانی" دیکھ کر بہت مسرت ہوئی۔ کیونکہ انھوں نے

ل

اپنے حالات نہایت عمدہ الفاظ میں بغیر کسی بناوٹ اور رنگینی کے سادہ تحریر میں لکھے ہیں۔ جسے ہر معمولی اردو خوان آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ مجھے میرے معزز دوست۔ قاضی محبوب عالم رئیس اعظم جالندھر شہر کی زبانی معلوم ہوا ہے۔ کہ ان کے بزرگوں کے دیرانہ مراسم کی وجہ سے محترم موصوفہ ان کی گود کھلائی ہوئی چھوٹی بہن ہیں۔ اور انہیں اچھی طرح معلوم ہے۔ کہ محترمہ موصوفہ کو کسی باقاعدہ سکول میں تعلیم حاصل کرنے کا موقعہ ہی نہیں ملا۔ اور پردے کی وجہ سے "چار دیواری" کے اندر استانیوں کی مدد سے کچھ تھوڑی بہت تعلیم حاصل کی تھی۔ لیکن اس کے باوجود انہوں نے اپنے وقت کے تمام رسم و رواج۔ طریقہ عبادت و دیگر خانہ داری کی باتوں کے مشکل مضمون کو اچھی طرح سے ادا کیا ہے۔ ابتدا سے انتہا تک کتاب میں ربط اور تسلسل قائم ہے۔

قدرت نے خلقت ان موصوفہ کو فرائض مادری نہیں سونپے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ اب اولاد کی جگہ اس "سوانح حیات" کی اشاعت سے ان کی یادگار دنیا میں تادیر قائم رہے گی۔

رائے زادہ ہنسراج - ایم - ایل - اے

جالندھر شہر۔

۴

رائے گرامی

جناب محمد عبداللہ صاحب پروفیسر

ڈی۔ اے۔ وی۔ کالج جالندھر

کتاب اسم بامسمّی مخزن حالات زندگی کا ایک عبرت خیز نتیجہ ریز
مقدمہ انتخاب ہے۔ یہ سرسری خاکہ نہیں۔ بلکہ اپنی علمی افادیت کے
لحاظ سے مقابلتاً اس میں صبر و شکر۔ قناعت و توکل۔ فقر و غنا۔
بے ثباتی حیات۔ شکایت زمانہ۔ تسلیم و رضا۔ موافقت احباب و
اغیار۔ ملامت و رسوائی۔ مصائب متفرقہ۔ تمکین و وقار۔ و عجز
انکسار اور تاکید اعمال صالح ہمچو قسم مضامین ادب کو اشارۃً کنایۃً
وصراحتۃً بے حجاب و بے نقاب کر کے دکھایا گیا ہے۔

اس کتاب کے دور اوّل کا مضمون اس شعر کے مطابق ہے ؎

منم آں میوہ کز خامی بہ بستاں ہوس ماندم
زبس کہ ایّام با من کرد سردے نیم رس ماندم

اور دور ثانی یوں سمجھ لیجئے۔ کہ ؎

ناکام آرزوؤں کا مختصر فسانہ — روتی رہیں وفائیں ہنستا رہا زمانہ

ن

کہتے رہے ابھی تک اپنا ہی ہم فسانہ
کل داستاں ہماری دُہرائے گا زمانہ
دم خوردہ جنوں کی منزل کا کیا ٹھکانہ
منزل کو بھی تو ہم نے منزل کبھی نہ جانا

غرضیکہ انتہائی مسرت ہوئی۔ جبکہ خاکسار ہیچ کار رندگار کو نونہالِ سادات سیّد ذکاءاللہ نے لمحات مطالعہ کی اجازت دی بعد انقطاع دِلی آرزو ہے۔ کہ مطبوع خاطر ہر خاص و عام ہو۔ خصوصاً اگر مدارس پنجاب کی طالبات کے لیے لازمی یا غیرلازمی نصاب تعلیم کا جزو قرار دیا جائے۔ نیز لائبریریوں کی زینت بنے تو افادہ و استفادہ کا فیضانِ عام ہو سکے گا ؎

بر رسولاں بلاغ باشد و بس

عبدہٗ المعاصی
محمد عبداللہ۔ اویسی قادری
ایم۔ اے۔ ایچ۔ پی معلم السنہ شرقیہ
ڈی۔ اے۔ وی کالج جالندھر شہر
(پنجاب)

رائے گرامی

حضرت مولانا مولوی عبدالحق صاحب عباس بانی و مہتمم

مدرسۃ البنات جالندھر شہر۔

فطرت انسانی کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ انسان اپنے خیالات کے اظہار سے' پاکیزہ ہوں کہ قبیح' دوسروں کو اپنا ہمخیال بنائے' اور اپنے احساسات سے' وہ پُر مسرت ہوں یا المناک' اوروں کو متاثر کرے۔ اور جبتک وہ اپنے خیالات وحسیات کو ظاہر نہیں کر لیتا ایک بار سا دل و دماغ پر لئے رہتا ہے بعض طبائع میں تو یہ تقاضا اسقدر شدید ہوتا ہے کہ خیالات ومشاہدات اور تجربات و واردات کے تکرار بیان سے بجائے اکتا جانے کے ان میں زیادہ مستعدی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور مدت العمر اس میں کمی نہیں ہونے پاتی۔

طبع انسانی کی اس افتاد کا روشن پہلو یہ ہے کہ اس سے حق رسالت ادا ہوتا ہے۔ نیکی کی تبلیغ ہوتی ہے اور نصیحت و عبرت کا سامان مہیا ہوتا ہے۔ حکایت مسرت ہو تو لطف و شادمانی' قصہ الم ہو تو رقت قلب پیدا ہوتی ہے اور غمگساری و ہمدردی کے جذبات اُبھر آتے ہیں۔ اور یہ فضائل انسانیت کے اثرات ہیں۔ آپ بیتی سنانے کی ممیز تحریک عموماً اسی تقاضائے فطرت سے ہوتی ہے۔

"نیرنگیٔ بخت" اس وقت زیر نظر ہے یہ ایک ایسی خاتون کی ناتمام داستان حیات ہے جس کی رگوں میں ایسا خون دوڑ رہا ہے جس کی ترکیب میں،

۸

ماں کی نسبت سے، افغانستان کے ایک شاہی خاندان کا شرف موجود ہے اور باپ کی جانب سے پنجاب کے ایک بہت معزز و متمول گھرانے کا جو ہر فضیلت پنہاں ہے۔

ایک شاعر نے شکایت زمانہ کے طور پر حسرت ظاہر کی تھی

کون سُنتا ہے کہانی میری!
اور پھر وہ بھی، زبانی میری!

لیکن مصنفہ کتاب کیلئے موجب تسکین ہوگا۔ کہ سوسائٹی نے ان کی کہانی اس دلبستگی اور ہمدردی سے سُنی کہ اس کے اصرار پر وہ آج اس صورت میں ان کی زبانی اس لئے سُنی جا رہی ہے کہ ہر سُننے والا اسے دوبارہ سہ بارہ بلکہ جتنی مرتبہ چاہے سُن سکتا ہے۔

سب آپ بیتیوں میں حالات کا نشیب و فراز، حوادث کا وقوع، امیدوں کی پامالی، غیروں سے اذیت، اپنوں کی بیوفائی، رنج و ملال اور خوشی و راحت وغیرہ کی کیفیات ہوتی ہیں اور واقعات کی رنگا رنگی سے ان میں ایسی دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے۔ کہ سماعت اسے قبول کرتی جاتی ہے۔ اور اگر واقعات میں ندرت بھی ہو۔ تو کان مجسّم شوق بن جاتے ہیں۔ اس "آپ بیتی" میں اس عام شان لطافت کے علاوہ کچھ باتیں خاص دلچسپی کا سامان لئے ہوئے ہیں۔ کہا جاتا ہے۔

سخت است پس از جاہ تحکّم بُردن
خُو کردہ بہ باز جوبہ مردُم بُردن

یہ مجموعہ واقعات زیادہ تر اسی حقیقت کی سچی اور عبرت خیز تصویر ہے، اور

۶

جس کو بیان کرنیوالی اس صنف سے تعلق رکھتی ہے جسے آپ بیتی سنانیکا رجحان مرد سے بہتر ودیعت کیا گیا ہے اور پھر ایک ایسی خاتون کی زبان سے، جو نہ کسی اسکول کی تعلیمیافتہ ہے نہ اپنے گھر ہی میں باقاعدہ لکھ پڑھ سکی۔ واقعات کی ایسی اچھی ترتیب، ایسا انداز بیان جزئیات کی ایسی تفصیل کے ساتھ اس پہ ایک قوی الحافظہ فارغ التحصیل خاتون کی تصنیف و تحریر کا شبہ ہو۔ کس قدر لائق ستائش ہے۔

اس میں عام خاندانوں کو دولت مند ہندوستانی گھرانوں کے ماضی قریب کے تمدن کے نقوش واضح اور صاف ملیں گے۔

اس میں بعض مقامات ایسے بھی آتے ہیں کہ صفائی بیان نے واقعات کو تاثیر میں ڈبو دیا ہے۔ اور آنکھوں میں آنسو بے اختیار اُمڈ آتے ہیں۔

جہاں مصنفہ سے انکا قصہ زندگی سنکر ان سے دلی ہمدردی پیدا ہوتی ہے اور انکے پیرایہ بیان کی تعریف مُنہ سے نکلتی ہے کہ وہ اثراندازی میں ناکام نہیں رہیں، شاید بے انصافی ہوگی۔ اگر اُن سننے والی خواتین کی تعریف نہ کیجائے جن کے سُننے کی خوبی ایک آپ بیتی کو "نیرنگیٔ بخت" کی صورت دے گئی۔ ورنہ اس قحط کے زمانے میں کہ کھانے کو اناج کے دانے کا ملنا بھی مشکل ہو رہا ہے، ایک ضخیم کتاب کی طبع و اشاعت کی جرأت کرنا کتنا مشکل امر تھا۔

کہنے سننے کی گرم بازاری ہے ؛ مشکل ہے مگر اثر پرائے دل میں
ایسے سنئے کہ کہنے والا اُبھرے ؛ ایسی کہئے کہ بیٹھ جائے دل میں

سید ذکاء اللہ صاحب ناشر کتاب کی ہمت بھی بلاشک قابل داد ہے توقع کیجاتی ہے کہ یہ آپ بیتی شوق سے پڑھی جائیگی۔ اور ہندی خاتون کے ذوق تحصیل علم میں معاون ثابت ہوگی +

عبدالحق عباس ۔ مدرسۃ البنات جالندھر

ی

رائے گرامی

ماہر علم التواریخ سید عبدالقادر صاحب ایم۔ اے پروفیسر اسلامیہ کالج و ڈین ڈگری ڈیپارٹمنٹ پنجاب یونیورسٹی لاہور

محترمہ وزیر سلطان جنہوں نے اپنی داستانِ حیات "نیرنگیٔ بخت" کے عنوان سے لکھی ہے بہت بڑے خاندان کی چشم و چراغ ہیں۔ ماں کیطرف سے شاہ شجاع الملک و الئے افغانستان کی پرپوتی اور باپ کی طرف سے کپورتھلہ کے وزیر اعظم میاں غلام جیلانی انصاری کی پوتی ہیں۔ اِس لحاظ سے وہ نواب سر لیاقت حیات خاں سابق وزیر اعظم پٹیالہ اور سر سکندر حیات خاں وزیر اعظم پنجاب کی ماموں زاد بہن ہیں۔ محترمہ حُسنِ اخلاق کا مجسمہ۔ خودداری اور فہم و فراست کی جیتی جاگتی تصویر اور ان تمام خوبیوں اور صفات کا مجموعہ ہیں۔ جو ایک عالی نژاد اور عالی دودمان خاتون میں ہونی چاہئیں۔ محترمہ وزیر سلطان نے اپنی داستان حیات کے تنِ مُردہ میں از سر نو جان ڈالدی ہے طرزِ بیان اسقدر دلکش اور دلفریب ہے کہ تمام کتاب کو ایک ہی نشست میں ختم کرنیکو دل چاہتا ہے بعض حصے تو اسقدر دلگداز ہیں کہ پڑھتے پڑھتے بے اختیار آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں۔ دنیا میں بیسیوں لوگوں نے آپ بیتی بیان کی ہے اور انمیں سے اکثر اپنی اپنی جگہ بہت دلچسپ ہیں لیکن محترمہ وزیر سلطان کی آپ بیتی بہتر سے بہتر آپ بیتی سے کسیقدر کم نہیں۔ جیساکہ محترمہ وزیر سلطان کے عرض حال سے ظاہر ہے نیرنگیٔ بخت کی ترتیب و تدوین میں محترمہ شمیم ایڈیٹر رسالہ الزہرا کا بھی کچھ نہ کچھ حصہ ہے۔ انہوں نے نہ صرف محترمہ وزیر سلطان کو اپنی داستانِ حیات قلمبند کرنیکی ترغیب و تحریص دلائی بلکہ اسکے مسودے کو بھی حسب ضرورت درست کیا اسلئے ہمیں محترمہ موصوفہ کا ممنون ہونا چاہئیے کہ انکی توجہ سے ایک نہایت دلچسپ قابلقدر کتاب معرض وجود میں آئی جو مجھے اُمید ہے کہ نسوانی طبقے میں بالخصوص اور دوسرے علمی حلقوں میں بالعموم بہت دلچسپی سے پڑھی جائے گی۔

اسلامیہ کالج لاہور۔ ۱۵ مارچ سنہ ۴۲ء سید عبدالقادر ایم۔ اے پروفیسر
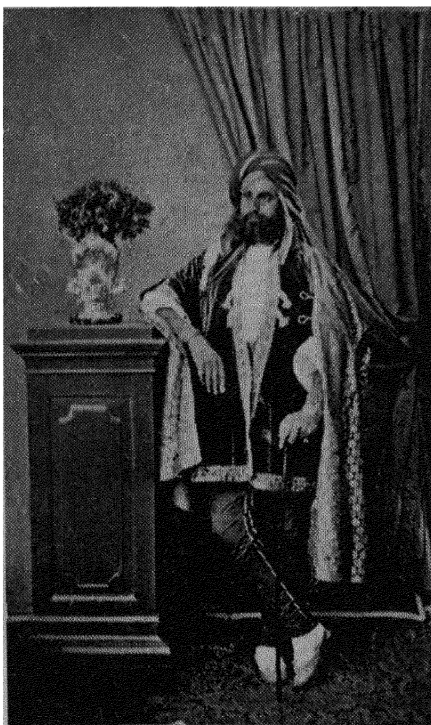
میاں غلام جیلانی (انصاری)
وزیر اعظم ریاست کپورتھلہ
سنہ ۱۸۷۰ء

Printed by The Taj Company Ltd. Lahore

نیرنگئ بخت

یعنی

میری اپنی کہانی

باب اوّل

راز اس آتش نوائی کا میرے سینہ میں دیکھ
جلوۂ تقدیر میرے دل کے آئینہ میں دیکھ "اقبال"

یادش بخیر

۱۸۷۰ء میں میرے دادا صاحب قبلہ شیخ میاں غلام جیلانی صاحب انصاری ریاست کپورتھلہ میں وزیر اعظم تھے۔ "دیوان رام جس" صاحب کے ساتھ دیر سے ان کے محبّانہ مراسم چلے آرہے تھے۔ اور دیوان صاحب کا ایک عزیز ترین دوست لدھیانہ میں سوداگر تھا جو اکثر بیگمات اور شہزادگان کے لئے تحائف لیکر جایا کرتا تھا۔ یہ اس زمانہ کا ذکر ہے جبکہ میرے دادا جان کے فرزند اکبر یعنی میرے والد صاحب میاں غلام محمد سن بلوغ کو پہنچ چکے تھے۔ ایک دن اتفاقیہ طور

پر انکی شادی خانہ آبادی کا ذکرِ خیر چلا۔ تو دیوان صاحب کے دوست نے کہا کہ لدھیانہ میں جو بادشاہ کابل کی اولاد ہے۔ اُن میں ایک یتیم بچّی بھی ہے۔ یہ سُنکر دیوان صاحب نے نہایت توجہ کے ساتھ اپنے دوست سے مفصل حالات دریافت کئے۔ اس پر سوداگر صاحب نے کہا۔ بادشاہ کابل شاہ شجاع الملک کی وفات کے بعد اُن کے بڑے بیٹے کے عہدِ سلطنت میں جب باغیوں نے غدر برپا کر دیا۔ تو شاہی خاندان نے کابل سے پنجاب کا رُخ کیا۔ اور لدھیانہ میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ انہیں ایام میں سلطنتِ برطانیہ نے ہمصری کی وجہ سے اُنکو خوب نوازا۔ اور حسبِ مراتب جاگیر وظائف مقرر کر دئے۔ گو سلطنت برباد ہو چکی تھی۔ تاہم اُن کی گزر اوقات بالکل شاہانہ تھی۔ چنانچہ شاہ شجاع الملک کا سب سے چھوٹا شہزادہ جن کا اسم گرامی گوہر ملوک تھا۔ نوجوانی میں ہی انتقال کر گیا۔ اُن کی اکلوتی بچّی کو اُس کی دادی صاحبہ بیگم عالیہ (جن کا اصلی نام راحت سلطان تھا۔ اور بادشاہ شاہ شجاع کی خاص حرم تھیں) اپنے جوان مرگ بچے کی نشانی سمجھکر اُسے اور نوجوان بیوہ کو سنبھالے بیٹھی ہیں۔ اُن کو وظیفہ بھی حسب گزارہ خزانہ سے ملتا ہے۔

دیوان صاحب یہ حالات سنکر دادا صاحب قبلہ سے مشورہ کرکے بیگم عالیہ کے پاس لدھیانہ پہنچے اور سوال کیا۔ بیگم عالیہ نے بھی حالات دریافت کرکے اپنی تسلی کر لی۔ اور کچھ دنوں تک سلسلہ جاری رکھ کر آخر انجام کو پہنچا دیا۔ شاہی دستور کے مطابق لڑکیوں کا رشتہ

اکثر اپنے خاندان کے سوا کسی دوسری جگہ نہ ہو سکتا تھا۔ لہذا باقی
شہزادگان نے یہ معلوم کر کے فساد شروع کر دیا۔ اور قسم قسم کے عذر
پیش کئے۔ آخر کار والئے ریاست مہاراجہ رندھیر سنگھ صاحب نے
اپنے خزانہ سے بہت سا روپیہ اس مقدمہ پر خرچ کیا۔ اور ہر ممکن کوشش
سے کامیاب ہو کر میرے والد صاحب کی شادی کر دی۔ میری والدہ صاحبہ
گوہر سلطان بیگم جن کی زبان بالکل فارسی تھی۔ اور اُن کی شکل و شباہت پر
بھی شہزادیوں کی سی لطافت موجود تھی۔ رفتہ رفتہ اُن کو پنجابی لباس اور پنجابی
زبان کی مہارت ہو گئی۔ بیگم عالیہ راحت سلطان میری نانی صاحبہ
خورشید جہاں کو اپنے ہمراہ لے کر والدہ صاحبہ سے ایک بار ملنے آئیں
تو باقی شہزادگان میں لدھیانہ کے اندر فساد ہو گیا تھا۔ لہذا نانی اماں نے
میری والدہ صاحبہ کے پاس ایک مکان کرایہ پر لے کر رہائش اختیار
کر لی۔ کیونکہ میری امی جان کی جدائی بیگم عالیہ راحت سلطان کو سخت
ناگوار گزرتی تھی۔ وہ ایک منٹ کیلئے جدا رہنا برداشت نہ کر سکتی
تھیں میری بزرگوار نانی صاحبہ بھی اس وقت جوان تھیں۔ بیگم عالیہ ان کو
بھی اپنی آنکھوں سے ایک لمحہ بھر کے لئے اوجھل نہ ہونے دیتی تھیں۔
کچھ عرصہ بعد بیگم عالیہ راحت سلطان کا انتقال ہو گیا۔ اور میری
نانی صاحبہ خورشید جہاں نے جب تک بقید حیات رہیں۔ والدہ صاحبہ
کے پاس وقت گذارا۔ میرے والد صاحب اُن کی بے حد عزت کیا
کرتے تھے۔ عرصہ چھ ماہ کے بعد نانی صاحبہ کا وظیفہ سرکار انگریزی

کے خزانہ سے لاکر دیا کرتے۔ میرے ساتھ نانی صاحبہ کی از حد محبّت
تھی۔ اپنی شیر خواری کے بعد عہدِ طفولیت بھی کچھ اچھی طرح یاد نہیں۔
البتّہ جب سے ہوش سنبھالا نانی امّاں کی شفقتیں بھولنے والی نہیں۔
مختصر یہ کہ ہر فعل میں اُنہیں میری خوشنودی مدِّ نظر رہتی۔ میری ایک
چھوٹی ہمشیرہ بھی تھی۔ مگر میرے ساتھ کچھ خاص ہی محبّت تھی۔ میری
پرورش اُن کے ہاتھ سے ہوئی۔ مجھے وہ ہمیشہ مردانہ نام سے پکارا
کرتیں۔ میرے والد صاحب کو بھی میرے ساتھ اس قدر محبّت تھی۔ کہ
میں نے اب تک کسی کو اتنی جانثاری کرتے نہیں دیکھا۔ اگرچہ سب
کو اولاد سے محبّت ہوتی ہے۔ مگر میری پرورش میں اس قدر
نازبرداری کی گئی۔ کہ میں بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ لہذا اِن انتہائی
نوازشات نے میرے مزاج میں خودسری پیدا کر دی تھی۔ جس کا
اس حالت کے تحت ہونا لازمی تھا۔ حتّٰی کہ میں نے شعور حاصل
کرنے کے بعد بھی بمشکل رفتہ رفتہ ان قبیح عادات کو ترک کیا۔ لیکن
یہ اظہار آج بھی میرے لئے کوفت کا باعث ہے۔ اُس زمانے میں
تعلیم نسواں کی طرف بزرگوں کی توجہ بہت کم تھی۔ سوائے قرآن مجید
یا نماز کے اور کچھ نہ پڑھایا جاتا تھا۔ مجھے بھی حسب دستور بسم اللہ
کی رسم میں قدم رکھنا تھا۔ دن رات بسم اللہ کی رسم ادا ہونے کی
تیاریاں ہونے لگیں۔ نانی امّاں جان نے میرے لئے بہت خوبصورت
سنہری رنگ کا ریشمی جوڑا تیار کروایا۔ دہلی والے صاحبزادے سیّد

حسینی پیر جی مملوک علی شاہ صاحب کی بیگم صاحبہ کے آگے بسم اللہ
کی رسم ادا ہوئی۔ بیگم صاحبہ کو ایک پونڈ اور مٹھائی نظر کی گئی۔ گھر
میں سب اپنے ملاقاتی اور رشتہ دار اکٹھے ہوئے۔ مراسنیں شادیانہ
گانے بجانے لگیں۔ مجھے چاروں طرف سے یہی آواز سُننے میں آتی تھی
بچیّ ناز پر دہ کی بسم اللہ مبارک ہو۔ یہ پہلی خوشی وشادی مبارک ہو
میری نانی صاحبہ مجھ پر سے روپیہ قربان کر کے خیرات کرتیں اور مجھے
زیور کپڑے پہنے ہوئے دیکھ کر خوش ہوتیں۔ بار بار پیار کرتیں۔
غرضیکہ ایک نیک ساعت میں ہزاروں شگونوں کے ساتھ میری
بسم اللہ کی رسم ادا ہونے کا وقت مقرر ہُوا۔ کیونکہ اسلام میں پہلی
خوشی اور پہلی تقریب ہر مسلمان کی اولاد کے واسطے بسم اللہ ہے
چنانچہ میری نانی امّاں صاحبہ بزرگوار اپنی فارسی زبان میں قرآنمجید
کی خصوصیات کے متعلق مجھے سمجھایا کرتیں۔ اُس زمانے کی تربیت
کے مطابق اُن بزرگ عورتوں کو اس کلام پاک کی ایسی تعریفیں بہ صحیح
طور پر یاد تھیں جتنی شاید کسی مولوی یا مولانا صاحب اور دیوبند کے
تعلیم یافتہ علماء دین کو بھی علمی و مذہبی مسائل کی خبر نہ ہو گی۔ اُن بزرگ
ہستیوں نے جو کچھ قرآن کی شان میں اور نماز کے متعلق بیان کیا ایک
ایک نقطہ اُن کی زبان کا سنہری حروف سے لکھا جائے تو بھی کم ہے۔
نانی امّاں کہا کرتی تھیں کہ بیٹی قرآن کی زبان ایک زندہ زبان ہے قرآن
پاک کے علاوہ اور جتنی کتابیں پیغمبروں پر اُتریں۔ جو اِس وقت دنیا میں

موجود نہیں۔ اور مختلف زبانوں میں لکھی گئیں وہ مُردہ ہو چکی ہیں اور اُن کے پیغام بھی مُردہ ہو چکے ہیں۔ صرف ہمارے اسلام کی عربی زبان زندہ ہے۔ جس کو ہزار بار پڑھنے سے بھی مسلمان کی طبیعت اکتاتی نہیں۔ بلکہ خلوص دل سے پڑھا جاتا ہے۔ اس کلام پاک کے کسی نقطہ یا آیت کے معنی متعیّن کرنے میں کسی قسم کی دشواری پیش نہیں آتی۔ قرآن ہی ایک ایسی کتاب ہے جس کو خدا کے بندوں نے حفظ یاد کیا ہے قرآن مجید کے علاوہ اور کوئی بھی ایسی کتاب نہیں۔ جس کو اُس کے مذہب والوں نے حفظ کیا ہو۔ ہر اسلامی ملک و ملّت میں حافظِ قرآن مجید پائے جاتے ہیں۔ اور یہ ہی ایک قرآن بابرکت ہے۔ جو سب مذہبی کتابوں سے زیادہ پڑھا جاتا ہے۔ اور جو ابتدائی نسخہ موجود ہے۔ اُس میں آج تک تیرہ سو برس سے اختلافِ زیر زبر بھی نہیں پایا گیا۔ قرآن مجید کے مقابلے میں انجیل ہے جو صرف آٹھویں دن پڑھی جاتی ہے۔ مگر وہ بھی پادری صاحبان کا پڑھ لینا کافی سمجھا جاتا ہے۔ قرآن وہ کلام پاک ہے جو تمام دن میں پانچ وقت نمازمیں پڑھا جاتا ہے۔ لفظی معنے اگر پڑھے جاویں تو یہ پورا پورا قانون کا سبق ہے۔ قرآن پاک کا کوئی حکم خلافِ عقل نہیں۔ قرآن ایسا پاک کلام ہے جو کسی تشریح کا محتاج نہیں ۔ ہر کلمہ آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے۔ قرآن پاک میں توحید کے بارے میں کس قدر مختصر تسلی بخش دلائل پیش کئے گئے ہیں۔ قرآن کا کوئی کلام غیر موزوں نہیں

قرآن ہر لحاظ سے پیغام الہٰی ہے۔ صداقتوں کا جامع ہے۔ قرآن پاک ہماری زندگی کا محسن اور ضابطہ حیات ہے۔ اس لئے مسلمانوں کی سب سے پہلے بسم اللہ قرآن پاک پر اپنے بچوں کی توجہ دلانا اور پہلے علم دین اسلام ہی شروع کروانا ہمارا فرض اوّلین ہے۔ غرضیکہ ایسی ایسی باتیں کہا کرتیں جن میں محو ہو کر میں کلام پاک کے بارے میں اکثر سوچا کرتی۔ مگر دماغ اِس قابل نہ تھا۔ بالکل بچّہ تھی۔ چار پانچ برس کی عمر ہی کیا ہے مگر مجھے چار برس سے لیکر آجتک اُس وقت کی تمام باتیں سب حرف بحرف یاد ہیں۔ اور نانی اماں کی شفقت بے پایاں تو ایک سیکنڈ کے لئے بھی بھولنے والی نہیں۔ غرضکہ نہایت خوشی و مسرت کے ساتھ سب کو اس نیک و مبارک ساعت پر مدعو کیا گیا تھا۔

عزیزوں بزرگوں نے مجھے عجیب عجیب قسم کے تحفہ جات عنایت کئے۔ بڑی دھوم دھام سے میری بسم اللہ کی رسم ادا ہوئی۔ میری اُستانی صاحبہ مجھے تمام لڑکیوں سے زیادہ پیار کرتیں۔ بیگم ادیبہ خانم صاحبہ نہایت باسلیقہ اور خوش مزاج تھیں۔ اُن کی مہربانی میرے دل میں گھر کر گئی۔ میں نے بہت جلدی قرآن مجید ختم کر لیا اور نماز بھی۔ اُس کے بعد میری آمین کی رسم ایسی ہی خوشی سے ادا ہوئی۔ اور مجھے پردے میں قید کر دیا گیا۔ یہ ہماری خاندانی پابندی تھی۔ شہر میں ایک دو سکول تھے۔ جن کا نام سنتے ہی میری طبیعت میں ایک شوق سا پیدا ہُوا کرتا۔ مگر میری طاقت کہاں کہ سکول جانے کا نام لے سکتی۔ پردہ سخت

ہوگیا۔ اپنے محلے کی کسی گلی میں جانے کی اجازت نہ تھی۔ بلکہ دروازے سے باہر قدم نکالنا بھی مشکل تھا۔ میری عمر صرف ۸ سال کی تھی۔ میں مرغ نوگرفتار کی طرح بہتیرا پھڑپھڑایا کرتی۔ مگر اس قفس سے رہائی پانے کا مقدور ہی کہاں تھا۔ آخر میرے جذبات کو دیکھ کرامی جان نے ایک ہندو عورت جو کشیدہ کاری میں کافی مہارت رکھتی تھی۔ اس کو بلا کر مجھے سکھلانے کو کہدیا۔ اب میں خوش ہوگئی۔ کسی وقت کوئی فقہ کی کتاب اپنے والد صاحب سے پڑھایا کرتی۔ مجھے اس دوران میں معلوم ہوگیا۔ کہ خاندان کے بزرگ سوائے مذہبی کتب کے لڑکیوں کو فالتو تعلیم و بنیادی تعلیم کے علاوہ معیوب خیال کرتے ہیں۔ اسپر میں نے صبر کرلیا۔ مگر دل میں شوق تھا جب کسی کو کام کرتے دیکھتی دل تڑپ اُٹھتا کہ میں بھی کروں۔ مگر مجبور تھی۔ اول تو گھر میں کوئی آنے جانے والا نہ تھا۔ نہ خود کہیں جاتی۔ غرضیکہ پردے کی پابندی تھی۔ ہم دونوں بہنیں آپس میں کھیلا کرتیں۔ یا کوئی نوکر لڑکی یا ایک دو محلے کی لڑکیاں۔ میری چھوٹی بہن طاہرہ سلطان کچھ بیمار رہا کرتی تھی۔ اس لئے اس کو ایک مولوی صاحب کبھی کبھی پڑھانے آیا کرتے۔ مگر نانی صاحبہ کا حکم تھا۔ کہ تم اب جوان ہورہی ہو۔ ۹ برس کی تمہاری عمر ہے۔ مولوی صاحب سے پردہ کرنا چاہیئے۔ میرا پردہ ہُوا کرتا تھا۔ مجھے اپنی طاہرہ بہن سے بیحد اُنس تھا۔ طاہرہ نہایت خوبصورت اور خوش خُلق لڑکی تھی۔ نہایت ہنس مکھ واقع ہوئی تھی۔ اس قدر اُلفت شعار جو کوئی اس کی باتیں سنتا خوش ہوتا۔ افسوس کہ خداوندکریم کو اتنا سرمایہ بھی رکھنا منظور نہ تھا۔

ایک دن ہم دونو بہنیں کھیل رہی تھیں۔ کھیلتے کھیلتے طاہرہ سلطان کے گلاب جیسے رُخسار سُرخ ہو کر بخار کی شکایت ہو گئی۔ ڈاکٹر کو بلوایا۔ وہ دیکھ کر کہنے لگا۔ اس کو سخت قسم کی چیچک نکلنے والی ہے۔ آخر اسی مرض میں وہ عرصہ یک ماہ بیمار رہی۔ کسی کے علاج سے افاقہ نہ ہُوا۔ بیچاری دن بدن کمزور ہوتی گئی۔ وہ بے حس و حرکت پڑی رہتی۔ اس پر ایک مسلسل مدہوشی کا عالم طاری رہتا تھا۔ شدتِ کرب میں اس پیاری بچّی کے منہ سے دردناک آواز میں "ہائے" نکل جاتا۔ تو ہم سب اپنی اپنی جگہ بیتاب ہو کر رہ جاتے۔ کیونکہ اس کی مظلومانہ ہائے ہمارے سمندِ الم پر تازیانے کا کام کرتی تھی۔ اس کی صحت کے انتظار میں ہماری پریشانی روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ حتیٰ کہ ایک ماہ کے بعد طاہرہ نے بوقت تین بجے دوپہر خود بخود آنکھیں بند کر لیں۔ گھر میں اندھیرا ہو گیا۔ صفِ ماتم بچھ گئی۔ امی جان ماہیِ بے آب کی طرح تڑپ رہی تھیں۔ کیونکہ امی جان کو مجھ سے زیادہ طاہرہ بہن کے ساتھ محبّت تھی۔ مجھے تو نانی امّاں نے سنبھالا ہُوا تھا۔ میں جب وقت روتی۔ تو نانی اماں میری طرف دیکھ کر بیقرار ہو جاتیں۔ میری خاطر وہ اپنے دل کو حوصلہ دیتی۔ اور مجھے بہلانے کی کوشش کرتیں۔ طاہرہ کو کفن پہنے دیکھ کر مجھے غش آگیا تمام لوگ جمع ہو گئے۔ میری حالت اس حسرتناک وقت میں پریشان کن تھی سے

پھول تو دو دن بہارِ جانفزا دکھلا گئے
حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

اس المناک حادثہ کے بعد ایک طویل عرصہ تک صفِ ماتم بچھی رہی مگر وقت میں صبر کی بہت قوت ہے۔ آخر رفتہ رفتہ قدرت کی فیاضیوں نے اس بے پناہ غم کو بھُلا دیا۔ اور رنجیدہ دلوں میں حوصلہ پیدا ہوگیا بے اختیاری کی فریاد بظاہر کم ہوگئی۔ مگر دل کی عمیق سوزش میں فرق نہ آیا۔ اگر تفسیر ہوسکتی ہے تو صرف یہ کہ تمام گھر کی مہر و شفقت سمٹ کر میرے لئے مخصوص ہوگئی۔ کیونکہ طاہرہ کے سوا میرا کوئی بہن بھائی نہ تھا۔ لہذا والدین کی تمام شفقت صرف میری ذات سے وابستہ ہوکر رہ گئی۔ ہر گھڑی ہر لحظہ میری مدارات میں پہلے سے زیادہ احتیاط ہونے لگی۔ یہاں تک کہ میرے ایک اشارے پر گھر میں بدحواسی کا طوفان چھا جاتا۔ اور میری ہر جا و بے جا خواہش کی بھی تعمیل کے لئے کبھی تاخیر نہ ہوتی۔ یہاں تک کہ میرا نام ناز و پیار سے ہر ایک کی زبان پر چڑھ گیا۔ باوجود ان ناز برداریوں کے مجھ پر ایک قسم کی دہشت طاری رہا کرتی۔ طاہرہ بہن کی یاد اور موت پھر اپنی تنہائی۔ اس احساس نے میرے جذبات میں ایک شورش بپا کر رکھی تھی۔ ہمارے خاندان میں رسمِ زمانہ کے مطابق بہت سخت پردہ تھا۔ اِس بنا پر سوائے اپنے گھر کی چاردیواری کے کسی دوسری جگہ یا کوئی انسان اماں جان۔ نانی جان کے سوا دکھائی نہ دیتا تھا۔ شہر کی معزز خواتین سے محض ہمارا تعارف تھا۔ مگر غالباً گہرے تعلقات نہ تھے۔ کیونکہ خاندانی وقار نے ہمیں کبھی گھر سے باہر قدم رکھنے کی اجازت نہ دی تھی۔ لہذا اکثر اعلیٰ

خاندان کی عورتیں امی جان کی ملاقات کی مشتاق تھیں۔ مگر اس سدِّراہ کو کون سر کر سکتا تھا۔ علاوہ ازیں ہماری برادری بھی کچھ زیادہ وسیع نہ تھی۔ تاہم جو عزیز و اقارب موجود تھے۔ اُن میں بھی ایک تقسیم وراثت کے موقع پر کچھ ایسی شکر رنجیاں پیدا ہو چکی تھیں۔ جنہوں نے قطع تعلقات کی صورت پیدا کر رکھی تھی۔ نہ کوئی چچا زاد نہ پھوپھی زاد نہ کوئی آس پاس نہ پڑوسی نہ ہمسائے۔ غرضیکہ میرے دل بہلانے کا کوئی بھی حسب منشا سامان نہ تھا۔ اس پر دن بدن پردے کی پابندی بڑھتی جا رہی تھی۔ ایک دن ایک عورت جو ہمارے دادا صاحب کے قریبی رشتہ سے تھی۔ وہ آئی تو کہنے لگی۔ بچی خیر سے جوان ہو گئی ہے۔ اب زیادہ باپ کے پاس بھی نہ بیٹھنے دیا کرو۔ میں اس پر ہنس پڑی۔ تو میری طرف غضبناک ہو کر کہنے لگی۔ تم مذاق سمجھتی ہو۔ تمہاری پھوپھی فرخ تاج نے تو کبھی اپنے باپ کا سامنا بھی نہیں کیا تھا۔ زمانہ وزارت میں جب کسی وقت اندر بڑی بیگم صاحبہ کے پاس آتے تو پہلے چپڑاسی اطلاع دیا کرتا تھا۔ کہ وزیر صاحب اندر تشریف لا رہے ہیں۔ اس آواز پر سب بہو بیٹیاں پردے میں ہو جایا کرتیں۔ اور صرف بڑی بیگم صاحبہ ادب سے ایک طرف بیٹھ جایا کرتیں۔ نیچی نگاہوں میں کچھ گھر بار کے متعلق باتیں ہُوا کرتیں۔ اس زمانے کی شرم و حیا کچھ اور طریقہ پر تھی۔ ایک دن سفر کا اتفاق ہُوا۔ تو سب گھر کی بہو بیویاں رتھوں میں سوار ہونے لگیں۔ کیونکہ اس زمانہ میں پردے دار

سواری بیگمات کے لئے پالکی یا بیل گاڑی یعنی رتھ ہوتی تھی (جسپر امیر لوگوں کی سواری کے وقت اچھا قیمتی خوبصورت گہرے رنگ کا پردہ پڑا ہوا ہوتا تھا) چنانچہ وزیر صاحب بھی بیگمات کے سوار ہونے کے وقت قریب تشریف رکھتے تھے۔ اُنھوں نے فرخ تاج کو دیکھا تو فرمانے لگے یہ کون ہے؟ تو چھوٹے میاں صاحب نے کہا۔ ابا جان! یہ باجی ہیں فرخ تاج۔ تو وزیر صاحب حیران ہو گئے۔ کہ لڑکی اِس قدر جوان ہو گئی ہے۔ باپ نے ۸ برس کی بیٹی کو بھی نہ دیکھا تھا۔ میں اُس بڑی بی کی زبانی یہ کہانی سُنکر خاموش ہو گئی۔ مگر دل میں غصّہ آ رہا تھا۔ کہ یہ تو مجھ سے نہ ہو سکے گا کہ ابا جان سے پردہ کروں۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ امی جان نانی جان اور ابا جان کی شفقتِ بے پایاں نے مجھے خودسر و آزاد کر رکھا تھا۔ لہذا میرے لئے یہ مشکل تھا۔ کہ باپ سے بھی بے تکلف ہنسی مذاق کھیل کود میں پرہیز کروں۔ بلکہ پردہ کروں۔ میں نے اس بڑی بی سے کہا۔ کہ آخر یہ کس شریعت کے تحت باپ سے پردہ جائز ہو سکتا ہے۔ تو بڑی بی نے تلخ ہو کر فرمایا۔ بچّی اُنکا زمانہ اُن کے ساتھ۔ تمہارا تمہارے ساتھ دیکھتی ہوں۔ کہ جب وقت سے تمہارے والد باہر سے تشریف لائے ہیں تم اُن کے آگے پیچھے کیا چھچگن ملگن کرتی پھرتی ہو۔ سر پہ دوپٹہ بھی نہیں رکھتی۔ میں نے یہ فقرہ سنکر خوب آواز سے رونا شروع کر دیا۔ نانی اماں نے مجھے گود میں لے لیا۔ کہنے لگیں بچی عقل کی

بات کو بُرا نہیں منایا جاتا - اتنے میں ابّا جان آگئے - اُن کے پاس بھی
یہ شکایت ہوئی - اُنہوں نے پیار کرکے کہا - نہیں بیٹی مَیں تم سے پردہ
نہیں کرواتا - بے فکر رہو - غرض ایسے پردے ہمارے کنبہ میں رائج
تھے - اور اس پابندی اور پرورش کی وجہ سے میری طبیعت بالکل
سادہ تھی - نہ تو علم - نہ تربیت نہ آزادی نہ تجربہ جو ایک دوسرے
کو دیکھ کر انسان سیکھ جاتا ہے - غرضیکہ میں بالکل ایک سادہ ورق تھی -
جو کچھ تھوڑا بہت نانی اماں نے سلائی یا کوئی کھانا پکانا سکھایا وہ
بھی ایسا تھا - گویا میں نے ایک پہاڑ طے کیا - زمانہ اس طرح اپنے
منازل طے کر رہا تھا - حتّٰی کہ رفتہ رفتہ میں نے اپنی عمر کے چودہ باب ختم
کئے تو قانون فطرت کے مطابق بڑے بڑے گھرانوں سے میری نسبت اور
پیغامات کا سلسلہ شروع ہوگیا - مگر ابا جان نے ہر جگہ یوں ہی عذر کر دیئے
کہ ابھی بچی نادان ہے - ایام طفل ہی میں میری پھوپھی صاحبہ مرحومہ و
مغفورہ کے ہاں میری بابت گفت و شنید ہوتی تھی -

میری پھوپھی صاحبہ فرخ تاج نے کسی بچے کی خوشی نہ دیکھی
بلکہ آپا فرخندہ اختر بھی اُن کی وفات کے بعد شادی شدہ ہوئیں
ایکدن والد صاحب کو بلا کر فرخندہ آپا نے کہا - کہ ماموں جان میرا
دل چاہتا ہے - کہ اپنے بھائی کی شادی دیکھوں - والد صاحب نے
دل میں سوچا - کہ اب موقعہ ہے - بات کو ایک طرف کر دینا چاہیئے - انکو
علم تھا - کہ پھوپھی صاحبہ کے لڑکے کا دماغ کچھ خراب ہوگیا ہے -

انٹرنس پاس کرنے کے بعد دماغ میں نقص آگیا تھا۔ اور اکثر نوکر لوگوں کی
زبانی بہت سی باتیں انکے دماغی فتور کی سُنی جاتی تھیں۔ اِن حالات کو مدِّنظر
رکھتے ہوئے والد صاحب قبلہ نے اپنی بھانجی کو کسی طریقے سے ٹال دیا۔
تاکہ معلوم ہوجائے وہ اپنی لڑکی کی شادی اپنے بھانجے کے ساتھ نہیں کرنا
چاہتے جب والد صاحب واپس تشریف لے آئے۔ تو آپا فرخندہ اختر
کے دل کو صدمہ پہنچا۔ انہیں اپنی والدہ مرحومہ کی یاد تازہ ہوگئی۔ وہ اسقدر
مایوسی سے روئیں۔ کہ بیہوشی طاری ہوگئی۔ پھوپھی صاحبہ سے جو پہلی بیوی
میرے پھوپھا صاحب کی تھی۔ اُن کا ایک بچّہ جوان تھا۔ جس کی شادی
پھوپھی صاحبہ نے خود کی تھی۔ اپنی زندگی میں یعنی اُس لڑکے کے سسرال میں
سے چند ایک عورتیں مرد آئے ہوئے تھے۔ پھوپھا صاحب کا اسم گرامی نواب
والا گوہر تھا۔ گورنمنٹ کی طرف سے اُن کو ستارہ ہند کا خطاب مل چکا تھا
بڑے بہادر اور عقلمند شخص تھے۔ جب پھوپھا صاحب اور آپا فرخندہ کو
میرے رشتہ کی بابت مایوسی ہوگئی۔ تو اُنہوں نے اور ان
لوگوں نے جو میرے والد صاحب اور آپا جان کی گفتگو سُن چکے تھے۔ بھائی
صاحب کے سسرال میں جاکر سب کچھ کہدیا۔ پھوپھا زاد بھائی صاحب
کے سسرال والے لوگ بھی ریاست کشمیر کے علاقہ کے باشندے تھے
انہوں نے میرے والد صاحب کے پاس کسی ذریعہ سے بہت کوشش
کرکے میرے رشتے کا سوال کیا۔ والد صاحب نے حسب معمول وہاں
بھی یہی جواب دیا۔ مگر اُن لوگوں نے پے درپے کوشش جاری رکھی۔ اِدھر

میرے چچا زاد بھائی بھی موجود تھے ۔ والدہ صاحبہ اور نانی اماں نے انکار ہی کردئیے ۔ ادھر والد صاحب بھی سوچتے رہا کرتے تھے ۔ کیونکہ اپنے رشتہ داروں کا بھی والد صاحب کو خیال تھا مگر میرا نوشتہ تقدیر ان سب سے گریزاں تھا ۔ رفتہ رفتہ امی جان اور نانی جان بھی رضا مند ہوگئیں ۔ اور عرصہ یک برس تک یہ سلسلہ جاری رہا سسرال والوں کی آمدورفت پر والدین کی طرف سے جب پختہ ارادہ ہوگیا ۔ تو اب چاروں طرف شور مچا ادھر سے میرے چچا صاحب شور و شر کرنے لگے ۔ ادھر سے نواب والا گوھر صاحب نے دھمکی دینی شروع کی کہ یہ رشتہ فرخ تاج مرحومہ کی زندگی سے ہو چکا تھا ۔ اب کون اس رشتے کو میری زندگی میں توڑ سکتا ہے ۔ والدہ صاحب کا ایک تایا زاد بھائی شہزادہ ہمدم شاہ شجاع کی اولاد میں سے تھا ۔ اُن کا اپنے لڑکے کے متعلق پیغام آگیا غرض کہ ایک محشر برپا ہوگیا ۔ کچھ میری چچی صاحبان کی کاوشیں تھیں ۔ اس وجہ سے اور بھی ہنگامہ در ہنگامہ طوفان برپا ہونے لگے ۔ انجام کار نتیجہ خاک نہ نکلا ۔ ابّا جان کم گو نہایت شریف الطبع انسان تھے ۔ حوصلہ سے سب کی سنتے اور برداشت کیا کرتے ۔ باوجود سب کی رنجش کے والد صاحب قبلہ نے اپنے قول سے منکر ہونے کو مرگ ناگہاں سے تعبیر کیا اور سب کی رنجش کو برطرف کرکے رسومات کا اعلان کردیا ۔ رشتہ دار پہلے تو کچھ عرصہ بگڑے رہے ۔ پھر خود ہی خاموش ہوگئے ؞

(۲)
دوسرا باب
شادی کا سلسلہ

آخر ایک معین تاریخ کو سمدھانے والے مدعو کئے گئے۔ طرفین کی امارت کے اظہار کا اچھا خاصہ موقع تھا۔ خوب حوصلے نکالے گئے۔ تمام کے تمام جواہرات سے مرصع زیور ۱۱ عدد اور ۱۱ عدد پوشاک زریں منقش سنہری روپہلی کام کیا ہوا جن پر نگاہیں تک نہ ٹھہرتی تھیں۔ جتنے کہ موتی رومال۔ پاپوش اور اس قسم کا تمام رنگین سامان خشک و تازہ میوہ اور مٹھائیوں کے انبار عطریات روغن کئی قسم کے ایک حد تک بے اندازہ تھے۔ گھر میں رشتہ دار مہمان اور تماشائی جمع ہو گئے۔ منگنی کا شگون ہونے لگا۔ میاں بخت نصر میاں نظام الدین وزیر اعظم ریاست پونچھ کے بڑے بیٹے تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی قمر الزماں کے ساتھ منگنی کی رسم ادا کی گئی۔ میاں بخت نصر نے مجھ پر بہت اشرفیاں قربان کیں۔ اور

میرے والدین کا نہایت ادب سے شکریہ ادا کیا کہ باوجود اتنے شور و فساد کے آپ نے میری عزت افزائی کی۔ میں ہمیشہ کیلئے آپ کا غلام رہونگا میرے والد صاحب نے میاں بخت نصر کے کندھے پر شفقت سے ہاتھ رکھا۔ اور کہا بھائی ہم تمہارے لائق نہیں۔ ہماری امیری تو اب ختم ہو رہی ہے۔ چند ایسے الفاظ محبّت بھرے کہہ کر باہر لے گئے۔ اب مجھے پوشاک پہنائی گئی۔ اور مرصع جواہرات کا زیور۔ میں بہت عجیب طرح سے اپنے کو ضبط کرکے ایک جگہ بندھی بیٹھی تھی۔ اور اپنے گھر میں ایک غیر معمولی ہجوم دیکھ کر حیران ہو رہی تھی۔ اور دل میں سوچتی تھی۔ کہ یہ کون لوگ ہیں۔ کہاں سے آئے ہیں۔ میں اب کیا ان کے ہاں جا کر رہوں گی؟ میری نانی اماں جان یہاں ہونگی ایسے بیگانہ خیال ہو کر کبھی رو یا کرتی۔ اور کبھی ہنس دیتی۔ دوسرے روز شگن منگنی ختم ہو کر والدین کی طرف سے میاں قمر الزماں کو چند اشرفیاں ایک رومال ایک ہیرے کی انگوٹھی طشتری میں مٹھائی اور پھل وغیرہ۔ میاں بخت نصر کو کشمیری قیمتی دوشالہ اور تمام پوشاک۔ اور ساتھ والوں کو بھی حسب پسند پوشاکیں دی گئیں۔ والدہ صاحبہ نے تقریباً سب کو حسب مراتب دوشالے دئے۔ اور یہ لوگ خوش و خرم رخصت ہو گئے۔ اب میری طبیعت میں دن بدن کچھ عجیب قسم کے خیالات آیا کرتے تھے۔

میرے سسرال والوں کی فیاضیاں دیکھ کر لوگوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ ہر شخص نے میرے بخت رسا کی داد دی۔ اور ہزاروں دعاؤں سے میرے والدین کے مہربان لوگوں نے مجھے تحفے تحائف دے

اس کے باوجود میرے دل میں عجیب عجیب خیالات پیدا ہوتے تھے۔ میں سوچا کرتی تھی۔ کہ دُوسرا شہر جہاں وہ لوگ رہتے ہیں۔ کیسا ہو گا۔ پھر تخیل ایک صورت پیش کر دیتا۔ میں اس کو پسند نہ کرتی۔ پھر ایک اور شکل میری آنکھوں کے سامنے آجاتی۔ میں اس کو بھی قبول نہ کرتی۔ غرضیکہ مختلف خیال دماغ میں آتے اور فنا ہوتے رہتے۔ قدرت نے دماغ تو کچھ اچھا ہی دیا تھا۔ مگر خاندانی رسومات اور تنہائی کی پابندیوں نے خیالات کو اُبھرنے نہ دیا۔ میں نے یہ کبھی نہ سوچا۔ کہ وہ نئے لوگ جن کا نیا دیس۔ نئے رسومات۔ نئے طور طریقے۔ اُن کی زبان بھی قدرے مختلف اور لباس بھی جداگانہ ہے۔ اس کے متعلق مجھے کیا کرنا چاہیئے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ میں اس وقت اِس کی ضرورت بھی محسوس نہ کرتی تھی۔ اور نہ اس پیچیدہ پہلو پر غور کرنے کی اہلیت رکھتی تھی۔ نامزدگی کے چند ماہ گزرنے پر سمدھانے والوں نے شادی کا تقاضہ شروع کر دیا۔ مگر ابا جان کو میری جدائی اس قدر شاق گزرتی تھی۔ کہ اس خیال سے آنکھوں میں آنسو بھر لیا کرتے۔ پھر کچھ عذر پیش کرتے۔ مگر کب تک؟ آخر اُن کی خواہش کو پورا کرنا پڑا۔ امی جان و ابا جان نے سسرال والوں کو اذن دے دیا۔ ماہ رجب کی ۱۴ تاریخ برات کیلئے مقرر ہوئی۔ اس عرصہ میں اگرچہ تین ماہ تھے۔ مگر میرے والد صاحب نے تیاری شروع کر دی۔ مجھ پر اس کا کچھ اثر نہ تھا۔ نہ مسرت اور نہ رنج۔ بلکہ گھر میں اس نئے تردّد، نئے سامان کو دیکھ کر ایک قسم کی نفرت سی ہوا کرتی۔ والدہ صاحبہ میری اس عادت کو دیکھ کر کہتیں

کہ ابھی تک بھی میں کوئی سوچ سمجھ نہیں آئی۔ کچھ کپڑے سینے پرونے کیلئے مجھے دے دیا کرتیں۔ اور خود بھی سینے سلانے کے فکر میں لگی رہا کرتیں۔ اس وقت گوٹے کناری کا زیادہ رواج تھا۔ زیادہ تر گوٹے اور سلمہ کا کام ہی کرایا گیا۔ بہت سی عورتیں اس کام میں دن رات لگی رہا کرتیں۔ ہر کام کے شروع میں سوہاگنیں گیت گایا کرتیں۔ شادیانے بجتے۔ بات بات پر امی جان اور نانی جان کو مبارکبادیاں دی جاتیں۔ غرض کہ گھر میں ہر وقت ہجوم کام کاج رہتا۔ سب خواتین اور کام کرنے والیاں سُرخ پوشاک میں ملبوس رہا کرتیں۔ ہزاروں شگون سے ہر ایک کام انجام دیا جاتا۔ ساتھ ساتھ سہاگ گاتی جاتیں۔ مجھے ان کے گانے پر ہنسی آتی۔ کہ امی جان یہ کیا کرتی ہیں۔ انکو گانے کیلئے کہہ دیتی ہیں۔ کسی وقت میراسنیں بھی آکر لہک لہک کر شادیانے گاتی بجاتیں۔ آخر حسب توفیق جہیز کا سامان تیار ہو گیا۔ ایک پلنگ چاندی کے پایوں کا جن پر چاندی کی خولیں چڑھی ہوئی تھیں۔ ایک نہایت خوبصورت چوکی بھی تھی۔ لڑکیوں کا جہیز ہر ایک کے واسطے بیشمار ہوتا ہے۔ اور پھر میں والدین کی اکلوتی بیٹی تھی۔ مگر ساتھ ہی نانی جان کے دل پر میری جدائی کی ایسی چوٹ لگتی۔ کہ وہ اکثر مجھ سے چھپ چھپ کر رو دیا کرتیں۔ اور جب میں ان کو دیکھتی تو میں بھی رونے لگ جاتی۔ اب شادی کے دن قریب آتے جاتے تھے۔ والدہ صاحبہ نے برات کے لئے مکان تجویز کرکے سامان سے آراستہ کروانے شروع کر دئے۔ خاص مہمانوں کے لئے علیحدہ علیحدہ آرام گاہیں مقرر کیں۔ ملازموں کے لئے اور مددگاروں کے لئے شامیانے

اور قناتیں نصب کی گئیں۔ کھانا پکانے والے اور تقسیم کرنے والوں کے علاوہ بہت سے ماہر فن لوگ اور اعلیٰ درجے کے باورچی وغیرہ بلوائے گئے۔ سامان خور و نوش کے کئی ذخیرے جمع کئے گئے۔ مزید برآں اس وقت فٹن لینڈ وغیرہ کا رواج تھا۔ لہذا سواریوں کے متعلق بھی تسلی بخش سامان ہو گیا۔

غرضیکہ بالکل شاہانہ ساز و سامان کے ساتھ سمدھانے کے خیر مقدم کا انتظام کیا گیا۔ یہاں تک کہ شہر کے لوگ بھی اس دن کا انتظار بے چینی سے کرنے لگے۔ آخر شادی سے کئی دن پیشتر مانجھوں کی رسم ادا کی گئی۔ خواتین کی ایک محفل منعقد ہوئی۔ اُنہوں نے مل کر بہت سی رسمیں ادا کیں۔ سات سہاگنوں نے مل کر مجھے ایک خوبصورت چوکی پر بٹھایا۔ اور ٹبنا وغیرہ کی رسم ادا کی۔ زعفرانی رنگ کا ریشمی جوڑہ پہنایا گیا۔ ہمارا گھر مبارک سلامت کے شور سے گونج اُٹھا۔ امی جان پھولے نہ سماتی تھیں۔ اس دن سے ہر روز خواتین جمع ہوتی رہتیں۔ صبح شام مراسنیں شادیانے گانے اور بجانے آتیں سب کے کھانے کا انتظام امی جان کرتیں۔ اور دونوں وقت خود تقسیم کرتیں۔ یہ ہفتہ مسرت اور خوشی میں گزرا۔ پھر مہندی کی رسم ادا ہونے پر میرے سسرال والوں نے مہندی بھیجی۔ جس کے ساتھ کئی قسم کے خشک پھل اور مٹھا سبز کا غذ بچھا کر کئی چنگیروں میں رکھی ہوئی تھی نہایت خوبصورت طریقہ پر تمام شہر میں چکر لگاتے ہوئے میرے والدین کے گھر میں آئے۔ لوگ ان کی طرف سے اس خوبصورتی کے ساتھ مہندی کی رسم کو اس شاہانہ طور پر ادا ہوتے دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ اُس دن مجھے دھانی رنگ کی پوشاک جو مہندی کے ساتھ

میاں قمرالزماں صاحب۔ اور برات کے چند معززین

فہرست اسمائے گرامی متعلقہ تصویر!

دائیں سے بائیں (کھڑے) (۱) میاں محمد شفیع (میاں قمرالزماں صاحب کے خالو زاد بھائی) ریاست پونچھ۔
(۲) شیخ رحیم بخش صاحب خلف الرشید شیخ خیرالدین (بانی مسجد خیرالدین) رئیس اعظم۔ امرتسر
(۳) میاں فرخ سیر صاحب (میاں قمرالزماں کے چھوٹے بھائی) (۴) میاں تخت نصر صاحب (میاں قمرالزماں کے بڑے بھائی)
(۵) مولانا قاضی سراج الدین صاحب بیرسٹرایٹ لا رئیس، راولپنڈی

دائیں سے بائیں (بیٹھے) (۱) نواب زادہ میاں ریاض الدین صاحب سپرنٹنڈنٹ پولیس و رئیس اعظم لاہور۔
(۲) نواب ملک مبارز خاں صاحب ٹوانہ رئیس اعظم ضلع شاہپور۔ (۳) خان بہادر نواب مظفر خاں صاحب سی۔ آئی۔ ای۔
وزیر مال گورنمنٹ پنجاب لاہور (۴) دولہا میاں جناب قمرالزماں صاحب۔
(۵) نواب اسلم حیات خاں صاحب سشن جج و رئیس اعظم۔ لاہور۔
(۶) ملک ممتاز خاں صاحب ٹوانہ رئیس اعظم۔ ضلع شاہ پور
(۷) ماسٹر چوہدری علی گوہر صاحب بی۔ اے۔ (نوٹ صرف دولہا میاں اور انکے دونو بھائیوں کے نام اصلی نہیں ہیں)

آئی تھی۔ پہنا کر ہاتھوں میں مہندی لگا دی گئی ۔ اب دوسرے دن برات کی آمد کا غلغلہ تھا۔ تیسرے پہر کو ہمارے شہر کے بہت سے معززین۔ اور رؤسا میرے والد صاحب کے ہمراہ سمدھانے کا خیر مقدم کرنے ریلوے سٹیشن پر گئے۔ ہر قسم کی سواری فٹن و ٹمٹم کئی ایک گھوڑے آراستہ کئے ہوئے موجود تھے۔ تمام سٹیشن خوبصورت جھنڈیوں۔ پھول۔ پتوں کے دروازوں اور فانوسوں سے آراستہ و پیراستہ کیا گیا تھا۔

برات کا شاندار استقبال ہوا۔ دولہا میاں کی سواری کے لئے ہاتھی موجود تھا۔ لہذا ہزاروں شگون کیسا تھ دولہا میاں ہاتھی پر سوار ہو کر اپنی قیام گاہ میں تشریف لائے۔ اس اثنا میں تمام براتیوں کو بھی نہایت عزت و احترام سے اُن کے جائے قرار پر پہنچا دیا گیا۔ بینڈ کے سُریلے نغمے فضائے عالم میں ایک کیف اور ترنم پیدا کر رہے تھے۔ شہر کے لوگ کسی نا معلوم کشش سے محلسرائے کی طرف کھنچے آ رہے تھے۔ شام تک یہی حالت رہی۔ اسی دوران میں مہمانوں کے حسب مراتب خورونوش کا اعلیٰ ترین انتظام اور اُن کے مرتبہ کے لائق اچھی طرح مہمان نوازی کی گئی۔ کھانے سے فراغت حاصل کرتے ہی ایجاب قبول کرنے کی محفل منعقد ہوئی۔ سب مہمان خواتین نے زرق برق لباس تبدیل کئے۔ سب نے مل کر مجھے ایک روپہلی چوکی پر بٹھایا۔ اور غسل و وضو کا عمل کرایا۔ پھر دوسرے کمرے میں لے جا کر اعلےٰ قسم کے چینی ریشم کا سُرخ جوڑا پہنا دیا۔ جو زردوزی کے کام سے سراسر تار زربفت تھا۔ مختلف قسم کے عطریات لگائے گئے۔ زر و جواہرات کے زیور جن سے آنکھوں میں چکا چوند پیدا ہوتی تھی۔ خاصی تعداد میں پہنائے

گئے۔ جب خواتین اپنی رسومات سے فارغ ہوگئیں۔ تو چند معزز بزرگ اور عزیز تشریف لائے۔ خطبہ نکاح پڑھا گیا۔ اور تیس ہزار مہر کے عوض مجھ سے ایجاب قبول کروایا گیا۔ اس وقت میرا دل ایک وحشی آہو کی طرح بے قابو ہوا جاتا تھا۔ چند خواتین بھی ایک دوسری سے کہنے لگیں۔ بس اب یہ سسرال کی ہوگئی۔ مگر میں یہ کلمہ سنکر زار وقطار رونے لگی۔ امی جان نہایت حوصلے والی مدبر مزاج خاتون تھیں۔ وہ تو کچھ برداشت کر گئیں۔ لیکن نانی اماں کی حالت قابل رحم تھی۔ موجودہ خواتین بھی ان کی گریہ وزاری پر چشم پُر نم ہوگئیں۔ اس اثنا میں نکاح کا کاغذ تحریر ہو رہا تھا۔ کاغذ مکمل ہوتے ہی مبارک سلامت کا ایک شور مچ گیا۔ یہ فلک شگاف غلغلہ بلند آوازیں سنائی دیتا رہا۔ شیرینی اور چوہاروں کی اس قدر بارش ہوئی۔ کہ زمین پر چھوہاروں کا فرش بن گیا۔ اس کے بعد دولھا میاں کو اندر زنان خانے میں لانے کی خبر ملی۔ مراسنیں شادیانے گا رہی تھیں۔ دولھا میاں آہستہ آہستہ قدم رکھتے ہوئے آئے۔ ایک طرف بڑے بھائی میاں بخت نصر صاحب دوسری طرف چھوٹا بھائی فرخ سیر صاحب درمیان میں دولھا قمر الزماں تھے۔ خواتین میں ایک کھلبلی سی مچ گئی۔ دولھا میاں اپنے ریاستی لباس میں آئین کے مطابق عروسی جوڑا پہنے ہوئے ایک عمدہ تراش کا سر سے پاؤں تک سرخ لباس جس پر صنعت زردوزی کی نفاست کا خاتمہ تھا۔ علاوہ ازیں ریاستی رسم کے مطابق موتیوں اور جواہرات کے جڑاؤ نشانات یعنی میڈل وغیرہ لگے ہوئے تھے۔ کمر میں جگمگاتے ہوئے ہیروں کی طلائی پیٹی تھی۔ جس کے ساتھ

سُرخ مخمل کے سلمہ ستارہ کئے ہوئے میان میں ایک بیش قیمت تلوار لٹک رہی تھی۔ اور اس کا بیش قبض انسانی کمالات کے انتہا کی داد دے رہا تھا۔ سر پر سونے کا سہرا جس کے نایاب موتیوں کی لڑیاں آنکھوں کی بینائی کو خیرہ کئے دیتی تھیں۔ خفیف سی لرزش میں گنگا جمنی سمندر موجیں مارنے لگتا۔ خواتین نے دولہا کا پُر جوش خیر مقدم کیا۔ اور صدقے اتارے۔ پھولوں اور سنہری روپہلی سکّوں کی بارش کر دی۔ پھر نہایت احترام کے ساتھ ایک خاص صندلی جس پر زربفت اور چینی ریشم کے خوبصورت اور نہایت نرم گدے تھے۔ لا کر بٹھا دیا۔ دولہا میاں کے بھائی نہایت وجیہہ اور خوبصورت جوان تھے۔ وہ بھی ریاستی لباس میں ملبوس تھے۔ کالر و آستین پر زردوزی کا کام اور لباس کا رنگ گہرا آسمانی تھا۔ مراسنیں گاتی جا رہی تھیں۔ خواتین کی پس پردہ رازدارانہ گفتگو کی سرسراہٹ اور مخمور قہقہوں کی لطافت لے سکنے کا عالم پیدا کر رکھا تھا۔ میاں بخت نصر صاحب دولہا کے بھائی نے نہایت مسرت میں چند الفاظ دولہا کے پاس کھڑے ہو کر کہے۔ جس کا مطلب یہ تھا۔ کہ بھائی! تم بہت خوش نصیب ہو۔ شاہی خاندان کی بیٹی تمہاری بیوی ہے۔ شہزادی گوہر سلطان بیگم صاحبہ قابلِ احترام ہیں۔ تم تو ان کے بچے ہو۔ مگر میں ان دونوں صاحبان کا غلام ہوں۔ تا زیست میرا سر ان کے قدموں پر نثار ہوتا رہے گا۔ اتنے میں امی جان نے میاں بخت نصر کو نہایت شفقت سے ہاتھ پکڑ کر ایک آرام کرسی پر بٹھایا۔ اور کہا بیٹا یہ سب تمہاری مہربانی ہے۔ میں بھی اپنے کو خوش نصیب سمجھتی ہوں کہ میری اکلوتی بچی جو بالکل

نادان اور ابھی بہت کم سن ہے۔ کسی خاص تعریف کے قابل نہیں۔ پھر بھی آپ نے اس کو قبول کیا۔ اور اس بچی کے ذریعہ مجھے آپ جیسے نیک بچے اللہ پاک نے عنایت کئے۔ اللہ میاں کا ہزار ہزار شکر ہے۔ یہ کہہ کر میاں بخت نصر کے سر پر سے اشرفی قربان کر کے مراسنوں کی طرف پھینکدی۔

میاں قمر الزمان نے اپنی خوشدامن صاحبہ کو نذرانہ پیش کیا۔ اس کو امی جان نے قبول کر کے ان کا بھی صدقہ کر دیا۔ پھر دولھا کو شگون کے طور پر شیرینی کھلائی اور چند مہریں رونمائی کی رسومات میں دیں۔ پھر وہ مہریں جن پر نستعلیق خط میں کلمہ طیبہ لکھا ہوا تھا۔ دی گئیں۔ امی جان کے بعد سب خواتین نے درجہ بدرجہ رونمائی کی رسم میں حسب مراتب روپے دئے۔ اب دولہا میاں باہر تشریف لے گئے۔ باہر تمام وقت برات میں شغل ناچ رنگ ہوتا رہا۔ ہر قسم کا سامان طرب مہیّا تھا۔ رنڈیوں کے ناچ۔ آتشبازی پر ہزاروں روپے اُٹھ گئے۔ شہر کے تمام لوگ تماشائی بنے ہوئے تھے۔ جگہ کی قلت کے باعث لوگ درختوں پر چڑھ کر نظارہ کرنے لگے۔ شہر کا بچہ بچہ اس پر لطف منظر کا شوق سے ذکر کر رہا تھا۔ اور ہر بزم میں یہی گفتگو جاری تھی۔

نکاح کے دن سے رخصت تک میری شامت آگئی۔ سنگین زیورات اور لباس کے بوجھ سے میرے جسم کا بند بند درد کرنے لگا۔ اور میں سخت پریشان ہوگئی۔ ہر چند میں نے ان تمام مشکلات سے نجات چاہی۔ مگر کون سنتا تھا نقارخانہ میں طوطی کی آواز۔ غرض کہ میں بہت سی خواتین کے ہاتھوں کٹ پتلی کیطرح انکے اشاروں پر حرکت کر رہی تھی محلے کی نوعمر لڑکیوں کا ایک جمگھٹا ہر

وقت موجود رہتا تھا۔ ہر وقت کی شرم اور کوفت کے باعث میرا کھانا پینا تک چھٹ
گیا۔ والد صاحب اپنے کام میں مصروف۔ نانی صاحبہ کو بھی فرصت نہ تھی۔
مجھے کچھ بیہوشی اور تھکان سی محسوس ہونے لگی۔ آخر چلنے کا وقت آ گیا۔ مراسنوں
نے وداعی گیت گانے شروع کر دئیے۔ امی جان نے مجھے نصیحت کے طور
پر بہت کچھ سمجھایا۔ والد صاحب مجھے گلے لگا کر رونے لگے۔ میری روتے
روتے ہچکی بندھ گئی۔ نانی صاحبہ کی پریشانی اور اُن کا بار بار میرے سر پر دستِ
شفقت رکھنا۔ میری بلائیں لینا مجھے بے صبر کئے دیتا تھا۔ مگر وہ ساتھ ہی
مجھ کو سمجھاتی جا رہی تھیں۔ اور اُن کی نصیحت آمیز گفتگو کو میں یوں محسوس
کر رہی تھی۔ جیسے کوئی بالکل بیہوشی میں سنتا ہے۔ جہیز کی چیزیں بند
ہونے لگیں۔ وداع کی تیاری ہوتے ہی تمام گھر میں ایک کہرام سا مچ گیا۔ پالکی
دروازے پر لا کر رکھی گئی۔ سب خواتین روتی دھوتیں مجھے ڈیوڑھی کے دروازے
تک لائیں۔ والد صاحب مجھے اپنے سینہ سے لگا کر سخت بیقراری سے رو
رہے تھے۔ اتنے میں میاں بخت نصر صاحب نے ہاتھ پکڑ کر کہا۔ میاں صاحب!
یہ آپ کی بیٹی اور میری حقیقی بہن ہے۔ میں اس کو خود پالکی میں سوار کراؤنگا
اتنا کہتے ہوئے مجھے سہارا دیا۔ اور پالکی میں بسم اللہ کہہ کر بٹھا دیا۔ میں
نے ہاتھ اونچے کئے۔ تا کہ ایک بار اور مل لوں۔ مگر پالکی کا دروازہ بند کر دیا
گیا۔ جھالر چھوڑ کر پالکی کہاروں نے اُٹھائی۔ اس وقت میری حالت ایسی
ناگفتہ تھی۔ جو شاید کسی کی کم ہو گی۔ سٹیشن تک مجرے۔ باجے راگ رنگ
سے پہنچے۔ کچھ تو معززین میرے والد صاحب کے ملاقاتی اور کچھ تماشائی

ہزاروں کی تعداد میں مجھے رخصت کرنے ساتھ آئے۔ سٹیشن پر سپیشل ٹرین کھڑی تھی۔ مجھے فسٹ کلاس میں بٹھا دیا گیا۔ میری آنکھیں رونے کی وجہ سُوج گئی تھیں۔ سب لوگ سوار ہو گئے۔ تو میرے والد صاحب نے مجھے آ کر پیار دیا۔ بہت سے لوگ قطار باندھے ٹرین کے سامنے کھڑے تھے۔ اُن کا سلام کے اشارہ سے ٹرین میں بیٹھے ہوئے براتیوں کو رخصت کرنا اور میرے والد صاحب کا واپس جانا میرے لئے قیامت ہو رہا تھا۔ میں روتے روتے بیہوش ہو گئی۔ میرے ساتھ جو انّا تھی۔ اس نے ہر چند بیہوشی دور کرنے کی کوشش کی۔ مگر بیفائدہ۔ بہت دیر کے بعد مجھے ہوش میں لایا گیا۔ جب امرت سر کا سٹیشن آیا۔ تو ٹرین رُک گئی۔ مجھے کبھی دوسرے شہر میں جانے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ یک دم ٹرین کے رُک جانے پر میں بدحواس ہو کر اُٹھ بیٹھی۔ میرے سر سے دوپٹہ بھی سرک کر کندھوں پر پڑا ہوا تھا۔ ٹرین کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ میرے ساتھ والوں کو میری چیزیں سنبھالنے کی فکر پڑ گئی اور اُنہوں نے میری طرف خیال نہ کیا۔ میں نے پلیٹ فارم کی طرف کھڑکی میں سے جھانکنا شروع کیا۔ مگر آنکھیں رو رو کر بہت کچھ ورمائی ہوئی تھیں۔ سامنے ایک سہرے والا سُرخ لباس میں سرتاپا ملبوس اور اس کے ساتھ ایک اور نوجوان زرق برق اچکن پہنے دکھائی دیئے۔ چنانچہ میں نے اپنی برات میں دولھا کو نہ دیکھا تھا۔ اس لئے پہچان نہ سکی۔ کیونکہ ہمارے شہر کے رواج کے مطابق دولھا کا سرتاپا سُرخ لباس نہ ہوتا تھا۔ میرے دل میں خیال آیا۔ کہ امرت سر شہر سننے میں آتا تھا بڑا بھاری شہر ہے۔ شاید سٹیشن پر کوئی ہندووانی برات ہو گی اور

یہ دولہا ہندو ہے۔ اتنے میں اسی سہرے والے سُرخ پوش نے میری شیشے والی کھڑکی کے پچھلی طرف کی پردے والی کھڑکی چڑھا دی۔ میری ملازمہ و دیگر خدمت گار جو میرے پاس تھے۔ انہوں نے شور مچا دیا۔ کہ دولہا میاں تھے۔ کھڑکی چڑھا گئے۔ میں اس خبر سے سہم گئی اور چند منٹ خاموش رہ کر انّا و دیگر خدمتگاروں کو خوب جھاڑنا شروع کیا۔ کہ امّی جان نے اس لئے میرے ساتھ تمہیں بھیجا تھا۔ کہ تم میری پروا نہ کرو۔ میری آنکھیں سُوجی ہوئی ہیں۔ اور میں نے کبھی سٹیشن بھی نہ دیکھے تھے۔ تم نے عجیب بے وقوفی کی مجھے کھلے مُنہ بیٹھے رہنے دیا۔ وہ تمام میری منّت وسماجت کرتے ہوئے سامان سنبھالنے کے عذر پیش کرنے لگیں۔ مگر میرے دل میں نہایت ہی فکر پیدا ہوگیا۔ کہ الٰہی یہ مجھے کیا خیال کریں گے۔ کہ ایسی بے پردہ ہے۔ جو کھلے مُنہ سر برہنہ مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں اسی پریشانی میں تھی۔ کہ لاہور کا سٹیشن آگیا۔ اب پالکی ریل کے دروازے کے ساتھ لگا ئی گئی۔ اور مجھے اس میں بٹھایا گیا۔ میاں قمرالزمان کا چھوٹا بھائی جس کی عمر بمشکل ۱۲ سال کی ہوگی۔ اس کو بھی میرے ساتھ بٹھا دیا گیا۔ میرے ساتھ والیوں کو اور سواری میں سوار کرا دیا گیا۔ اور ہمارے ساتھ ساتھ مجرے۔ آتشبازی اور باجا بھی تھا ہم آہستہ آہستہ اسٹیشن سے چونہ منڈی تک رات کے ایک بجے پہنچے۔ راجہ ہرنس سنگھ کے مکان پر میرے سسرال والوں نے قیام کا انتظام کیا ہوا تھا۔ آخر ایک نہایت خوبصورت محل کی سیڑھیوں کے آگے پالکی رکھدی گئی۔ میاں بخت نصر صاحب نے ایک ملازم کو حکم دیا۔ کہ ایک بکرا قربان کرو۔ چنانچہ بکرے کو میری پالکی کے

گرد پھرا کر ذبح کیا گیا پھر چند خوبصورت خواتین زرق برق لباس میں چھم چھم کرتی ہوئی مجھے لینے اُتریں۔ اور پالکی کا پردہ اُٹھا کر اوپر چلنے کا اشارہ کیا۔ میں پالکی سے باہر نکلی تو اُنھوں نے مجھے گود میں اٹھا لیا اور اوپر لے گئیں۔ میرا جسم اس وقت نہایت لاغر کمزور اور تپلا دبلا تھا۔ پھر چند کمرے طے کرکے اور سیڑھیاں چڑھیں۔ تو ایک خوشنما گل کاری سے منقش کئے ہوئے کمرے میں جس کے اندر کئی شہ نشین بنے ہوئے تھے۔ ایک جگہ رنگدار روئی کا فرش بچھا ہوا تھا۔ مجھے اتار را مراسنیں گانے لگیں اور ان کی ملازمین گانے میں شور مچا رہی تھیں دولھا میاں کو بلوایا۔ اور اس روئی پر ہم دونوں کو چند قدم چلایا گیا۔ پھر دولھا میاں تو باہر چلے گئے۔ مگر مجھے ایک مخملی مسند پر بٹھا دیا۔ چاروں طرف خواتین جمع تھیں۔ لیکن مجھے ٹھیک ہوش نہ تھا۔ میری آنکھیں بالکل بند تھیں۔ رونمائی کی رسم ادا ہوئی۔ تو جو کچھ مجھے اشرفیاں زیور اور روپیہ دیا گیا۔ وہ میری ملازمہ دردانہ کے پاس رکھے گئے۔ اور مجھے ایک شیرینی کا لقمہ کھلا کر اوپر کی چھت پر لے گئیں۔ وہاں دو نوعمر لڑکیاں بہت خوبصورت لباس پہنے ہوئے کچھ اہتمام کر رہی تھیں۔ مجھے بڑی نند صاحبہ جو کہ میری پھوپھی صاحبہ فرخ تاج کی سوتیلی بہو تھی۔ جس سوتن کے بچے کی شادی پھوپھی صاحبہ نے اپنی زندگی میں کی تھی وہ میری نند جسکو میں بھابی جان کہکر پکارا کرتی تھی۔ کیونکہ کوارپن کے زمانے میں نواب والا گوہر صاحب ہمارے شہر میں مسلسل تین سال سشن جج رہے تھے۔ اور یہاں ہی پھوپھی صاحبہ کے چھوٹے بچے چھوڑ کر انتقال ہوا تھا۔ یعنی اُس سے میری پوری واقفیت تھی۔ اور یہی واقفیت میرے رشتہ کی بنا تھی۔

چنانچہ وزیر صاحب کی بڑی بیٹی میری نند جس کا نام جہاں آرا تھا۔ اُن کی چھوٹی بچی خجستہ خصال نہایت خوبصورت اور پیاری پیاری بچی تھی۔ جس کی عمر تین برس کی ہوگی۔ اور اُس کا چھوٹا بھائی میمون بھی ڈیڑھ برس کا جہاں آپا کی گود میں تھا۔ جب مجھے اوپر لے جا کر بٹھایا تو خجستہ اور میمون دونوں میرے پاس جہاں آپا نے بٹھا دئے۔ اور ساتھ ساتھ کہتی تھیں۔ یہ پہلے تمہاری پھوپھی تھیں اب تمہاری ممانی ہیں۔ میں خجستہ کو گود میں لے کر پیار کرنے لگی۔ مگر جہاں آپا مجھے بڑے پیار کے لہجے میں بہت آہستہ آہستہ کہنے لگیں چلو اب کپڑے بدل کر سو جاؤ۔ تقریباً صبح ہونے والی ہے دو بجے شب کے گھر میں پہنچے تھے رونمائی کی رسم میں دو گھنٹے لگے۔ اب چار بجنے والے ہیں۔ تمہیں کوئی تکلیف تو نہیں ؟ میں نے کہا آپا جان تکلیف تو مجھے کئی دنوں سے شروع ہے۔ جب سے زیور کپڑوں کے جکڑ بند کیئے گئے۔ جہاں آپا نے ہنس کر کہا۔ شادی کے دنوں میں یہی حال ہوا کرتا ہے اچھا اب کپڑے اتار دو۔ مجھ سے شرم کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں وہی تمہاری بھابی ہوں۔ اب تم میری بھابی بن گئی ہو۔ اُن دونوں خوبصورت لڑکیوں نے قہقہہ لگایا۔ تو میں نے اشارہ کر کے جہاں آپا سے پوچھا کہ یہ لڑکیاں کون ہیں۔ جہاں آپا نے ہنسکر کہا یہ میری چھوٹی بہنیں ہیں۔ میں نے پوچھا۔ ان کا کیا نام ہے ؟ تو انہوں نے کہا بڑی کا زاہدہ بیگم اور چھوٹی کا نام زہرہ بیگم ہے۔ میں نے کہا خوب۔ پھر انہوں نے بتایا۔ کہ یہ دونو بہنیں فرخ سیر سے بڑی ہیں۔ اس کے بعد مجھے ایک سادہ جوڑہ پہنا کر سلا دیا

میں بھی گہری نیند میں بے ہوش ہوگئی۔ سات بجے صبح تک آنکھ نہ کھلی۔ بلکہ سب ہی سو رہے تھے۔ قریب سات بجے جہاں آرا بیگم اُوپر تشریف لائیں۔ اُن کے ساتھ ایک خوبصورت عورت میانہ قد کی بہت اچھے لباس میں جن کا نام ... اختر النساء بیگم تھا۔ یہ میاں نجبت نصر صاحب کی بیگم تھیں۔ مجھے جہاں آپا نے اشارہ کیا میں نے کھڑے ہو کر تعظیم کی۔ اور سلام کیا۔ اختر النسا نے بڑی محبّت سے میرے سر کو اپنی چھاتی سے لگا کر کہا۔ اب ہم دونوں مل گئیں۔ پنجاب کی رسم کے مطابق مجھے مُنہ ہاتھ دھلوا کر زرق برق کیسری تاش کے کپڑے اور زیور پہنایا۔ اور نیچے لے گئیں۔ اب دن کا وقت تھا۔ میری طبیعت بحال تھی۔ میں نے دیکھا۔ کہ دو عورتیں نہایت خوبصورت گہرے رنگ کے لباس میں بہت سا زیور پہنے ایک قالین پر بیٹھی ہوئی ہیں سامنے ایک فرشی حقّہ جس پر چاندی کا خول چڑھا ہُوا تھا۔ رکھے ہوئے تھیں۔ اور اُن کے روبُرو مراسنیں گا رہی تھیں۔ جہاں آرا بیگم اور میری انّا نے مجھے اُن کے سامنے لا کر سلام و تعظیم کروائی۔ اِن دونوں بیگمات نے بہت سی دعائیں دیں۔ اور مجھے آپا نے ایک سُرخ مخملی فرش پر جہاں گاؤ تکیئے بھی سُرخ زردوزی کام کے لگے ہوئے تھے۔ بٹھایا۔ چند عورتیں پھر میرے پاس آکر بیٹھ گئیں۔ اور مجھے انہوں نے کچھ رونمائی کے طور پر دیا گیا۔ اب مجھے ایک کمرے میں لیجا کر بٹھایا۔ جہاں ناشتہ اور چائے وغیرہ کا دسترخوان تھا۔ میری نند زاہدہ بیگم اور زہرا بیگم میرے ساتھ ناشتہ کیلئے بیٹھ گئیں۔ نجبسنہ چھوٹی چھوٹی مٹھائی کی ڈلیاں اُٹھا کر میرے منہ میں دیتی اور

میری گود میں آکر بیٹھ جاتی۔ ناشتہ کے بعد ایک اور رسم کا اعلان ہوا۔ کہ دولہن کو "کنگنا" کھیلایا جائیگا۔ چنانچہ چند خواتین نے جمع ہو کر ایک فرش پر بٹھا دیا۔ اور درمیان میں ایک چاندی کا لگن جس میں کچھ پانی پڑا تھا۔ رکھا۔ میری خوشدامنہ صاحبہ بھی پاس آکر بیٹھ گئیں۔ مراسنیں شور مچانے لگیں۔ باہر سے دولہا میاں کو بلوایا گیا۔ میرے سامنے بٹھا کر مجھے کہا گیا۔ کہ دولہا میاں کے ہاتھ پر بندھے ہوئے "شگون" کی گرہ کھول دو۔ یہ سنکر میرے ہاتھ کانپنے لگے۔ مجھ سے کب گرہ کھلتی تھی؟ آخر آنا نے گرہ کھول کر میرا ہاتھ اُس پر لگوایا۔ اس پر خوب قہقہے لگے۔ اسی طرح میرے "شگون" کی گرہ دولہا صاحب نے کھولی۔ اور دونوں "شگون" لگن کے پانی میں ڈالدئے گئے۔ ان کی ملازمہ اور بہنیں رسمیں کرتی گئیں۔ اور حقداروں کو نیگ دیتی گئیں۔ بالآخر یہ رسم قریباً دو گھنٹے بعد ختم ہوئی۔ اور دولہا میاں باہر چلے گئے۔ میں نے اوپر آرام گاہ میں آکر چند گھڑی آرام کیا۔ پھر کھانے کا وقت آگیا۔ زاہدہ اور زہرہ نے مجھے کھانا کھلایا۔ کھانا کیا کھانا تھا۔ ان کے حکیم کی تعمیل میں دستر خوان پر بیٹھنا پڑا۔ تاکہ یہ لوگ خیال نہ کریں۔ کہ بدتمیز اور بے وقوف ہے۔ لیکن مجھے کبھی اپنی نانی اماں کی کبھی امی جان اور اباجان کی یاد آکر دل پریشان ہو رہا تھا۔ مگر یہاں کے نئے لوگ اور نیا سامان دیکھ کر خاموش ہو رہی۔ شام کے کھانے کے بعد مجھے شب عروسی کا جوڑا پہنایا گیا۔ اور پھولوں کا زیور پہنایا گیا۔ بہت سے عطریات لگا دئے۔ اور رجہہ آپا مجھے ایک اور کمرے میں لے گئیں۔ جہاں میرے جہیز کا پلنگ بچھا

ہوا تھا - اور اس پر پھولوں کی چادر اور مسہری کے چاروں طرف گیندا چمبیلی
کے پھول سجائے ہوئے تھے - مجھے اس پلنگ پر بٹھا دیا - اور جہاں آرا آپا نے
میرے پلنگ کے پاس جو چھوٹی چھوٹی دو میزیں لگی ہوئی تھیں - ایک پر میری
ضروریات کی چیزیں سجا دیں - اور دوسری پر کچھ پھل اور مٹھائی وغیرہ رکھدی
میں نے خجستہ کو گود میں بٹھالیا - اسپر جہاں آپا نے کہا خجستہ خصال کیا تم
آج اپنی ممانی جان کے پاس سوؤگی؟ خجستہ نے کہا نہیں ماموں جان کے ساتھ -
جہاں آپا نے کہا خجستہ تم ماموں جان کو بلا لاؤ - خجستہ فوراً اٹھی اور اپنے ماموں
جان کو بلا کر لے آئی - جہاں آپا نے بھائی سے کہا خجستہ کہتی ہے کہ میں ماموں
جان کے ساتھ سوؤنگی - آپ اس کو اپنے ساتھ سلالیں - انہوں نے کہا -
آؤ خجستہ ہم تم دونوں کہانیاں سنیں گے اور سنائیں گے - خجستہ نے کہا
ہمیں کون کہانی سنائے گا؟ دولہا میاں نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے
کہا یہ سنائیں گی - جہاں آرا بیگم نے کہا بہت خوب! خجستہ کو دولہا میاں
نے کہا - جاؤ تم اپنی ممانی جان سے کہو کہ مجھے کہانی سناؤ - خجستہ خصال
نے میری گود میں آکر گھونگٹ کو اٹھا کر کہا پھوپھی! مجھے کہانی سناؤگی؟ میں
نے اشارہ سے کہا کہ ہاں سناؤنگی - خجستہ نے خوش ہوکر ہاتھ سے تالی بجا
کر کہا - ماموں جان پھوپھی کہتی ہیں سناؤں گی - آپا نے خجستہ کو سمجھا دیا - کہ
اب وہ تمہاری ممانی جان ہیں - خجستہ نے اپنے ماموں جان کے ہاتھ سے
ایک چھوٹا سا گلدستہ لیکر ماموں جان کے اشارہ سے مجھے لا کر دیا - میں
نے ہاتھ میں لے لیا - اس پر خجستہ ماموں کی طرف دیکھ کر ہنسی - اور

اسکے ماموں نے خجستہ کے کان میں کچھ کہا۔ خجستہ میرے گھونگھٹ میں منہ ڈال کر کہنے لگی۔ شکریہ کیوں نہیں ادا کیا آپ نے۔ جہاں آپا یہ کلمہ سنکر ہنس پڑیں۔ اور یہ کہتے ہوئے اٹھیں۔ بھائی جان! اب خجستہ نے تو آپ کا تعارف کروا دیا ہے۔ لیجئے میں جاتی ہوں آپ خود وزیر سلطان سے بات چیت کیجئے گا۔ میاں قمرالزماں صاحب نے جہاں آرا بیگم کا ہاتھ پکڑ کر کھینچ بٹھا لیا۔ اور خجستہ کو گود میں لے لیا۔ جہاں آرا بیگم نے بھائی کی جیب میں ہاتھ ڈال کر گھڑی نکالی اور وقت دیکھ کر کہا۔ رات کا ایک بج گیا ہے بھائی! آپ آرام کیجئے۔ مجھے اجازت دیجئے میں سونا چاہتی ہوں۔ میاں قمرالزماں نے کہا کہ ابھی بڑا وقت ہے۔ آپکو نیند بہت آ رہی ہے۔ جہاں آپا نے انگڑائی لیتے ہوئے کہا بھائی جان کئی دنوں سے نیند بھر کر نہیں سوئی۔ نصف رات تک گانا ہوتا رہتا ہے جب سے آپ کی شادی خانہ آبادی شروع ہوئی میں بہت کم سوئی ہوں۔ میاں قمرالزماں نے کہا۔ اچھا ۲۰ منٹ تو اور بیٹھو۔ جہاں آپا نے کہا اوہو ۲۰ منٹ تو بہت زیادہ ہیں۔ اتنے میں ایک آواز آئی "جہاں آرا بیگم کیا آپ نے دولہا دولہن کی شب عروسی کا پہرا دینا ہے"؟ جہاں آپا نے جواب دیا۔ اندر آئیے بھابی جان! میاں قمرالزماں کرسی سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اور بھابی کا ہاتھ پکڑ کر بولے آئیے تشریف رکھیئے۔ یہ اختر النساء بیگم میاں بخت نصر صاحب کی بیگم تھیں۔

وہ ایک کرسی پر بیٹھ گئیں مگر میاں قمرالزماں نے کہا بھابی جان یہاں بیٹھو کہکر انکو مسہری پر بٹھانے کی کوشش کی جس پر میاں قمرالزماں اور بھابی جان کی آپس

میں خوب کشتی شروع ہو گئی۔ بھابی جان نے کہا بھابی! میں مسہری پر نہیں بیٹھوں گی۔ یہ مسہری تم دونوں کو نصیب ہو۔ جہاں آپا نے کہا دیکھو گھڑی میں بیس منٹ ہو گئے ہیں۔ زنجیر دیکھ کر اختر النساء بیگم نے قمر الزماں سے پوچھا یہ گھڑی سسرال سے ملی ہے؟ اُنھوں نے فرمایا جی ہاں سسرال کے کپڑے جس وقت پہنے تھے تو ساتھ میاں صاحب نے گھڑی بھی عنایت کی تھی۔ جہاں آرا بیگم بولیں بہت خوبصورت ہے۔ میاں قمر الزماں نے فرمایا واقعی بہت خوبصورت ہے۔ وزیر صاحب قبلہ کے وقت کی ہو گی؟ اندر کے پردے میں ہیرے کی کنی لگی ہوئی ہے۔ بھابی جان بولیں میاں قمر الزماں ذرا اپنی بیگم صاحبہ سے دریافت تو کیجئے۔ کہ یہ گھڑی اب کی خرید ہے یا دادا صاحب کے وقت کی ہے؟ میاں قمر الزماں نے اپنی بھابی صاحبہ کے حکم کی تعمیل میں مجھ سے پوچھا "بیگم صاحبہ یہ گھڑی اب میرے لئے خرید کی گئی ہے یا پہلے سے میرے نام سے وابستہ کی ہوئی تھی" اُنھوں نے ذرا آگے جھک کر کہا کیا آپ بتا سکتی ہیں؟ بھابی صاحبہ کہنے لگیں۔ دلہن جواب نہ دے گی۔ جہاں آپا نے کہا اچھا میں پوچھتی ہوں۔ اُنھوں نے گھونگھٹ اٹھا کر کہا یہ گھڑی نئی ہے یا پرانی؟ میں نے جہاں آپا کی شرارت بھری ادا کو دیکھ کر ہنستے ہوئے کہا پرانی ہے۔ جہاں آپ نے قہقہہ لگایا۔ میاں قمر الزماں بولے آپا یہ آپ سے تو خوب باتیں کرتی ہیں۔ کیا ہم سے کچھ ناراض ہیں؟ ہمیں تو جواب تک نہ دیا۔ جہاں آپا نے کہا آپ کیوں دریافت نہیں کر لیتے کہ کیوں ناراض ہیں۔

اتنے میں ایک ملازمہ پان کی گلوریاں لیکر آئی جن پر سنہری اور نقرئی ورق

لگے ہوئے تھے۔ میاں قمرالزماں خاصدان کو ہاتھ میں لے کر آگے بڑھے اور کہا۔
بیگم صاحبہ پان لیجئے۔ میں نے آہستہ سے ہاتھ بڑھا کر ایک گلوری جسمیں نقرئی
ورق لگا ہوا تھا۔ اُٹھالی۔ میرے اٹھانے کی دیر تھی کہ ایک قہقہہ لگا۔ اور میاں
قمرالزماں بھی بھابی صاحبہ کے ساتھ کچھ اشارے کرتے ہوئے مذاق اُڑانے
لگے۔ چند منٹ یہ شغل ہوتا رہا۔ اب گھڑی میں دیکھا تو دو بجنے والے تھے۔
جہاں آپا اور بھابی جان دونو جلدی جلدی ایک دوسری کو اشارہ کرتے ہوئے اٹھیں
خجستہ کھیلتے کھیلتے مسہری پر ایک طرف سو رہی تھی۔ اسکو گود میں اُٹھا کر یکدم
بھاگ گئیں۔ میں دل میں سوچتی تھی کہ میں نے پان کی گلوری جو اُٹھالی تو کیا یہ
اچھا کیا یا کچھ غلطی کی؟ پھر مجھے خیال آیا کہ یہ غلطی نہیں۔ کیونکہ میرا سرتاج مجھکو
کوئی چیز پیش کرے اور میں نہ لوں تو یہ بدتمیزی ہے۔ میں انہی خیالات میں
تھی کہ میاں قمرالزماں صاحب شب خوابی کا لباس تبدیل فرما کر آئے۔ ان کے
چلنے پھرنے کی آہٹ سے میرے دل کی کچھ عجیب کیفیت ہو رہی تھی۔ آخر
وہ میری مسہری کے قریب آ کر کھڑے ہو گئے۔ اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ
کر بولے بیگم صاحبہ مجھے یہاں بیٹھنے کی اجازت ہے۔ اتنا کہہ کر میرے پاس
بیٹھ گئے اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے۔ میاں قمرالزماں بے حد سادہ مزاج
تھے۔ رفتہ رفتہ میں نے بھی کچھ ہاں ہوں کرنا شروع کر دیا۔ سچ ہے جس وقت
انسانی مقدّر ترقی و اقبال میں ہوتا ہے۔ تو اس کی غلطی کو عقلمندی اور بیوقوفی کو
لیاقت پر ترجیح دی جاتی ہے۔ یہی حال میری سادگی کا تھا۔ غرض شب بخیریت
ختم ہوئی۔ صبح میاں قمرالزماں اُٹھے۔ باہر جانے وقت میری ملازمہ کو جگا کر میرے

پاس بھیجدیا۔ ملازمہ نے میرے کپڑے نکالے اور پانی گرم کیا میں غسل کی تیاری میں تھی کہ اختر النسا اور جہاں آرا بیگم دونو تشریف لے آئیں۔ مجھے بہت بھاری قیمتی پوشاک پہنائی۔ زیور سے آراستہ کیا۔ میاں قمرالزماں صاحب تشریف لے آئے۔ بھابی جان ان کی طرف دیکھ کر ہنس پڑیں اور کہا میاں صاحب! شب عروسی کیسی گذری؟ ۔ میاں قمرالزماں نے بھابی جان کو ایک طرف لیجا کر کہا وزیر سلطان بالکل سادہ مزاج اور بھولی بھالی ہے۔ عادات بہت نیک ہیں۔ بھابی جان یہ چند کلمے سنکر بہت خوش ہوئیں اور کہا میاں قمرالزماں تم بھی تو سادہ مزاج اور بھولے بھالے ہو ا بیوی بھی خدا نے ایسی ہی حسب اپند دی۔ پھر جہاں آرا بیگم اور اختر النساء آپس میں باتیں کرتے ہوئے ہنسی مذاق کرتی رہیں آخر اختر النساء نے کہا وزیر سلطان تم نے اپنے میاں کو خوب موہ لیا۔ جہاں آرا میری کمر پر ہاتھ رکھ کر بولیں بڑی عقلمند بیوی ہے۔ اتنے میں خجستہ روتی ہوئی اوپر آگئی۔ اور میمون کو بھی ملازمہ گود میں اٹھائے ہوئے اوپر لے آئی سنگار کا قصہ ختم کر کے ہم لوگ نیچے کی منزل میں آگئے۔ وہاں سب نے مل کر چائے پی ناشتہ کیا۔ اب میرے جہیز کی سب چیزیں دیکھی جا رہی تھیں۔ میں نے اپنی دونو خوشدامن صاحبان کو حسب دستور سلام کیا۔ تو انہوں نے مجھے اسی سُرخ مسند پر بٹھالیا۔ میری خوشدامن صاحبہ کلاں کا اصلی نام مہرالنسا تھا۔ جو میاں نظام الدین صاحب قبلہ کی بڑی زوجہ تھیں۔ میری سگی ساس صاحبہ جب چھوٹے بچے چھوڑ کر اس جہان فانی سے رخصت ہوگئیں تو مہرالنسا بیگم نے سب بچوں کی پرورش کی تھی۔ دوسری خوشدامن صاحبہ ابھی نوعمر تھیں جس سے

آخری وقت میں قبلہ وزیر صاحب مرحوم نے شادی کی تھی۔ ان کا نام نادرہ بیگم تھا۔ وہ بیحد خوبصورت تھیں۔ یہ ان کا اصلی نام ہے۔ وزیر صاحب کا سہاگ نادرہ بیگم کو کل پانچ برس نصیب ہُوا۔ نادرہ بیگم نہایت خوش خلق نوجوان خاتون تھیں۔ یہاں بھی اختر النساء بیگم نے نادرہ بیگم سے پھر وہی باتیں شروع کردیں۔ لگا ہے میری طرف دیکھ کر ہنس دیتی تھیں۔ مگر میں ان کی گفتگو سے شرمسار سی ہو رہی تھی۔ نادرہ بیگم میرے پاس آکر بیٹھ گئیں اور مجھے نہایت محبت بھرے الفاظ میں کہنے لگیں۔ دولہن کوئی ہم سے بھی تو بات کرو؟ میں نے نگاہیں نیچی کرلیں۔ اور نادرہ بیگم نے میرے چہرے پر پیار کیا۔ اور کہا دولہن تو خدا نے حسب منشا دی ہے۔ خدا قدم مبارک کرے آمین۔ یہ کہہ کر اُٹھیں اور کسی کام میں مصروف ہوگئیں۔

اب کچھ پہلے سے میدان صاف تھا۔ میاں قمر الزماں اور میاں بخت نصر صاحب اندر تشریف لے آئے اور اپنی والدہ صاحبہ مہر النسا بیگم کے پاس بیٹھ گئے۔ میاں بخت نصر صاحب نے مجھے نہ دیکھا تھا۔ اس لئے وہ میری طرف آئے۔ ساتھ نادرہ بیگم بھی تھیں۔ اُنہوں نے مجھے کہا۔ کہ دولہن تعظیم کرو۔ میاں بخت نصر صاحب تمہیں دیکھنے آرہے ہیں۔ میں کھڑی ہوگئی۔ اور سلام کیا۔ میاں بخت نصر صاحب میرے پاس آکر بیٹھ گئے۔ اور ایک طلائی گھڑی جو کہ نہایت خوبصورت اور بیش قیمت تھی میری کلائی میں پہنادی۔ اور چند منٹ بیٹھ کر باہر چلے گئے۔ اب میرے والدین کے ہاں سے مجھے بلاوا آیا اور ساتھ ساتھ مٹھائی وغیرہ بھی آئی۔ روانگی کی تیاری ہونے لگی۔ میرے ساتھ

جو ملازمہ تھی۔ اُس کیواسطے میاں بخت نصر صاحب نے پچاس روپے کا زیور اور ایک پوشاک ریشمی کناری والی عنایت کی ۔عین اسوقت زاہدہ بیگم میری بڑی سے چھوٹی نند صاحبہ مجھکو بلانے آئی کہ بھائی صاحب بلاتے ہیں میں آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتے ہوئے اس کمرے میں پہنچی۔ تو میاں بخت نصر صاحب نے مجھ سے سوال کیا۔ کہ یہ پوشاک اورزیور تمہارے ساتھ والی خادمہ کیلیئے کافی ہیں؛ اگر کمی بیشی کرنی ہو تو بتا دیجیئے ۔میں نے آہستہ سے جواب دیا کافی ہیں۔ پوشاک پر جو زیور ہے اس کی جگہ کچھ روپے ہی رکھدئے جائیں کیونکہ زیور زیادہ قیمتی ہے ۔ اس خیال سے میاں بخت نصر صاحب بہت خوش ہوئے ۔ اور بہن کی طرف اشارہ کرکے کہا بہت عقلمند اور دانا ہے۔ دردانہ نوران کی قدیمی خدمتگار ہے اور دوسری عورت بھی۔ وہ جس کیلیئے صرف روپے رکھے گئے تھے۔ ایک معمولی خدمتگار ہے ۔اس لئے زیور مناسب نہ سمجھا بڑی دانشمند ہے اس پوشاک پر پندرہ روپے رکھ کر پھر میاں بخت نصر نے متوجہ ہوکر کہا کیا اتنے روپے موزوں ہیں؛ میں نے کہا بہت مناسب ہیں ۔اس کے بعد اور مرحلے طے ہوئے۔ مہرالنسا بیگم نے کہا یہاں سے ایک ملازمہ دلہن کے ساتھ جانی ضروری ہے۔ زیب النساء خدمتگار جو وزیر صاحب کے وقت سے مہرالنساء بیگم کے پاس پرورش پاچکی تھی بہت نیک خصال اور ابھی بالکل نوعمر تھی اُسے میرے ساتھ جانے کیلیئے تیار کردیا گیا ۔ اب میں اور میاں قمرالزماں صاحب روانہ ہوئے ۔ والدین کے شہر میں پہنچے تو سٹیشن پر میرے والدصاحب اور چند خدمتگار ایک پالکی لے کرآئے ہوئے تھے ۔ والدصاحب نے مجھے چھاتی سے لگاکر پیار کیا۔ میں زار وقطار

رونے لگی۔ جب گھر پہنچی تو نانی اماں اور امی جان میرا انتظار کر رہی تھیں۔ مجھے درجہ بدرجہ سب گھر والوں نے گلے لگایا۔ میں بار بار امی جان کو دیکھتی تھی۔ مجھے اپنی امی جان سے بھی نانی جان کے برابر ہی محبت ہو گئی تھی۔ ورنہ پہلے میں نانی جان کو بہت پیار کیا کرتی تھی۔ مگر اب اُنکا ایک اور نمبر بڑھ گیا۔ والد صاحب باہر سے آئے اور مجھے بالکل چھوٹے بچوں کی طرح پوچھنے لگے۔ کیا تم نے ریل دیکھی؟ اور سٹیشن دیکھے؟ میں نے بھی اندازِ لاؤابالی انداز سے گفتگو کرنی شروع کر دی۔ زیور کپڑے وغیرہ سب اتار کر اپنے گھر میں نہایت بیفکری سے چلنا پھرنا شروع کیا۔ اب معلوم ہوا کہ وہ سسرال کا گھر جہاں ہر بات میں احتیاط۔ ہر کام میں سوچ بچار۔ رنگ برنگ کے لباس اور زیور سے آراستہ رہنا میرے لئے کتنی تکلیف کا باعث تھا۔ اب محلہ اور پڑوس کی عورتیں مجھے دیکھنے آتیں۔ تو مجھے زیور اور کپڑے پہننے پر مجبور کیا جاتا۔ میں اُن کو جواب دیا کرتی کہ زیورات ایک شیشے کی الماری میں رکھدو۔ اور کپڑے صحن میں ایک الگن پر ڈالدو۔ جو کوئی آوے دیکھا کرے۔ اس پر نانی اماں خفا ہونے لگتیں۔ کہ ایسی باتیں نہیں کیا کرتے۔ تمکو پہننا پڑے گا تم نئی شادی شدہ ہو۔ ایسی لاؤبالی عادتیں مجھے پسند نہیں۔

امی جان خادمہ کی زبانی میری تعریف سنکر کہ چھوٹی بی بی سسرال میں بڑی عقلمندی سے وقت گزارتی رہی نہایت خوش ہوئیں۔ کہ غنیمت ہے وقت کو عقلمندی سے نبھا دیا۔ خاوند بھی خوش نظر آرہا ہے۔ چند یوم تک میاں قمر الزماں اپنے سسرال میں رہ کر واپس چلے گئے۔ اور میں والدین

کے پاس خوشی و بے فکری سے وقت گزار کر مسرور رہتی تھی۔ میاں قمر الزماں ہفتہ عشرہ کے بعد ضرور دو چار دن کے لئے میرے پاس آجایا کرتے۔ مگر مجھے اُس وقت بہت دِقّت پیش آتی۔ میں کسی کے سامنے نہ تو بات کرتی اور نہ اُن کے روبرو ہوتی۔ والد صاحب سے مجھے از حد محجوب ہونا پڑتا تھا۔ والد صاحب کے ساتھ میں حسب دستور کھانا کھا لیا کرتی تھی۔ مگر اب نانی اماں مجھ سے ناراض ہُوا کرتیں کہ تم اپنے خاوند کے ساتھ کھانا کھایا کرو۔ اور وہ تمہاری خاطر یہاں آتے ہیں۔ آخر میں نے قمر الزماں صاحب کو کہہ دیا۔ کہ "آپ میرے والد صاحب کے ساتھ کھانا کھایا کریں"۔ وہ بھی نہایت شرمیلی طبیعت کے سنجیدہ انسان تھے جس طرح میں نے کہا۔ اُنہوں نے مان لیا۔ میری بیوقوفی کا بھی میاں پر کافی رعب تھا۔ اسی طرح دو ماہ کا عرصہ گذر گیا۔

اب سسرال والوں کا تقاضہ شروع ہُوا۔ کیونکہ وہ لوگ اپنے علاقہ کشمیر میں جہاں کے باشندے تھے جانے کو تیار رہتے۔ مجھے میاں بخت نصر صاحب لینے آئے۔ اور میرے والدین کو اطمینان دلایا۔ کہ اب شادی کے بعد اُس جگہ میں بھی جانا لازمی اور ضروری ہے۔ ورنہ کچھ وقت بچّی اور آپ کے پاس رہتی۔ فقط ایک دو ماہ کے بعد میں آپ کی بچّی کو بھیجدونگا۔ مگر میں تو ایک دو ماہ کے نام سے کانپ اُٹھی۔ غرض کہ اس کے بعد اُسی رات کو میری روانگی کا وقت آگیا۔ نانی جان اپنی بیقراری کو کس حوصلے سے میری خاطرِ عزیز کیلئے برداشت کر رہی تھی۔ اور مجھے دلاسے دیتے ہوئے پیار کرتی رہیں۔ میں بے چینی اور گریہ زاری کے شور میں گھر اور والدین سے جدا ہو کر سسرال میں پہنچی۔ سب عورتیں انتظار میں

دروازے پر کھڑی تھیں۔ میں نے سب کو درجہ بدرجہ سلام کرتے ہوئے گھر میں قدم رکھا۔ اب مجھے ہر ایک بات میں سوچ سمجھ کر چلنا تھا۔ اگرچہ وہ لوگ نہایت سادہ مزاج اور خوش اخلاق تھے۔ مگر پھر بھی سسرال تھی۔ چند روز بعد ہماری تیاریاں شروع ہوئیں۔ چونہ منڈی لاہور راجہ ہربنس سنگھ کے محل کو خیرباد کہتے ہوئے ریل میں سوار ہوئے۔ میاں بخت نصر صاحب اور ان کی بیگم صاحبہ لاہور میں ہی مقیم رہے۔ اور چھوٹا بھائی فرخ سیر بھی لاہور چیفیس کالج میں تعلیم پا رہا تھا! اسکے اخراجات بڑے بھائی ادا کر رہے تھے۔ اور جائداد سب مشترکہ تھی بخیر ہم سب کی روانگی لاہور سے ہوئی۔ مجھے اپنے والدین کی جدائی کا ازحد صدمہ تھا۔ قہر درویش بر جانِ درویش خاموش تھی۔ تین کمرے ریزرو کئے گئے۔ ایک سکنڈ کلاس کے کمرے میں ہم سب عورتیں اور کچھ ضروری اسباب ایک سکنڈ کلاس میں مرد۔ ایک تھرڈ کلاس میں نوکر تھے۔ باقی سامان بُک کروا دیا گیا جس کی تعداد کافی تھی۔ میاں بخت نصر صاحب ہم کو سٹیشن پر چھوڑنے آئے تھے۔ اور مجھے نہایت شفقت سے کہنے لگے۔ تم اداس نہ ہونا۔ میں بیس یوم تک تمہارے پاس آؤنگا۔ اور اپنے والدین کو اور مجھے اپنی خیریت کا خط لکھتے رہنا۔ اگر کسی چیز کی ضرورت ہو۔ تو مجھے لکھ دیا کرنا۔ میں سر جھکائے ہوئے ان کی مدارات و شفقت آمیز گفتگو سنکر مطمئن ہوگئی تھی۔ مگر پھر بھی ان کی مہربانی و محبت کو بے طرح محسوس کر کے میرے منہ سے یہ کلمہ نکل گیا۔ بھائی جان! آپ جلد آئیے گا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے رونا شروع کر دیا۔ میاں بخت نصر صاحب نے میرا سر چھاتی سے لگایا۔ اور مجھے دلاسا دے کر کہا کہ جس وقت تم

مجھے لکھوگی۔ میں فوراً آجاؤں گا۔ اس کے بعد سب کو میری بابت کچھ پوشیدگی میں سمجھایا۔ کہ یہ نوگرفتار نازپروردہ بچی ہے۔ اس کا خیال ہر ایک بات میں مدنظر رکھنا۔ میاں قمرالزماں نے اپنے بھائی کو سلام کیا۔ دونوں بھائی بغل گیر ہو کر رخصت ہوئے۔ ریل نے سیٹی دیدی۔ میاں قمرالزماں اپنے کمرے میں چلے گئے۔ اور میں نے پھر رونے کی جھڑی لگادی۔ سبکو میری پریشانی کا خیال ہوا۔ درجہ بدرجہ سب نے مجھے دلاسا اور پیار دیا۔ آخر میں نے اپنے دل کو ملامت کی۔ کہ سب کو اپنے سفر کی دلچسپی و تفریح میری خاطر بھول گئی ہے مجھے ضبط اور صبر سے کام لینا چاہیئے۔ میں خاموش ہو کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی اور دل ہی دل میں اندازہ کرتی تھی۔ کہ میرے والدین مجھ سے اب بہت دور ہو گئے ہیں والدین کا خیال آتے ہی دل میں ایک جوش سا پیدا ہوتا۔ اور بے اختیار آنسو نکل آتے تھے۔ مگر میں نے اپنے آپ کو ہر طریق سے قابو کئے رکھا۔ خیر بارہ گھنٹے کا سفر تھا۔ شام کو ہم لوگ ریاست جموں میں پہنچ گئے۔ اسٹیشن پر کئی لوگ ہمیں لینے آئے ہوئے ہمارے انتظار میں کھڑے تھے۔ سواریاں لنڈو فٹن وغیرہ موجود تھیں۔ ہم سب گاڑی سے اتر کر اپنی اپنی سواریوں میں بیٹھ گئے ابھی ہماری لنڈو گاڑی سٹیشن کے سامنے کھڑی تھی۔ سب سامان اتر گیا۔ تو ریل بجائے آگے چلنے کے پیچھے کا رُخ کرتی ہوئی دکھائی دی۔ میں نے بیساختہ کہا۔ "یہ کیا تماشا ہے ریل واپس جارہی ہے"۔ اس بات پر میاں قمرالزماں اور ان کی بہن زہرا بیگم نے قہقہہ لگایا۔ میں خاموشی سے ان کے چہروں کو دیکھتی تھی۔ میاں قمرالزمان نے کہا۔ "ریل ہمارے علاقہ میں آکر آگے جانے کی جرأت

نہیں کرتی اور خوف کے مارے پیچھے ہٹ جاتی ہے۔" زہرہ بیگم نے کہا بھابی جان! نہیں نہیں بھابی جان جھوٹ کہتے ہیں۔ ریل آگے کیسے جا سکتی ہیں۔ ادھر تو دیکھو سامنے کالے پہاڑ ہیں۔ اس لئے وہ سواریاں چھوڑ کر واپس چلی جایا کرتی ہے۔"

میں خاموشی کے ساتھ تعجب سے سب کچھ سنتی گئی۔ میاں قمر الزماں نے کہا "آرام تو صرف ریل تک محدود تھا۔ اب ہم "ریاسی" تک پیدل جائیں گے۔" (ریاسی قصبہ کا نام ہے) میں نے حیران ہو کر کہا "اچھا" ایسی ہی مذاقیہ گفتگو میں مکان آگیا۔ وہاں بھی چند عورتیں اور مرد دروازے پر کھڑے انتظار کر رہے تھے ہم سب اترے اور اوپر کی منزل میں جہاں ہمارے واسطے پلنگ بستر فرش، روشنی اور پانی وغیرہ کا نہایت اعلیٰ انتظام تھا۔ چلے گئے۔ نادرہ بیگم نے کہا دلہن یہ ہمارا مکان محض آمد و رفت لاہور کے لئے وزیر صاحب کے وقت سے خریدا ہوا ہے۔ یہ ضروریات سب ہماری ہیں۔ لاہور سے آتے جاتے ہم اکثر یہاں قیام کرتے ہیں۔ میں نے پوچھا۔ خالہ جان آپ کا اصلی گھر کہاں ہے؟ انہوں نے جواب دیا۔ وہ ابھی تھوڑی دور ہے۔ خفیف ہنسی سے مجھے پیار کرکے کہا "اب ہم جلدی اپنے گھر پہنچ جائیں گے۔ بہت سی لڑکیاں تمہارا انتظار کرتی ہونگی۔ وہاں تمہارا دل بہل جائے گا۔

رات کو سب نے کھانا کھایا۔ جو اسی جگہ ہمارے لئے تیار کیا گیا تھا۔ پھر سب نے آرام کیا۔ صبح ہوئی ہر دو خوشدامن اور ان کی ملازمہ نے نماز ادا کی میں نے غسل کیا۔ کپڑے بدلے۔ اب پھر چلنے کی تیاری ہونے لگی۔ اوپر کی چھت پر میاں قمر الزماں زہرہ بیگم اور میں تینوں چاروں طرف سے شہر کا نظارہ

کر رہے تھے۔ ہمارے قریب ہی مہاراجہ پرتاپ سنگھ امر سنگھ والئے ریاست جموں کا فیل خانہ تھا۔ جو بڑے وسیع پیمانہ پر تھا۔ چاروں طرف بڑے بڑے ستون تھے۔ ان میں لوہے کی زنجیریں لٹک رہی تھیں۔ کئی ستونوں سے ہاتھی بندھے ہوئے جھوم رہے تھے۔ میں اُن کو تعجب کی نگاہوں سے دیکھتی رہی۔ پھر میاں قمر الزماں سے سوال کیا:۔

"یہ ہاتھی مہاراجہ صاحب نے کیوں اتنے رکھے ہوئے ہیں؟"

میاں قمر الزماں"۔ راجہ صاحب ان سے بہت کام لیتے ہیں۔ شکار کھیلتے ہیں۔ جب کبھی کوئی نادر موقعہ ہو تو جلوس نکالتے ہیں۔"

مَیں:۔ "ان کا خرچ بہت ہوتا ہوگا؟"

میاں قمر الزماں۔ راجے مہاراجے ایسے اخراجات کو محسوس نہیں کیا کرتے۔"

ہم کچھ دیر ایسی ہی باتیں کرتے رہے۔ چاروں طرف پہاڑ ہی پہاڑ تھے جنہیں میں حیرانی سے دیکھتی رہی۔ زہرہ بیگم نے کہا بھابی جان وہ سامنے جو پہاڑی ہے۔ اس کے پیچھے ہمارے گھر کا راستہ ہے۔

میں"۔ اب ہم کیسے وہاں جائیں گے؟"

میاں قمر الزماں"۔ گھوڑوں اور خچروں پر سواری کریں گے! سامان بھی خچروں پر رکھا جائیگا۔

مَیں:۔ "ہم کیسے گھوڑے پر چڑھیں گے؟"

میاں قمر الزماں۔ اب تو چڑھنا ہی پڑے گا!

یہ سنکر میں بدحواس سی ہوگئی۔ کہنے لگے"۔ اب پنجاب نہیں جاسکتیں ہیں

خاموش تھی - اور کچھ پریشان بھی - قمرالزماں اور زہرہ بیگم نے پھر قہقہہ لگایا - میں بدستور چپ سادھے ہوئے تھی - میری خاموشی اور حیرانی پر وہ اور بھی ہنسے - اسی طرح مجھے ان دونوں بھائی بہن نے ملکر خوب پریشان کیا - اب نیچے سے آواز آئی کہ چائے اور ناشتہ تیار ہے - آجاؤ - ہم نیچے اُترے - ایک رئیس اعظم کے گھر سے آئے ہوئے کئی قسم کے خوان مٹھائیاں - اور دو سموار چائے سے بھرے رکھے تھے - ہم سب نے چائے پی ناشتہ کیا - اتنے میں سواریاں دروازے پر آگئیں - اسباب رکھے جانے لگے - پالکیوں کے اوپر سُرخ رنگ کے پردے جن پر سبز بنات کی جھالر لگی ہوئی تھی پڑے تھے - دونوں خوشدامن صاحبان - اور میں اپنی اپنی پالکیوں میں سوار ہوگئیں - باقی سب ملازم عورتیں اور رمردگھوڑوں اور خچروں پر سامان وغیرہ کیساتھ ساتھ چلے - میاں قمرالزماں گھوڑے پر سوار ہوکر ہماری پالکیوں کے درمیان چلنے لگے - ۱۶ نفر کہاروں کا سیٹ پالکیوں کا نگہبان تھا - تمام دن یہ سفر جاری رہا - بڑے بڑے پہاڑ طے کرکے ایک منزل پر پہنچے جس کے قریب دریائے چناب تھا - پاس ہی ایک میدان میں زمیندار لوگوں کے گھر تھے - اس میدان میں ایک مکان کے قریب سب پالکیاں رکھی گئیں - اور ہم سب اندر کمرے میں داخل ہوئے - وہ کمرہ بہت لمبا چوڑا تھا - ایک سن رسیدہ عورت ایک طرف بیٹھی رو رہی پکار رہی تھی - اور اس کے پاس ایک نوجوان لڑکی تھی - جس کا لباس میلا کچیلا تھا - دونوں اپنے کھانے کا کچھ اہتمام کررہی تھیں - میں نے اُن کی طرف تعجب کی نگاہ سے دیکھا - تو مجھے زہرہ بیگم نے کہا بھابی جان سلام کرو -

میں نے اس بڈھی عورت کو سلام کیا۔ اس نے مجھے دعا دی۔ اور کہا یہ نئی دولہن ہے؟ نادرہ بیگم نے کہا ہاں یہ دُلہن ہے۔ میں نے زہرہ بیگم کی طرف اشارہ کرکے کہا یہ کون ہیں؟ انہوں نے کہا تمہاری ساس ہیں اور یہ نند ہے۔ یہ سنکر میں حیرت سے اُنکا منہ تکنے لگی۔ اس پر نادرہ بیگم ہنسکر بولیں۔ زہرا تم کیوں بھابی کو حیران کر رہی ہو۔ نہیں دولہن! یہ زمیندار عورتیں اِس مکان کی مالک ہیں۔ راہ گذر مسافر یہاں کشمیر جاتے ہوئے یا دیگر ضلع کشمیر میں جاتے وقت شب کو آرام کرتے ہیں۔ میری طرف متوجہ ہو کر نادرہ بیگم نے کہا۔" دولہن تم نے سمجھا ہوگا یہ ہمارا گھر ہے"؟ میں خاموش رہی۔

میں اور زہرا بیگم دونو دروازے پر کھڑی ہوکر باہر کا منظر دیکھنے لگیں۔ ریاست جموں کے باشندے اکثر ہندو ہُوا کرتے ہیں۔ وہ اپنے کھانے کا انتظام کر رہے تھے۔ اور ہمارے ملازم چھولداریاں میدان میں لگا رہے تھے باورچی پتھروں کے چولھے بنا کر چائے دکھانے کا انتظام کر رہے تھے۔ دریائے چناب کی آواز یہاں تک آ رہی تھی۔ دریائے چناب کا صاف شفاف پانی چاندی کی طرح تھا۔ جو پہاڑوں سے ٹکرا کر غضب کا شور و شر پیدا کر رہا تھا۔ جب شام ہوگئی تو میری خوشدامن صاحبہ مہرالنساء بیگم نے کہا "کیا وجہ ہے کہ اب تک میاں قمرالزماں نہیں پہنچے۔" نادرہ بیگم نے کہا۔ راستے میں کوئی شکار مل گیا ہوگا۔ بندوق ساتھ ہے۔" دیر ہونے پر سب کو تشویش پیدا ہونے لگی۔ مہرالنساء بیگم بہت بیقرار ہو رہی تھی۔ ہم رفتہ رفتہ اس پریشانی کے عالم میں میدان کے کونے کی طرف چلی گئیں۔ وہاں سے ایک پہاڑی کا راستہ نظر آ رہا

تھا۔ مجھے تو کیا معلوم ہوتا تھا۔ یہ سب اس طرف ٹکٹکی لگائے دیکھ رہی تھیں ہمارے دیکھتے دیکھتے ایک خوبصورت کمیت گھوڑی جو بالکل رسالہ کی گھوڑیوں کی طرح فربہ اور صاف ستھری تھی۔ اس پر میاں قمر الزماں سوار تھے۔ نظر آئے۔ ان کے ہاتھ میں بندوق تھی۔ ملازموں کے کندھوں پر ایک بانس میں پہاڑی ہرن شکار کیا ہُوا لٹک رہا تھا۔ جب وہ خیرو عافیت سے قیامگاہ پر پہنچے تو سب نے خدا کا شکر ادا کیا۔ مہرالنسا نے کہا۔ بٹیا تم ایسا نہ کیا کرو۔ میری جان لبوں پر آ گئی تھی۔ سب پریشان ہو رہے تھے۔

قمر الزماں نے کہا۔ اماں جان اس پہاڑی پر شکار بے حد تھا۔ میں اور بھی چند گھنٹے ٹھہرتا۔ محض آپ کے۔ ہم اور بیقراری کی خاطر جلدی آ گیا۔ اور زہرا بیگم کی طرف اشارہ کر کے کہا کیا میری بیگم صاحبہ کو بھی کچھ فکر تھا؟ زہرا بیگم نے جواب دیا۔ کہ پہلے تو کچھ یہاں کے میدان اور دریا کی آوازوں سے تعجب میں تھیں جب والدہ صاحبہ نے شور مچایا کہ شب اندھیری ہو رہی ہے ابھی تک کیوں قیامگاہ پر نہیں پہنچے؟ تو ان کے چہرے پر افسردگی چھا گئی تھی شکر ہے کہ آپ جلدی آ گئے۔ رات کا اندھیرا اور دریا کی خوفناک آواز بہت ڈراؤنی معلوم ہو رہی ہے۔ یہ سنکر میاں قمر الزماں مسکرا دئے۔ اور پھر ایک ملازمہ سے کہا رستم علی خانساماں کو بلاؤ۔ رستم علی آ گیا۔ تو ہرن اُسے دیکر کہا۔ لو اس میں سے تھوڑے گوشت کے کباب تیار کرو۔ اُس نے عرض کی۔ جناب اس کو صاف کرنے میں دیر لگے گی۔ ورنہ ابھی تیار کر دیتا۔ میاں قمر الزماں نے کہا۔ اچھا ٹھہرو میں خود ہی صاف کئے دیتا ہوں۔ یہ کہکر

جلدی جلدی ہرن کے گوشت کے ٹکڑے کئے اور باورچی کے سپرد کر کے پھر
اندر آ کر والدہ صاحبہ کے پاس بیٹھ کر ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے۔ کھانے کے
بعد آرام کیا۔ صبح سفر کی تیاری شروع ہوئی۔ پالکیاں میدان میں لا کر رکھی گئیں۔
اور چھولداریاں وغیرہ سب اکھاڑ کر خچروں پر بار کی گئیں۔ سامان سب لاد دیا گیا۔
سفر میں اچھا خاصہ قافلہ تھا۔ میرے لئے ہر ایک بات تعجب خیز تھی۔ ہم کئی
میل تک دریائے چناب کے کنارے پر چلتے رہے۔ کہاروں کی آپس میں
جو باتیں چلتے وقت ہوتی تھیں۔ میں اُن کی نظم و نثر کبھی ہنس دیتی اور کبھی متعجب
ہو جایا کرتی تھی۔ پچھلے کہاروں کو "اندھیرے والے" اور جو کہار آگے ہوتے تھے
ان کو "چاندنی والے" کہتے تھے۔ یہ لوگ آپس میں عجیب قسم کی باتیں کرتے تھے
جب سامنے پتھر یا بجری کے میدان آ جاتے۔ تو چاندنی والا کہتا۔ بھائی
"موتیا چور ہے"۔ اس کے جواب میں اندھیرے والا کہتا "چل دانا بھر پور
ہے"۔ غرضیکہ ایسی بہت سی بولیاں آپس میں بولتے جاتے تھے۔ اکثر میدان
جو راستہ میں آتے۔ اُن میں ادرک اور ہلدی کی فصل کے چھوٹے چھوٹے کھیت
بہت بھلے دکھائی دیتے تھے۔ قصبہ کے قریب پہنچ کر تو بے حد اونچے پہاڑ تھے۔
ایک پہاڑ کی چڑھائی کئی میل کی تھی۔ گھنے درخت۔ نیچے دریا۔ اگر پاؤں
پھسل جائے تو انسان ہزاروں فٹ نیچے دریا میں غرق ہو جائے۔ ناواقف
انسان کے لئے بہت خطرناک مقام تھا۔ درمیان میں پہاڑوں کے راستے
ایسے گم ہو جاتے کہ نہ سامنے کچھ معلوم ہوتا نہ پیچھے کا پتہ لگتا۔ مگر یہ گھوڑے اور
خچر خود بخود ان خطرناک منازل کو بڑی آسانی سے طے کرتے جاتے۔ بعض

جگہ تو کہار بیچارے پسینہ پسینہ ہو جایا کرتے۔ دریائے چناب کا نظارہ قابلِ دید تھا چیل کے درختوں کی چوٹیاں آسمان سے لگی ہوئی تھیں۔ اخروٹ اور جنگلی انار کے درخت پہاڑوں کی بلندیوں پر کثرت سے دکھائی دیتے تھے۔ اب خدا خدا کرکے قصبہ آگیا۔ یہاں ایک قلعہ تھا۔ جو مہاراجہ کشمیر نے بارود اور سکہ وغیرہ رکھنے کے لئے تعمیر کیا ہوا تھا۔ دیکھنے میں بہت پرانا معلوم ہوتا تھا۔ اُس کے نیچے ایک میدان میں پالکیاں رکھی گئیں۔ اور پھر مجھے زیور و کپڑوں سے آراستہ کیا گیا۔ قصبہ کی کئی عورتیں مجھے وہاں ہی دیکھنے آگئیں

اب ہم چند منٹ میں قصبہ کے ایک دو بازار طے کرکے وزیر صاحب مرحوم کے اصلی مکان پر پہنچ گئے جس کے بیرونی دروازے پر کلمہ شریف اور کچھ شعر لکھے ہوئے تھے۔ اس دروازے کے اندر ایک صحن میں سب پالکیاں اتاری گئیں۔ مراسنیں اور محلہ کی عورتیں گانے بجانے کا شغل کر رہی تھیں مجھے پالکی سے اتارنے کے لئے ناواقف عورتیں بسم اللہ بسم اللہ کہتی ہوئی آئیں۔ اور ایک خاص کمرے میں جہاں نہایت مکلف فرش بچھا ہوا تھا لے جاکر بٹھا دیا۔ یہاں بھی مجھے روپے اور تحائف وغیرہ دئے گئے۔ اتنے میں کھانے کا وقت آگیا۔ سب نے مل کر کھانا کھایا۔ ایک خوبصورت نوجوان عورت میرے قریب آکر بیٹھ گئی اور اس کے ساتھ ایک ۱۱ یا ۱۲ برس کی لڑکی تھی وہ بھی خوبصورت اور بھولی بھالی جیسے سنگ مرمر کا مجسمہ۔ یہ دونو محبت بھری نظروں سے مجھے دیکھتی رہیں۔ میں نے اُنکے چلے جانے پر زہرہ بیگم سے پوچھا۔ یہ کون تھیں؟ زہرہ بیگم نے ہنس کر کہا یہ بھی تمہاری ساس اور نند ہیں۔ مجھے یقین نہ آیا۔ کیونکہ ہمیشہ مجھے زہرہ جھٹلایا

کرتی تھی۔ آخر مہرالنساء بیگم نے کہا۔ کہ دولہن یہ تمہارے خسر صاحب
کی کنیز بیگم ہے جسکی ایک ہی بچی ہے اور یہ ہمیشہ اسی مکان میں رہا کرتی ہیں۔

تیسرا باب

ساس نندوں کیساتھ سسرال میں گذر اوقات

زہرہ بیگم نے سونے کا کمرہ اور باقی ضروریات کی تمام چیزیں مجھے دکھائیں میں نے تمام اشیا کو دلچسپی سے دیکھا۔ ابھی ہم کھانے سے فارغ ہو کر بیٹھی تھیں کہ میاں قمرالزماں صاحب تشریف لائے۔ رات بہت گذر چکی تھی۔ میاں قمرالزماں کو قصبہ کے لوگ ملنے کیلئے آئے ہوئے تھے میں رات بھر آرام کر کے صبح اُٹھی۔ غسل کیا۔ کپڑے بدلے زیور پہنا اور پھر دُلہن بنکر مسند پر بیٹھ گئی قصبہ کی عورتیں آنی شروع ہو گئیں۔ جب دوپہر کا وقت ہُوا۔ تو میں اور زہرہ بیگم دونو اُوپر چھت پر چلی گئیں۔

میں نے زہرہ بیگم سے پوچھا۔ کیا یہاں بالاخانہ کا رواج نہیں ہے؟ اس نے کہا "یہاں بالاخانہ بنوانے کی ممانعت ہے۔ وہ قلعہ مہاراجہ کشمیر کا جو سامنے نظر آتا ہے۔ اس کے مقابلہ پر کوئی اونچا مکان تعمیر نہیں کر سکتا" سامنے چاروں

طرف پہاڑ نظر آتے تھے۔ درمیان میں چھوٹا سا قصبہ "ریاسی" کے نام سے مشہور تھا۔ یہاں کے باشندے اکثر ہندو تھے۔ اور وہ ہندو جو ریاسی کے رئیس کہلاتے تھے۔ ان کی ذات کا نام بھی "رسیال" تھا۔ قریباً تین چار صد ہندوؤں کی آبادی تھی۔ اور مسلمان کشمیریوں کی بمشکل یک صد کے قریب ہو گی۔ ہماری رہائش کے چاروں طرف مسلمانوں کی آبادی تھی۔ ہمارا محل بہت بڑا خوبصورت اور فراخ تھا۔ ایک طرف مردانہ دیوانخانہ تھا۔ اس کی ڈیوڑھی میں ہر وقت ملازم باوردی کھڑے رہتے تھے۔ اور سامنے کے صحن میں پھولوں کے پودے نظر آ رہے تھے۔ دیوان خانہ کے مغربی پہلو میں مودی خانہ تھا۔ اور سامنے کی طرف اصطبل تھا۔ جہاں کئی قسم کے گھوڑے ہر وقت بندھے رہتے تھے۔ ایک طرف چند گائے بھینسیں کھڑی تھیں۔ غرضیکہ وزیر صاحب مرحوم کا محل گویا اس قصبہ کا سنگار تھا۔

دوسرے روز رمضان شریف کا چاند نمودار ہوا۔ سب نے روزے رکھے۔ نماز کے تو یہ سب لوگ ہمیشہ ہی سے پابند تھے۔ جب شام کی افطاری کا وقت آیا۔ تو مجھے اپنے والدین کے گھر کی یاد بےقرار کئے دیتی تھی۔ میں صبر اور خاموشی سے چپ چاپ بیٹھی رہی۔ اگرچہ یہ ایک بڑے پیمانہ کا گھرانہ تھا۔ سب چیزیں فراواں اور بیشمار تھیں۔ گویا لاکھ پتی گھر تھا۔ مگر مجھے اپنے والدین کے غریب گھر کی نازبرداری یاد آ گئی۔ وہاں میں جب کبھی روزہ رکھتی۔ نانی اماں بار بار کہتیں۔ آج بچی کا چہرہ کملایا ہوا ہے۔ روزہ افطار کرنے کیلئے خاص چیزیں میری خاطر پکوائی جاتیں۔ والد صاحب پھل یا مٹھائی وغیرہ کوئی نئی چیز بازار سے لا

دیتے اور مجھے کہتے۔ کہ روزہ کھول کر کھانا۔ میں اُن چیزوں کو سجا کر رکھ لیتی۔
شام ہونے پر جب میں روزے کی شدت محسوس کرتی۔ تو والد صاحب ہاتھ
میں گھڑی لیکر کھڑے ہو جاتے۔ اور کہتے کہ بس اب وقت قریب ہے ذرا
دیر یا چند منٹ میں اب میرا بیٹا روزہ کھولے گا۔ مجھے والد صاحب ہمیشہ
مردانہ نام سے پکارا کرتے تھے افطاری کے وقت خوشی کا اظہار کرتے کہ اب روزہ
افطار ہوگا۔ مگر یہاں تو خدمتگار روزہ دار تا اور گھر کے سب لوگ کسی چیز کی پرواہ
نہ کرتے تھی شام ہوئی کھجوروں سے سب نے روزہ افطار کیا اور نماز میں مصروف ہوگئے
مجھے اب دل ہی دل میں اپنی نادانیوں پر غصہ آیا۔ نماز سے سب فارغ ہوکر سب
چائے پیتے اور پھل کھانے لگے۔ ان کے ہاں روزہ کھولنے کا دستور پنجاب سے
نرالا تھا۔ وجہ یہ کہ سرد ملک کے لوگ افطاری کے لئے ہمارے پنجاب کی طرح
شربت فالودہ وغیرہ استعمال نہیں کرتے تھے۔ کیونکہ سردی کی وجہ سے یہ
چیزیں استعمال نہیں کی جا سکتی تھیں۔ کئی قسم کی چائے ا تھوڑے تیار ہوئے۔ مجھے
کچھ تو افطاری سے پہلے کا غصہ تھا۔ اور اس پر نماز میں اور بھی غصہ آگیا۔ نماز
سے اُٹھنے کو دل نہ چاہتا تھا۔ یہ سوچتی تھی کہ اب عشاء کی نماز پڑھ کر اٹھوں گی
زہرا بیگم پھل اور باکر خانیاں رکھے چائے پینے کیلئے میرا انتظار کر رہی تھیں۔
مجھے آواز دی کہ بھابی جان چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے"!
خورشید امن صاحبہ" کیوں بلاتی ہو۔ کچھ نماز کے بعد پڑھتی ہوگی"!
اِس لفظ پر مجھے اور بھی غصہ آگیا۔ مگر زہرا بیگم کچھ منہ میں بڑبڑانے لگی۔ اور
پھر کہا" بھابی جان اتنی لمبی نماز نہ کرو۔ آؤ کچھ کھالو۔ میں اس کے اصرار پر مصلے

سے اُٹھی۔ اور زہرا کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔

زہرا بیگم "۔ بھابی جان! کھاؤ۔"

میں "۔ کچھ دل نہیں چاہتا۔"

زہرا بیگم (مسکرا کر) کیوں نہیں چاہتا؟ کچھ کھاؤ (پھلوں کی پلیٹ آگے بڑھاتے ہوئے) کھاؤ میں بھی تمہارے ساتھ کھاتی ہوں۔"

میں نے ایک دو پھل کھائے اور ہاتھ کھینچ لیا۔ لیکن یہاں رات کے کھانے کا نام تک نہ تھا۔ میں اپنے کمرے میں پلنگ پر لیٹ گئی۔ اور بے اختیار رونا شروع کر دیا۔ اتنے میں میاں قمرالزماں صاحب تشریف لائے۔ مجھے لحاف اوڑھے ہوئے دیکھ کر پوچھا۔

"کیوں کیا حال ہے۔ روزہ افطار کیا؟"

میں "۔ جی ہاں!"۔ میری آنکھیں سُرخ ہو رہی تھیں۔ میری طرف دیکھ کر کہنے لگے۔

"تمہاری آنکھیں کیوں سُرخ ہیں؟"

میں "۔ نہیں ایسے ہی ہیں۔"

قمرالزماں۔ میرے بہت سے دوست آئے ہوئے تھے۔ کہتے تھے۔ ہم یہاں ہی روزہ افطار کریں گے۔ میں نے کہا میری بیوی جب خود اپنے ہاتھ سے کھانا پکائے گی۔ تو پھر آ کر روزہ افطار کرنا۔"

میں خفیف سی ہنسی سے خاموش ہو گئی۔ انہوں نے پھر پوچھا "آج تمہاری طبیعت پریشان کیوں ہے؟"۔ میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

میاں قمرالزماں "۔ خیر باشد۔"

میں خاموش ہو گئی۔ اس پر میاں قمرالزماں دل میں کچھ سوچ کر افسردہ سے ہو گئے۔ میں نے اپنی سادگی سے پوچھا۔

" آپ کیوں خاموش ہو گئے ؟ مجھے کسی نے کچھ نہیں کہا۔ اور نہ کوئی خاص بات ہے۔ محض اپنے والدین کی یاد آئی تھی جو رمضان میں میری ...... " یہ کہہ کر پھر آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ گلا گھٹنے لگا۔ میں نے ساون کی جھڑی لگا دی۔

قمرالزماں "۔ اچھا ہم کل باغ میں روزہ افطار کریں گے۔ تمہارا دل بہل جائیگا۔"

رات کے ۸ یا ۹ بجے کے قریب روزانہ دستور کے مطابق سب نے کھانا کھایا۔ اور سو گئے۔ اسی طرح رمضان کا مہینہ گذرتا رہا۔ سب کو میری خوشنودی کا خیال تھا۔ اور میں بھی جہاں تک ہو سکتا تابعداری کیا کرتی تھی ساس نند کے حکم کے مطابق ہر بات میں اپنے آپ کو مجبور کر کے ان کی مدارات کا خیال رکھتی۔ مگر پھر بھی اپنی نادانی اور والدین کی نازبرداری کا تقاضا ہو ہی جایا کرتا تھا۔ اس معاملے میں میں بالکل بے بس تھی۔ سنبھلتے سنبھلتے طبیعت مانوس ہو گئی۔ کچھ دنوں بعد میرے والدین کا تقاضا شروع ہوا۔ کہ ہم بہت اداس ہو رہے ہیں۔ میاں بخت نصر کا خط آیا کہ "عزیزہ کو لیکر اُن کے والدین کے ہاں چھوڑ آؤ۔ وہ بہت پریشان ہیں۔ رفتہ رفتہ جدائی برداشت ہو جائے گی۔ پہلی بار دیر نہ کرو"۔ میاں قمرالزماں صاحب نے اپنے بھائی کے حکم کی تعمیل کی۔ اور مجھے ساتھ لیکر والدین کے پاس پہنچے۔ مگر پہاڑی راستہ مجھے تکلیف دہ معلوم ہوتا تھا۔ یہ لوگ تو بے پرواہ تھے۔ ان کا وطن تھا۔ خود پہاڑی تھے۔ میں والدین کے ہاں اکثر جلدی جلدی آیا کرتی تھی مجھ سے زیادہ میاں بخت نصر کو میرے والدین کا خیال

تھا۔کبھی بھی آزردہ خاطر نہ ہونے دیتے۔سب خورد و کلاں میری عزت و توقیر کیا کرتے تھے سسرال میں میرے دن عید اور رات شب برات کی طرح گذرتے رہتے۔ اگر کوئی غلطی بھی ہو جاتی تو کوئی اُف تک نہ کرتا۔سب کی محبت یکساں تھی۔

میاں قمرالزماں کے دل میں دن بدن محبت بڑھتی رہی۔ اور جہاں تک ممکن تھا۔میں بھی تابعداری میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرتی۔گھر کا انتظام خوشدامن صاحبہ کے سپرد تھا۔میرا وقت بالکل بےفکری اور غیر ذمہ داری میں گذرتا تھا۔اس وقت تو دستکاری کے کام بھی ایسے نہ تھے۔معمولی سینا پرونا اور کچھ جالی کا کشیدہ مجھے آتا تھا۔مگر میں بڑی دستکار سمجھی جاتی تھی۔کچھ کتابیں مسائل اور حدیث کی بھی یاد تھیں۔میری خوشدامن صاحبہ نادرہ بیگم کو کتابیں سننے کا بیحد شوق تھا۔وہ مجھ سے الف لیلہ۔چہار درویش۔جان عالم وغیرہ کتابیں سنا کرتی تھیں۔

ایک دن زہرا بیگم نے مجھے شوق سے کہا۔کہ بھابی جان آج کل کے موسم میں دریائے چناب کی سیر کرنی چاہیئے۔ہم اکثر جایا کرتی تھیں۔اب تو مدت ہوگئی کبھی اتفاق نہیں ہوا۔" زندہ دلی تو میری ذات میں بھی تھی۔میں نے رائے کے مطابق اپنی خوشدامن صاحبہ مہرالنسا کے آگے نہایت ادب سے التجا کی۔کہ ہم آپ سے ایک عرض کرنا چاہتی ہیں۔ان کو معلوم ہوگیا۔اپنی قیافہ شناسی سے کہا۔کیا کہتی ہو بتاؤ۔کوئی لایعنی امر نہ کہنا۔

میں نے مسکرا کر کہا۔اماں جان آپ تو پہلے سے ہی پیش بندی کر رہی ہیں لہذا کیا عرض کروں اب؟۔ انہوں نے کہا۔اچھا بتاؤ۔میں نے جواب دیا عرض

یہ ہے۔ کہ ہمیں دریائے چناب کی سیر کے لئے صرف ایک دن صبح سے شام تک اجازت دیدیجئے۔ مہرالنسا نے کہا میں پہلے ہی سمجھتی تھی۔ کہ نند بھاوج کچھ مشورہ کر کے آئی ہیں۔

زہرا بیگم۔" اماں جان تو کیا حرج ہے۔ آپ سے اجازت چاہتی ہیں"

مہرالنسا۔" بیٹی کیسے اجازت دوں؟ ابھی گذشتہ نصیحت ہی مجھے یاد ہے"

میں ہراساں سی ہوگئی اور زہرا بیگم کی طرف دیکھ کر پوچھا" کیا ہوا تھا؟"

زہرا بیگم۔" ہمارے پڑوس کی ایک عورت شرارت کرتے ہوئے دریا میں گر گئی تھی ہم نے بمشکل اسے پکڑا تھا۔ اُس دن سے یہ ناراض ہیں!"

یہ سنکر میں نے کہا آپ میری خاطر اجازت دیدیجئے۔ میں نے کبھی دریا نہیں دیکھا۔ مجھے بیحد شوق ہے"

مہرالنسا۔" دولہن! تمہارے خاوند صاحب باہر گئے ہوئے ہیں۔ گھر میں کوئی دانا آدمی نہیں۔ جو تمہارے ساتھ جا سکے۔ تم سب کا مجھے اعتبار نہیں۔ خدا نہ کرے کوئی ایسی ویسی بات ہو جائے۔ تو میں کیا جواب دونگی؟"

زہرا بیگم۔" اماں جان! یہ تو آپ کے وہم ہیں۔ بھائی جان کو خدا کے بھروسے پر اجازت دیجئے"

مہرالنسا۔" اچھا! تمہارے ساتھ کون کون جائیگا؟

زہرا بیگم۔ خالہ نادر بیگم بھی تو ہونگی۔

مہرالنساء - ہاں وہ تو بہت لائق اور دانا ہے۔ جو تم سب سے زیادہ شرارت کریگی۔ (قدرے ناراض ہو کر) تم نے تو بہت تنگ کر رکھا ہے۔ تمہارا کیا علاج ہو آخر؟"

ہم دونوں ندیدی مسکین بلّی کی طرح ان کی خدمت میں عاجزی سے کام لے رہی تھیں۔ اماں جان کبھی نرم ہو جاتیں اور کبھی سخت۔ آخر کہنے لگیں " وہاں دریا پر کوئی شکاری آگیا تو بے پردگی ہو گی "

زہرا بیگم:" نہیں اماں جان! وہاں کون شکاری آئیگا۔ ہم سب تو کالی پہاڑی کے نیچے جا رہی ہیں!"

غرضیکہ بڑی مشکل سے ہم نے اماں جان سے اجازت حاصل کی۔ اب ہم نے تمام محلے میں کہلا دیا۔ کہ صبح ہمارے ساتھ سب نے دریا پر جانا ہوگا۔ ہم دونوں نے خوب کھانے پکوائے۔ مرغ کباب۔ گوشت۔ روغنی روٹیاں۔ پلاؤ۔ اچار چٹنیاں۔ پھل مٹھائی۔ اس کے علاوہ اپنے کپڑے اور ضروریات کی چیزیں چٹائیاں وقالین وغیرہ۔ غرضیکہ دریا کے کنارے پر فرش کرنے کے لئے سب سامان تیار کر لیا۔ مگر رات کو کالی گھٹائیں اُمڈ کر آگئیں۔ اور بارش ہونے کی وجہ سے ہمارا جانا ملتوی ہو گیا۔ اس خیال سے ہم بہت پریشان تھیں۔ نادرہ بیگم بھی ہماری خوشی میں شامل تھیں۔ وہ نماز عشاء پڑھ رہی تھیں میں نے کہا۔ دعا کریں۔ کہ بارش تھم کر مطلع صاف ہو جائے۔ اور ہماری تیاری سلامت رہے۔

نادرہ بیگم نماز اور دعا سے فارغ ہو کر ہمارے پاس آئیں اور آسمان

کی طرف دیکھ کر کہا خدا فضل کرے۔"

ساون کا مہینہ تھا۔ اور بےفکری کا زمانہ۔ پھر نوعمری۔ عیش و عشرت کے سامان۔ میں نے گانا شروع کر دیا۔

جا ری بدریا برس کسی اور دیس!
من بہلانے سکھیاں آئیں پیا گئے پردیس!
جا ری بدریا برس کسی اور دیس!

نادرہ بیگم بھی گانے کی شائق تھیں۔ ان کو میرا برموقعہ گانا بہت پسند آیا۔ اور بہت خوش ہو کر تالیاں بجانے لگیں۔ ہم صحن میں ادھر ادھر چہل قدمی کرتی رہیں۔ ذرا ہی دیر میں سیاہ بدلیاں واقعی کسی اور دیس چلی گئیں۔ اور مطلع صاف ہو گیا۔ یہ دیکھ کر ہم دونوں نند بھاوج خوش ہو گئیں۔ اندھیری رات میں اکّے دُکّے بادل آسمان پر چکر لگا رہے تھے۔ ہم دونوں پلنگ پر صبح کے انتظار میں مسرت آمیز باتیں کرتے ہوئے سو گئیں۔ جوانی کی نیند بھی عجیب ہوتی ہے۔ ہم بالکل غافل ہو گئیں۔ اچانک ایک بدلی نے چند موٹی موٹی بوندیں چھوڑیں۔ ہم دیوانہ وار اُٹھ بیٹھیں اور آسمان کی طرف دیکھا۔ اب بارش کے آثار پھر نمودار تھے۔ زہرا نے پلنگ سرکا کر برآمدے میں کر لیا۔ پھر بوندا باندی ختم ہو کر مہتاب جلوہ فگن ہو گیا کبھی بادل چکر لگاتے اور کبھی پہاڑوں کی آڑ میں چھپ جاتے۔ ہماری ایک ملازمہ بھی نوعمر تھی۔ اسکو دریا کی سیر کا بہت شوق تھا۔ وہ دعا کرنے لگی "یا الہٰی آج بارش نہ ہو۔ بی بی جی اب پھر وہ راگنی شروع کر دیں جس نے پہلے مطلع صاف کیا تھا۔ اسی منی

مذاق میں صبح کے چار بج گئے۔ ہم سب نے اُٹھ کر وضو کیا۔ نماز پڑھی۔ نادرہ بیگم
صاحبہ نے کچھ اپنا وظیفہ کیا۔ اسی سلسلہ میں پانچ کا وقت ہو گیا۔ اب ہم نے
شور مچایا۔ بیسیوں عورتیں جمع ہو گئیں۔ ہم نے اپنا سامان خادماؤں کو دیا۔
وہ پہلے چلی گئیں۔ اور ہم تمام راستے میں عجیب عجیب شغل کرتی ہوئیں
پہاڑوں کی گھاٹیوں میں سے اُترتیں۔ اور کہیں چڑھائی پر ایک دوسری سے
اٹھکھیلیاں کرتی تھیں۔ صبح کی روشنی میں پہاڑ کا سہانا منظر۔ سبزہ زار اور
بادِ نسیم کے سرد جھونکے روح کو فرحت بخش رہے تھے۔ آفتاب بلند پہاڑ
کے پیچھے اُبھر رہا تھا۔ ہم سب نے ہنستے کھیلتے یہ راستہ طے کیا۔ اور دریا
پر پہنچ گئیں۔ دریا کا پانی انتہائی صفائی کے ساتھ صبح کی روشنی میں موجزن تھا۔
ہم سب پہلے کنارے پر سیر کرتی رہیں۔ موجوں کو دیکھ کر طبیعت خوش ہو رہی
تھی۔ یکایک چند لڑکیوں نے دریا میں کود کر تیرنا شروع کر دیا۔ میں دل میں
خوف زدہ ہو رہی تھی۔ وہ عجب شوخ لڑکیاں تھیں۔ ذرہ بھر بھی اُن کو
خوف نہ تھا۔ ایک دوسری کا ہاتھ پکڑ کر چکر لگاتی تھیں۔ میں کنارے پر کھڑی
تماشا دیکھ رہی تھی۔ ذرا دیر بعد زہرا بیگم نے کہا۔ چلو بھابی جان ہم بھی دریا میں
چلیں۔ مگر میں ڈر رہی تھی۔ اس پر زہرا نے کہا کہ نادرہ بیگم بھی تو ہمارے ساتھ ہونگی
دولہن چلو۔ اب گرمی ہو گئی ہے۔ دھوپ بھی ہے۔ یہ کہہ کر دریا کی طرف بڑھنے
لگی۔ ہم اسی لباس کے ساتھ دریا میں اُتر گئیں۔ پانی بہت ٹھنڈا تھا۔ زہرہ بیگم
چھلانگیں مارتی پھرتی تھی آخر میں بھی اُن کی تقلید کرنے لگی۔ قریب دو گھنٹے پانی
میں چکر لگا کر ہم کنارے پر آ بیٹھیں۔ کبھی کھانا کھاتیں اور کبھی پھل۔ اور پھر

دریا میں کود پڑتیں۔ اب تو میں بھی ہوشیار ہوگئی۔ دریا میں بہت سے شہتیر بہتے ہوئے آرہے تھے۔ ہم نے کچھ شہتیر جمع کرکے کنارے پر ایک تخت سا بنا لیا۔ اس پر ہمارے کھانے کی چیزیں اور کپڑے رکھے ہوئے تھے۔ بہت پرلطف منظر تھا۔ سہ پہر کو ایک ملازم ہماری خبر گیری کے لئے مہرالنسا بیگم نے بھیجا اور کہلا بھیجا کہ جلدی واپس آجائیں۔ دریا کے پانی میں عجیب تاثیر تھی ہم نے بہت کچھ کھایا۔ مگر بھوک باقاعدہ لگے جارہی تھی۔ پانی کی سطح نہایت شفاف تھی۔ ایسا مصفا پانی میں نے پنجاب کے کسی دریا کا نہ دیکھا تھا کنارے پر خشک پتھر اور صاف میدان کے ساتھ ساتھ پانی چاندی کے سمندر کی طرح بہ رہا تھا۔ شام ہونے سے کچھ پہلے ہی ہم دریا سے چل پڑیں۔ سورج غروب ہو رہا تھا پہاڑوں میں شفق کے رنگین منظر اور سنہری شعاعیں مرتعش تھیں۔ آخر دیکھتے دیکھتے سورج جس شان سے نمودار ہوا تھا۔ اسی شان و شوکت سے غروب ہو گیا۔ گھر پہنچنے سے پہلے ہمیں ایک شرارت سوجھی یعنی اماں جان کو کہلا بھیجیں کہ ایک لڑکی ڈوب گئی ہے۔ اور سب روتی ہوئی آرہی ہیں۔ چنانچہ ایک شریر لڑکی نے پریشان صورت بنا کر اماں جان کے پاس جا کر کہدیا۔ وہ پہلے ہی وہمی طبیعت کی تھیں۔ اتنا سنکر ایک ڈنڈا لیکر ہمیں مارنے کو ڈیوڑھی کے دروازے پر آگئیں۔ ہمیں بیحد گالیاں دیں اور اپنی انتہائی ناراضگی کا اظہار کیا۔ سب سے پہلے میں نے ڈیوڑھی میں قدم رکھا۔ اور جلدی سے اماں جان کی کمر میں ہاتھ ڈال کر انہیں کمرے میں لے آئی۔ اور ہنستے ہنستے لپٹ گئی۔ اماں جان بھی میری ہنسی پر مطمئن ہوکر شکایت کرنے لگیں۔ کہ تم نے تو میری

جان پر بنا دی تھی ۔اب یکے بعد دیگرے سب گھر میں آگئیں۔ہم اپنے ہمراہ دریا سے کچھ مچھلیاں بھی لائی تھیں۔وہ ملازمہ پکانے کے لئے لے گئی۔اس کے بعد ہمیں اپنی یہ پُر لطف سیر کئی دن تک یاد آتی رہی۔

زاہدہ بیگم جو زہرا بیگم سے بڑی ہمشیرہ تھی کبھی کبھی ہمارے پاس آتیں اکثر میاں بخت نصر صاحب کے پاس لاہور رہتی تھیں ان کی طبیعت کچھ خراب رہنے لگی تھی۔ لہذا۔لاہور میں ڈاکٹروں کا علاج ہوتا تھا ۔اب وہ بھی قصبہ میں آگئیں ۔یہاں ان کی صحت بہت اچھی ہوگئی۔ وہ زہرا بیگم سے زیادہ حسین اور جوان تھیں۔طبیعت بھولی بھالی تھی۔چند ماہ اسی رونق میں گزرے سب میرے ساتھ مانوس تھیں۔اور میرا دل بھی ان کی صحبت سے بہل گیا تھا۔ ہم عجیب قسم کی شرارتیں اور شغل کیا کرتیں۔کوئی روک ٹوک کرنے والا نہ تھا۔ ابھی میری شادی کو دو برس نہ ہوئے تھے۔کہ زاہدہ بیگم کا ایک جگہ رشتہ تجویز ہوگیا۔میاں بخت نصر صاحب نے والدہ مہرالنسا کو خط لکھا کہ زاہدہ بیگم کا رشتہ امرت سر کے ایک رئیس اعظم جو بڑے خاندانی ہیں۔ اُن کے ہاں ہو گیا ہے۔زاہدہ بیگم کے منگیتر بیرسٹرایٹ لا تھے ۔ زاہدہ کیلئے زیور اور پارچات تو وزیر صاحب کے وقت سے تیار تھے۔اب اور ضروریات خرید کی گئیں۔ موجودہ زمانے کے مطابق بھولی بھالی زاہدہ کو فکر پیدا ہوگیا۔کہ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ شوہر سے مجھ جیسی سادگی پسند کا کس طرح گزر ہوگا۔میرے پاس زاہدہ بیگم کبھی کبھی اپنے خیالات کا اظہار کرتیں۔اب شادی کی تیاری شروع ہوگئی۔ہم سب لاہور آگئے ۔ وہاں ایک کوٹھی میں شادی کے سامان تیار

کئے گئے۔ وقت مقررہ پر برات بڑی شان وشوکت سے آئی۔ وہ لوگ امرتسر کے سرکردہ اور رئیس اعظم تھے۔ زیورات اور پارچات امرتسری فیشن کے مطابق حسب حیثیت لائے۔ زاہدہ سنہری لباس میں شگون باندھے ایک کمرے میں پرانے رسم ورواج کے مطابق دُبکی بیٹھی تھیں۔

شام کو سسرال کا سُرخ جوڑا اور زیورات پہنا کر اُسے دلہن بنا دیا گیا وہ اس پوشاک میں بہت خوبصورت معلوم ہو رہی تھیں۔ اکثر مہمانوں کی آمد ورفت کا انتظام میرے سپرد تھا۔ میں جلدی جلدی کام ختم کر کے زاہدہ کے پاس آکر بیٹھ جاتی۔

دوسری صبح کو زاہدہ کا جہیز دکھایا گیا۔ جو ریاستی فیشن کا تھا بیش قیمت پوشاکیں۔ جواہرات کے مرصع زیورات نقری اور طلائی۔ کشمیر کے ٹی سٹ۔ صوفہ سٹ۔ چاندی کے ظروف۔ علاوہ ازیں لینڈ ڈُن اور پالکی وغیرہ وغیرہ۔ غرض چاروں طرف جہیز کا سامان نہایت خوبصورتی سے سجایا ہوا تھا۔ درمیان میں پانچ ہزار کیش رقم کی پانچ تھیلیاں ایک نقرئی طشت میں رکھی ہوئی تھیں۔ امرتسر والے یہ دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ جہیز کی فوٹو لی گئی۔ اور زاہدہ بیگم کو بھائیوں نے رخصت کیا۔ زاہدہ کے رخصت ہونے کے بعد ہمارے گھر میں ایک اداسی چھا گئی۔ مجھے یہ پہلا موقعہ تھا کہ اتنے بڑے ہنگامہ کا انتظام کرنا پڑا جسے میں نے خوش اسلوبی سے انجام دیا۔

ہم سب زاہدہ بیگم کی شادی سے فارغ ہو کر پھر قصبہ ریاسی میں آگئے۔ اب سفر میں مجھے کچھ تکلیف نہ ہوئی۔ کیونکہ میں پہاڑی سفر کی عادی ہو چکی تھی۔

یہ واقعہ ۱۹۰۱ء کا ہے۔ قصبہ ریاسی میں آتے وقت ریاست جموں میں اندوہناک ماتم کی صدائیں بہت زور شور سے سنائی دینے لگیں۔ میں نے ایک ملازم سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ والیٔ ریاست جموں یعنی مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے چھوٹے بھائی راجہ امر سنگھ صاحب جو تمام ریاست جموں کے انتظام کنندہ تھے اُن کا ریاست کشمیر میں یکایک انتقال ہو گیا ہے اس خبر سے تمام ریاست میں کہرام مچ رہا تھا۔ چاروں طرف رعایا راجہ امر سنگھ کے سوگ میں سیاہ پوش نظر آتی تھی۔ رسالہ کی فوج اُلٹی بندوقیں لئے افسردہ حال قطار باندھے کھڑی تھی۔ اور گلابی محل پر سیاہ پردے پڑے ہوئے تھے۔ رانیاں اور ان کی خواصیں بے چین نظر آ رہی تھیں۔ راجہ امر سنگھ کی بے وقت موت کا ذکر ہر ایک زبان پر تھا۔ راجہ صاحب کا صرف ایک کمسن بچہ تھا۔ لوگ اس کی درازیٔ عمر کے لئے دعائیں مانگ رہے تھے۔

مہاراجہ پرتاپ سنگھ کی حالت جوان اور لائق بھائی کی موت سے بے حد پریشان تھی۔ قبل ازیں ایک چھوٹا بھائی راجہ رام سنگھ بھی انتقال کر چکا تھا۔ جو راجہ امر سنگھ سے چھوٹا تھا ابھی اُنکا صدمہ مہاراجہ والیٔ جموں کے دل پر کچھ کم نہ ہوا تھا کہ اور جگر خراش مصیبت آ گئی۔ مہاراجہ رام سنگھ مرحوم کی ایک بچی اُن کی نشانی تھی۔ اس رنج میں راجہ صاحب نے راجہ رام سنگھ کی یادگار میں ایک محل رام گڑھ کے نام سے تعمیر کیا جس پر بے شمار روپیہ خرچ کیا گیا۔ اس میں ہزاروں سادھو سنت رہا کرتے تھے۔

میں نے اکثر دریائے سوی پر (جو ریاست جموں میں ہے) سیر کو جانے

ہوئے رام گڑھ بھی دیکھا ہوا تھا۔ ایک دن اتفاق سے راجہ امر سنگھ مرحوم کو بھی دیکھا تھا۔ نوجوان، خوبصورت اور ایسا بہادر کوئی کم پیدا ہوگا۔ تمام شکل و شباہت قدرت نے لاثانی بنائی تھی۔ اب اس کی ناگہاں موت سے مہاراجہ پرتاب سنگھ صاحب والیئ ریاست کا جو نہایت غریب نواز طبیعت کے انسان تھے۔ پریشان ہونا بھی لوگوں کیلیئے انتہائی رنج کا باعث تھا۔ اس افسوسناک منظر کو دیکھ کر میرا دل بھی افسردہ ہوگیا۔

کچھ وقت ریاست جموں میں گذار کر ہم قصبہ میں پہنچ گئے حسب دستور وقت گزرتا رہا۔ میاں قمرالزماں ایک دن علی الصبح اپنی والدہ مہرالنسا بیگم کے پاس بیٹھے کچھ گفتگو کر رہے تھے۔ اور میں بھی وہاں انکے پاس ہی آگئی۔ مہرالنسا بیگم نے میری طرف متوجہ ہو کر کہا۔ اس دلہن کا خدا نے قدم مبارک کیا۔ ہمیں ریاست "قید سمانہ" کی حکومت یاد کر رہی ہے۔

مگر میں ماں بیٹے کی گفتگو کا کچھ مطلب نہ سمجھ سکی۔ میاں قمرالزماں نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ اب ریاست پونچھ کی سیر کرو گی؟ میں نے کہا آپ وہاں جا رہے ہیں؟

اُنھوں نے جواب دیا ہاں۔ مہاراجہ بلدیب سنگھ والیئ ریاست پونچھ نے مجھے بلایا ہے۔ فوج کے کمانڈنگ افسر کے عہدہ پر جا رہا ہوں۔ مہرالنسا بیگم کہنے لگیں۔ بیٹا اگرچہ خدا کے فضل سے تمہیں ملازمت کی ضرورت نہیں مگر جب راجہ صاحب نے خود بخود یاد فرمایا ہے تو اب جانا ہی مناسب ہوگا۔ میاں قمرالزماں نے جواب دیا۔ بھائی صاحب نے بھی یہی حکم دیا ہے کہ تم چلے

جاؤ۔ لہذا راجہ صاحب کو ابھی بذریعہ تار اطلاع دیتا ہوں۔ کہ میں آرہا ہوں۔

اماں جان نے کہا۔ جاؤ۔ خیر سے اپنا کام اور فرض ادا کرنے کا فکر کرو۔ میں اپنی خوشدامن صاحبہ کے پاس بیٹھ گئی اور ریاست پونچھ کے گذشتہ حالات سننے لگی۔ انہوں نے کہا۔ دولہن ریاست پونچھ کے مہاراجہ کلاں مہاراجہ موتی سنگھ صاحب وزیر نظام الدین پر از حد مہربان تھے۔ ان کی عنایات سے ہم لاکھ پتی بن گئے۔ جب مہاراجہ موتی سنگھ کے انتقال کے بعد مہاراجہ بلدیب سنگھ تخت نشین ہوئے۔ تو اُنہوں نے وہ تمام مسلمان جو بڑے مہاراجہ کے عہد میں بڑے بڑے عہدوں پر ممتاز تھے سب کو برطرف کرکے ان کی جگہ سب ہندو مقرر کر دئے۔ وزیر نظام الدین صاحب نہایت بردبار دانشمند طبیعت کے انسان تھے۔ انہوں نے باعزت قصبہ ریاسی میں آرام کیا۔ اس وقت وہ کچھ بیمار تھے۔ تھوڑے ہی عرصہ بعد اُن کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی۔ آخر اسی جگہ ہی اُن کا انتقال ہو گیا۔ اُس کے بعد پھر مہاراجہ بلدیب سنگھ نے اب تک یاد نہیں کیا تھا۔ اب تمہارا قدم مبارک ہوا۔ کہ پھر آمد و رفت کا سلسلہ شروع ہونے لگا ہے۔

میاں قمر الزماں صاحب مکمل تیاری کر کے اُسی ہفتہ میں تشریف لے گئے انہیں ریاست پونچھ میں رسالہ کے کمانڈر ان چیف کا عہدہ مل گیا۔ وہاں سے برابر خیریت کے خط آتے جاتے رہے۔

اسی اثنا میں مجھے میاں بخت نصر نے بلایا۔ میں لاہور چلی گئی۔ وہاں سے والدین کے پاس کچھ وقت گذارا۔ جہاں آپا نے دھن کے میاں ذوالفقار علی خاں

اس وقت ضلع گورداسپور میں اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر ہو گئے تھے، مجھے بلا بھیجا۔ کہ تم یہاں آ رہ جاؤ۔ کیونکہ یہ تو پنجاب ہے۔ پہاڑی علاقہ میں تو کسی کو جلدی ملنا بھی مشکل امر محسوس ہُوا کرتا تھا۔ لہذا میں اور زاہدہ بیگم جہاں آرا کو ملنے گئیں۔ وہاں جہاں آرا بیگم کی نند فرخندہ اختر اور ان کے چھوٹے بھائی نواب والا گوہر یعنی کہ میرے پھوپھا صاحب بھی تشریف لائے ہوئے تھے۔ میری اتفاقیہ ملاقات پھوپھی زاد بہن سے ہوئی۔ فرخندہ آپا نے مجھے گلے لگا کر پیار کیا۔ اور ان کا چھوٹا بھائی سردار خاں بھی مجھے ملا۔ جس کی عمر پھوپھی صاحبہ کے انتقال کے وقت چار برس تھی۔ وہ بھی جوان ہو چکا تھا۔ مگر اس کے چہرے سے افسردگی کے آثار نمودار تھے۔ مجھے چھوٹے بھائی سردار کو دیکھ کر رنج پیدا ہُوا۔ میں ایک بے اختیار آہ بھر کر خاموش ہو گئی۔ مگر آپا فرخندہ نے آنکھوں میں آنسو بھر لئے۔ اور سردار خاں کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا۔ تم ان کو پہچانتے ہو۔ یہ ہماری ماموں زاد بہن ہے۔ انکا نام وزیر سلطان ہے۔ سردار خاں نے حسرت کی نگاہ سے کہا۔ جی ہاں کچھ پہچانتا ہوں۔ مگر اچھی طرح یاد نہیں۔

رات کو ہم دونوں کے سونے کا ایک ہی کمرہ تھا۔ آپا فرخندہ میرے ساتھ دیر تک باتیں کرتی رہیں۔ اُنہوں نے کہا اگرچہ تم اپنے گھر میں آباد و خوش ہو۔ مگر میرا دل تو اُس وقت خوش ہوتا۔ اگر تم میری بھاوجہ بنتیں۔ خدا جانے ماموں صاحب کو کیا ہو گیا تھا۔ کہ میری ہر ایک آرزو کا خون کر دیا۔ میں نے ان کی باتوں سے دُکھ محسوس کرتے ہوئے کہا۔ آپا جان! قسمت میں جہاں کا دانہ پانی ازل سے لکھا تھا وہ ہو کر رہا۔ اس میں انسان کیا کر سکتا ہے؟ آپا فرخندہ نے پھر آنکھوں میں

آنسو بھر کر کہا۔ اگر والدہ صاحبہ زندہ سلامت ہوتیں۔ تو پھر ماموں صاحب ایسی طوطا چشمی سے مجھے جواب نہ دیتے۔ خیر اب صبر ہی بہتر ہے۔ پچھتانا بالکل بے فائدہ ہے۔ اسی طرح ہم دونو بہنیں باتیں کرتے کرتے سو گئیں۔

صبح ہوئی۔ ہم دونو اُٹھیں۔ نماز پڑھی۔ جب ناشتہ ہو چکا۔ تو آپا فرخندہ نے مجھے پکارا۔ ادھر آؤ۔ میں وہاں گئی۔ تو مجھے اشارہ سے کہا اندر جا کر سلام کرو۔ مَیں نے کمرے کے اندر قدم رکھا۔ تو وہاں میرے چچا صاحب میاں تاج محمدؐ ایک صوفہ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ میری نظر اُن پر پڑی تو میں نے ادب سے سلام کیا۔ انہوں نے دستِ شفقت بڑھا کر پیار دیا اور بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اتنے میں میرے پھوپھا صاحب برآمدہ سے کمرے میں تشریف لے آئے۔ میں نے ان کو بھی آداب کیا۔ انہوں نے مجھے محبّت سے بٹھایا اور خیریت دریافت کی۔ چند منٹ کے بعد میں اجازت لیکر جہاں آپا کے پاس آگئی۔ میرے دل میں چچا اور پھوپھا کو دیکھکر کچھ عجیب قسم کی کشمکش ہو رہی تھی۔ جسکو میں خود بھی سمجھ نہ سکتی تھی۔

جہاں آپا نے پوچھا چچا اور پھوپھا سے کیا کیا باتیں ہوئیں۔ میں نے جواب دیا یوں ہی معمولی خیریت دریافت کی تھی۔ چچا صاحب نے مجھے ایک پونڈ دیا تھا۔ یہ کہکر جہاں آپا کو پونڈ دکھایا وہ ہنس پڑیں اور کہا پھوپھا صاحب نے کچھ نہیں دیا؟ میں نے خاموشی اور مسکراہٹ سے ٹالدیا۔ جہاں آپا نے کہا۔ نواب صاحب تو تمہارے والدین سے ناراض ہیں۔ کہ تمہارا رشتہ ہمارے ہاں کیوں نہیں کیا۔ خیر ایسی ہی گذشتہ پیوستہ کی گفتگو ہوتی رہی۔ کچھ قیام کے بعد جب ہم آپا

سے رخصت ہوئے تو سٹیشن تک نواب والا گوہر کے دونوں بیٹے سردار خاں
اور عزت حیات خاں ہمیں چھوڑنے آئے۔ زاہدہ بیگم اور میں ریل میں سوار ہوگئیں
میں وہاں سے ہی قصبہ ریاسی کو روانہ ہوئی۔ کیونکہ میاں قمرالزماں صاحب ریاست
پونچھ سے تشریف لائے ہوئے تھے۔ اور ریاست پونچھ میں جانے کا مشورہ ہو
رہا تھا۔ میرے پہنچتے ہی مجھے ریاست کے سفر کی تیاری کا حکم ملا۔ ایک دن میاں
قمرالزماں نے ماں سے کہا۔ آپ بھی میرے ساتھ چلیں۔ انہوں نے کہا۔ میرا جانا
تو مشکل ہے۔ البتہ نادرہ بیگم کو ساتھ لے جاؤ۔ نادرہ بیگم کے والدین اور رشتہ دار
بھی ریاست پونچھ میں ہیں۔ اُن سے ملنا بھی ہو جائیگا۔ آخر کار یہی فیصلہ ہُوا میں
اور میری خوشدامن نادرہ بیگم صاحبہ اور چند خدمتگاریں تیار ہوگئیں۔ سننے میں
آتا تھا کہ یہ راستہ بھی منزل بمنزل پیدل یا گھوڑے خچر وں کا ہے۔ ریاست جموں
سے تو قصبہ ریاسی تک دو ہی منزلیں طے کرنی پڑتی تھیں۔ مگر اب ریاسی سے پونچھ
تک چھ منزلوں کا سفر نظر آ رہا تھا۔ جب پالکیاں کہار دروازے پر لے آئے اور
تیاری ہوگئی۔ تو اچانک ایک تار ملا۔ قمرالزماں صاحب نے میری طرف افسردہ
سی نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ وزیر سلطان! تمہارے پھوپھا صاحب نواب والا گوہر
کا انتقال ہوگیا ہے۔ یہ سنکر مہرالنسا بیگم افسوس سے بیٹھ گئیں۔ کیونکہ وہ
ان کے سمدھی تھے۔ ہمارا جانا تو اب رک نہیں سکتا تھا۔ مگر خوشدامن صاحبہ
مہرالنسا بیگم نے نواب والا گوہر کی ماتم پرسی کے لئے جس مقام پر اُن کا انتقال
ہُوا تھا جانے کی تیاری کرلی۔ ہم اس پریشانی میں قصبہ ریاسی سے روانہ ہوئے
پہلی منزل دریائے چناب میں کشتی سے طے کرنی تھی۔ مجھے کشتی کا نام سنکر

خوف پیدا ہو رہا تھا۔ بڑی بڑی کشتیاں کنارے پر تیار تھیں۔ ایک میں ہمارے
ملازم خچر اور گھوڑے سوار ہو گئے اور دوسری میں ہماری پالکیاں و کہار تھے۔
خدا خدا کر کے کنارے پر لگے۔ چند منٹ میں دوسرا چکر لگایا۔ غرض کہ ہمارے
سفر میں کئی بار کشتیوں سے آر پار جانے کا سلسلہ جاری رہا۔ شب کو دوسرے کنارے
پر آرام کر کے ہم منزل بہ منزل روانہ ہوئے۔ چند منزلیں طے کرنے کے بعد ریاست
پونچھ کے حسین مناظر اور پہاڑوں کی چوٹیاں نظر آنے لگیں۔ ایک باغیچہ آیا جس
میں کئی قسم کے میوہ دار درخت مثلاً آم۔ آلوچہ۔ خوبانی۔ بادام وغیرہ وغیرہ تھے۔ ہم سب
نے خوب پھل کھائے۔ اور دوپہر کو وہیں آرام کیا ظہر کی نماز کے بعد آگے
روانہ ہوئے۔ اس منزل میں مہاراجہ صاحب کے کئی ملازم ہمارے استقبال
کے لئے آ گئے۔ اُن کے ساتھ ہمارے لئے کھانے کا سامان تھا۔ ہم سب نے
چائے باقر خانیاں اور بریاں مرغ و انڈے وغیرہ کھائے۔ جب ہم ریاست
پونچھ میں پہنچے تو نادرہ بیگم نے مجھے پھر ویسے ہی زیور کپڑوں سے آراستہ کیا۔ میں
حیران تھی۔ کہ اب پھر نئے سرے سے دولہن بننے کا تقاضا کیوں ہے۔ نادرہ بیگم
نے کہا۔ دُولہن اب تمہیں ریاست کی عورتیں دیکھنے آئیں گی بلکہ روزانہ آیا کریں گی۔
اب پھر تمہیں چند دن دلہن بننا پڑے گا۔ ریاسی تو معمولی چھوٹی سی جگہ تھی۔
جہاں ہمارے مقابلہ کا کوئی نہ تھا۔ یہاں تو بہت سے مسلمان امرا تمہارے
خسر میاں نظام الدین کے وقت کے ہیں۔ اور دیر کے بعد ہم پھر یہاں آئے
ہیں۔ لہذا سب لوگ ہمیں تعجب کی نظروں سے دیکھیں گے۔ بہت سے دشمن
یہاں پر موجود ہیں۔ اس لئے ہر ایک بات میں احتیاط کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے

میں یہ تقریر سنکر خاموش ہوگئی - اور جس طرح کہا حکم کی تعمیل کرتی گئی - اب ہم اپنے مکان میں آپہنچے -

یہاں ایک کھلا صحن تھا - پالکیاں وہاں رکھی گئیں - بہت سی عورتیں جن میں کچھ تو میرے سسرال والوں کی رشتہ دار اور کچھ محلہ کی تھیں مجھے بڑی محبت اور تپاک سے اندر لے گئیں - اور سب نے رونمائی کے روپے دئے - چونکہ نادرہ بیگم کے والدین کا شہر تھا - لہذا ان کی بھاوجہ، بھائی اور بہنیں سب جمع ہوگئیں - بہت سی خواتین نادرہ بیگم کے گلے مل مل کر روتی تھیں - آخر یہ سلسلہ ختم کرکے کھانا کھایا - جو نادرا بیگم صاحبہ کے بھائی صاحب میاں نادر خاں صاحب کے گھر سے آیا ہوا تھا - شب کو آرام کرکے صبح اُٹھتے ہی نادرا بیگم نے مجھے مکان دکھانا شروع کیا - یہ مکان ریاسی کے مکان سے بھی بدرجہا وسیع تھا - اوپر کی چھت وزیر صاحب مرحوم کے بیٹھنے کی جڑاؤں تھی جس کے درمیان بڑے بڑے جھاڑ لٹکتے تھے - غرض بہت خوبصورت مکان تھا - دیوان خانہ خاص طور پر خوبی سے تعمیر کیا ہوا تھا - سفیدی نہایت اعلیٰ طریق پر کرائی گئی تھی جب اس پر روشنی پڑتی تو شیشہ کی مانند دیواریں چمکتی تھیں - ہر روز نئے نئے فیشن کی عورتیں دیکھنے میں آتیں - مجھے کئی دن تک دلہن بن کر بیٹھنا پڑا - خیر چند دن گذرنے پر یہ قصہ ختم ہوگیا - اور میرے والدین کی خیر و عافیت کا خط بھی آگیا - مگر میں نے ایک خط جو پھوپھا صاحب کی وفات پر اظہارِ افسوس کے لئے لکھا تھا - اس کے جواب میں آپا فرخندہ اختر نے مجھ پر بے حد شکوہ کیا ہوا تھا " کہ تم اس قدر سنگدل ہوگئی ہو - پھوپھا کی ماتم پرسی کو بھی میرے پاس نہ پہنچ سکیں " میں

اِن لفظوں پر آنسو بھر کر بے اختیار سی ہوگئی۔ نادرا بیگم نے پوچھا - کیا لکھا ہے؟ میں نے خط سنایا تو بھی آہ بھر کر فرمانے لگیں :-

" آخر تمہارا خون ہے ۔گلہ شکوہ کیوں نہ کرتی ۔تم اس کی تلافی لکھ دینا "

ایک عورت پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ اُس نے نادرا بیگم سے مخاطب ہو کر پوچھا یہ کیا معاملہ ہے؟ نادرا بیگم نے جواب دیا ۔کہ دلھن کے پھوپھا صاحب نواب دلا گوہر جو ہماری لڑکی کے خسر ہیں ۔ انکی موت کی خبر ہمیں اس وقت پہنچی ۔جبکہ ہم یہاں آنے کیلئے بالکل تیار تھے ۔ دلھن نے اپنی پھوپھی زاد بہن کو تعزیت کا خط لکھا تھا آج اس کا جواب آیا ہے ۔کہ تم خود کیوں نہیں آئیں "

اس عورت نے کہا۔ اچھا یہ دلھن جہاں آرا بیگم کی نند ہے ؟ نادرہ بیگم نے کہا ۔ہاں ۔ اس نے کہا یہ خوب رشتہ ہُوا ۔تمہاری بیٹی اُن کے ہاں ۔ اور انکی کی بیٹی تمہارے ۔ اتنی گفتگو کے بعد وہ عورت چلی گئی۔ اور نادرا بیگم صاحبہ نے مجھے ادھر ادھر کی باتوں میں بہلا لیا ۔

ریاست پونچھ ایک چھوٹی سی پُرفضا جگہ تھی ۔جس جگہ مہاراجہ قیام فرما ہوں وہ جگہ ضرور ہی بارونق ہونی چاہیئے ۔ ہر وقت چہل پہل ۔ گانے بجانے کے شغل رہتے ۔مہاراجہ بلدیب سنگھ شکار کے بہت شوقین تھے ۔ آئے دن پہاڑیوں پر چڑھائی اور شکار کی تیاری کے لئے شور مچا رہتا ۔

ایک دن کھانے سے فارغ ہو کر میاں قمر الزماں صاحب نے کہا ۔ کہ اپنی والدہ صاحبہ سے کہو کہ آپکے لئے قلعہ میں رانی صاحبہ کے سلام کو جانا ضروری ہے ۔ وقت مقرر کرو ۔تو ان کو اطلاع کردیں ۔

غرض کہ وقت مقرر ہؤا۔ اور مجھے پھر دلہن بنا کر نادرہ بیگم صاحبہ تیار ہوگئیں۔ سواری آگئی۔ ہمارے ساتھ چند خدمتگاریں تھیں جب ہم قلعہ کے پھاٹک پہ پہنچے تو سواری ٹھہرائی گئی۔ ہمارا نام پوچھا گیا۔ ملازمہ نے بتایا۔ کہ وزیر نظام الدین صاحب مرحوم کے گھر سے خواتین آئی ہیں۔ اسی طرح دوسرے پھاٹک پر پہنچے۔ تو وہاں کے دربان بندوق لئے کھڑے تھے۔ انہوں نے دریافت کیا۔ پھر آگے بڑھے۔ تو تیسرے پھاٹک پر بھی دربان ہمیں دیکھ کر کھڑے ہوگئے اور دریافت کیا۔ آخر کئی پھاٹک اور ڈیوڑھیاں طے کرتے ہوئے ہم خاص دروازے پر پہنچے۔ وہ دروازہ بہت خوفناک تھا۔ دروازے میں نوک دار میخیں انگنت حساب سے لگی ہوئی تھیں۔ تاکہ کوئی دروازے پر ہاتھ بھی نہ رکھ سکے۔ دربان اور سنتری مسلح پہرہ دے رہے تھے۔ یہاں ایک ضعیف العمر آدمی آیا۔ اُس نے ہماری ملازمہ کو آگے آنے کا اشارہ کیا۔ اب ہم ایک بڑے کمرے میں داخل ہوئیں۔ تو وہاں ایک دروازے پر بنات کا سبز پردہ پڑا ہؤا تھا۔ پردے کے پاس ایک گھنٹی لگی ہوئی تھی۔ اس ضعیف آدمی نے گھنٹی بجائی۔ تو پردہ اُٹھا۔ ایک نوجوان خوبصورت کرمچی رنگ کی پگڑی اور بڑی قیمتی سرج کا فراک کوٹ جیبیں گھڑی کے ساتھ سونے کی چمکتی ہوئی چین جیب میں لگی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ ہاتھوں میں بیش قیمت انگوٹھیاں سفید لٹھے کا تنگ پاجامہ پہنے ہوئے دروازے پر آیا۔ میں برقعہ پہنے کھڑی تھی۔ اور خوشدامن صاحبہ نے برقعہ کا نقاب اُٹھا رکھا تھا۔ اس نوجوان نے نادرہ بیگم کو دیکھتے ہی مؤدبانہ سلام کیا۔ میں حیران تھی۔ کہ

یا الٰہی یہ کیا ماجرا ہے۔ میں نے اس نوجوان کو مہاراج ہی سمجھ لیا تھا۔ اس نے خوشدامن صاحبہ کو سلام کیا۔ مگر وہ ایسے اعلیٰ لباس میں ننگے پاؤں تھا۔ اس نوجوان نے اشارہ کیا۔ کہ میرے ساتھ آیئے۔ اور آپ پیچھے پیچھے ادب سے چلتا رہا۔ چند قدم چل کر ٹھہر جاتا غرض یہ چال بھی اس نوجوان کی مودبانہ تھی۔ اب ایک صحن آیا۔ وہاں پر ایک ملازمہ نہایت خوش شکل موتیا رنگ کا لباس پہنے ہاتھ میں گلدستہ لیئے کھڑی تھی۔ اس نے ہمیں بڑھکر سلام کیا۔ اور ساتھ لیکر آگے بڑھی۔ ایک دروازے پر جہاں دو عورتیں کھڑی تھیں۔ انہوں نے پردہ اُٹھایا۔ اور ہم داخل ہوگئیں۔ کمرے کے عین وسط میں مسند پر دو پری چہرہ مہارانیاں بیٹھی تھیں۔ نادرہ بیگم نے مجھے سلام کے لئے کہا جس طرح مجھے شاہی سلام سکھایا تھا۔ میں نے سلام کیا۔ اور ایک سرخ ریشم کے رومال میں چند پونڈ ان کی نذر کیئے۔ ہر دو رانی صاحبان نے ہنسکر رومال پر ہاتھ رکھدیا۔ اور کہا دلہن اٹھا لو۔ نذر منظور ہوگئی۔ میں آنکھیں نیچے کیئے بیٹھی تھی۔ مہارانیاں مجھے بہت خوبصورت معلوم ہوتی تھیں۔ میں کبھی کبھی دزدیدہ نگاہوں سے دیکھ لیتی تھی۔ رانی صاحبہ کے پاس کچھ خواصیں اور وزیرزادیاں بیٹھی تھیں۔ انہوں نے میری خوشدامن صاحبہ سے خیریت دریافت کی۔ اور مزید حالات بھی پوچھے۔

میری بابت دریافت کیا۔ کہ یہ دلہن ہندوستان کی ہے یا پنجاب کی ؟ تو نادرہ بیگم نے عرض کیا۔ پنجاب کی ہے اس کے والدین بھی ریاست کے باشندے ہیں۔ دولہن کے دادا صاحب ریاست کپورتھلہ کے وزیراعظم

تھے۔ جن کا اسم گرامی غلام جیلانی تھا۔
رانی صاحبہ"۔ آپ کو اچھا رشتہ مل گیا ہے "۔
نادرہ بیگم"۔ آپ کی مہربانی سے اِس بہو کا قدم مبارک ہُوا۔ کہ آپ نے ہمیں یاد فرمایا۔"
رانی صاحبہ خفیف سی ہنسی ہنسکر خاموش ہوگئیں
وزیر فی صاحبہ"۔ آپ یہاں ہی تشریف رکھیں۔ اب میاں قمرالزماں افسر رسالہ ہو گئے ہیں۔ اور بھی سب کام ٹھیک ہوجائیں گے"۔
نادرہ بیگم"۔ بہت بہتر"۔
اسی گفتگو میں چند گھنٹے گزر گئے۔ ہم نے اجازت لی۔ تو ایک ملازمہ مہارانی صاحبہ کی طرف سے ایک مجمع میں ریشمی پوشاک اس پر سونے کا جھومر رکھ کر لائی۔ نادرہ بیگم کی طرف اشارہ کرکے کہا۔ یہ دولہن کے لیئے رانی صاحبہ نے عنایت فرمایا ہے۔ نادرہ بیگم نے شکریہ ادا کرتے ہوئے اٹھا لیا۔ اب ہم دوسری رانی صاحبہ کے پاس گئیں۔ وہ رانی صاحبہ سب سے بڑی تھی۔ جو ہشت پشت سے ننہال دادیال راجہ کی پوتی اور راجہ کی نواسی تھی۔ مگر بخت یاور نہ تھا۔ یہ رانی صاحبہ بے اولاد تھیں۔ مگر اُن کا کمرہ نہایت بیش بہا قیمتی سامان سے آراستہ تھا۔ میں حسب دستور سلام کرکے اپنی دزدیدہ نظروں سے دیکھتی رہی۔ خوشدامن صاحبہ سے اُن کی باتیں ہورہی تھیں۔ رخصت پر انہوں نے بھی ایک پوشاک اور سونے کا جھومر عنایت کیا۔ اور انکی خدمتگاروں نے بھی کچھ روپے دئے۔

اب ہم اسی طرح سے سات پھاٹک اور ڈیوڑھیاں طے کرتی ہوئیں آخری پھاٹک پر پہنچیں۔ وہ نوجوان جو پہلے جاتے وقت ساتھ تھا۔ اس نے ایک کمرے میں جا کر ہماری آمد و رفت اور نمبر درج کروایا۔ اور ہمارے سوار ہونے تک ساتھ رہا۔ میں ان تمام باتوں کو حیرانگی سے دیکھ رہی تھی۔ جب وہ چلا گیا۔ تو میں نے خورشید امن صاحبہ سے پوچھا۔ کہ انہوں نے ہمارا نام اور نمبر کیوں درج کیا ہے؟

نادرہ بیگم (ہنس کر) "یہ ایک قانونی ضابطہ ہے۔ افسروں کی آمد و رفت باقاعدہ رجسٹروں میں درج کی جاتی ہے۔ تاکہ اُن کی نقل و حرکت کی مکمل اطلاع رہے۔"

میں۔ اچھا وہ نوجوان کون تھا؟

نادرہ بیگم۔ وہ اُن کا خواجہ سرا تھا۔ جو اکثر مہارانیوں کے پاس راجہ صاحب کے پیغام لے باہر سے اندر آیا کرتا ہے۔

میں۔ راجہ صاحب کا کوئی لڑکا نہیں؟

نادرہ بیگم۔ "سات رانیاں ہیں۔ جن میں سے صرف ایک کے ایک لڑکی دو برس کی ہے۔ اب اُسی رانی کو امید داری ہے۔ جس کے پاس ہم پہلے سلام کو گئی تھیں۔ آج کل وہ ہی مہاراجہ صاحب کی منظورِ نظر ہیں۔"

میں۔ "اچھا جو دوسری رانی صاحبہ بڑے ٹھاٹھ سے بیٹھی تھیں۔ ان کے کوئی بچہ نہیں؟"

نادرہ بیگم۔ "اُس کے ایک لڑکی ہو کر گذر گئی ہے۔"

میں "قلعہ میں جانا بھی ایک مشکل امر ہے؟"
نادرہ بیگم۔ "بیشک جہاں مہاراجہ صاحب۔ رانیاں اور خزانہ وغیرہ ہوتا ہے۔ وہاں کی حفاظت ضروری ہے"
میں "آپ ہمیشہ جایا کرتی تھیں؟"
نادرہ بیگم "ہاں ہمیشہ ہر موقعہ پر"
میں "اب پھر کب جائیں گی؟"
نادرہ بیگم "تمہارا دل چاہتا ہے؟"
میں۔ "ویسے ہی پوچھتی ہوں"
نادرہ بیگم "خدا کرے رانی صاحبہ کے بچہ پیدا ہو۔ تو پھر خوشی ہو گی۔ دیکھنا کیا کیا شغل ہونگے"

اب جوں جوں مہارانی صاحبہ کے بچہ پیدا ہونے کا وقت قریب آتا گیا۔ لوگوں میں خوشیاں ہو رہی تھیں۔ بہت لوگ دعائیں کرتے کہ خدا لڑکا دے تو کئی غریبوں کا بھلا ہو جائے۔ ہر درجہ کے لوگ خوشی کے منتظر ہو رہے تھے۔ جگہ جگہ سے لیڈی ڈاکٹر اور دائیاں پہنچ گئی تھیں۔ خدا خدا کر کے بیشمار لوگوں کی دعائیں مستجاب ہوئیں۔ ایک شب جبکہ میں اپنے بالا خانہ کی تیسری چھت پر سو رہی تھی۔ اسی بالا خانہ کے عقب میں مہاراجہ کا جیل خانہ تھا۔ قیدی لوگ رہا ہونے لگے۔ میں نیند میں تھی۔ کہ نیچے قیدیوں کے شور کی آواز آئی۔ میں ہراساں ہو کر اٹھی اور بالا خانہ کی کھڑکی سے جیل خانہ کی طرف دیکھنے لگی۔ قیدیوں نے یکدم غلغلہ بلند کیا۔

"مہاراج کی جے"۔ خدا ٹکا صاحب کی عمر بڑی کرے!"

میرے وہم میں بھی یہ بات نہ تھی۔ کہ بچّہ پیدا ہوتے ہی قیدی رہا کر دئے جائیں گے۔ میں کھڑکی میں حیران کھڑی تھی۔ آخر میں نے میاں قمرالزماں سے دریافت کیا۔

" قیدی رہا ہو رہے ہیں۔ یہ کیا ماجرا ہے؟"

میاں قمرالزماں"۔ رانی صاحبہ کو دردِ زِہ شروع ہوگا!"

میں۔" اچھا! اسی لئے قیدی رہا ہوتے ہیں؟"

میاں قمرالزماں۔ قیدیوں کی درخواستیں رانی صاحبہ کے پاس پیشتر پہنچا دی جاتی ہیں۔ جب درد شروع ہوتا ہے تو اس تکلیف میں رانی صاحبہ مہاراجہ صاحب کے پاس درخواست کرتی ہیں۔ کہ فلاں قیدی کو رہا کرو۔ تب مجھے آسانی ہوگی"

غرض کہ میں یہ شغل دیکھتی رہی۔ ایک بجے شب سے تین بجے تک ۲۵ قیدی رہا ہوئے۔ آخر ہم چار بجے تک اس منظر سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ اتنے میں توپ خانہ سے روشنی دکھائی دی۔ پھر توپ کی آواز آئی۔ یہ لڑکے کی پیدائش کا اعلان تھا۔

اب تو لوگوں کی خوشی کی انتہا نہ تھی۔ چاروں طرف ہجوم در ہجوم بے شمار لوگ مسرت سے پھرتے نظر آتے تھے۔ دربار میں نوبت خانے بجنے لگے۔ مہاراجہ بلدیب سنگھ دربار میں بیٹھ کر تمام اہلکاروں میں خوشیاں منانے لگے۔ قلعہ کا دروازہ کھول دیا گیا۔ اور عوام کو اندر جانے کی اجازت مل گئی

ہر امیر غریب عورت رانی صاحبہ کو مبارک باد دینے جا رہی تھی۔ ہم بھی خوب زیور کپڑے پہن کر قلعہ میں پہنچے۔ بڑے صحن میں چاروں طرف درجہ بدرجہ فرش بچھے ہوئے تھے۔ سب مہارانیاں، وزیر زادیاں سامنے مسندوں پر بیٹھی تھیں۔ اور بہت سی مین و ماہ جبیں خدمتگاریں تعمیل ارشاد کے لئے استادہ تھیں۔

میراسنیں نہایت شوخ اور رنگین لباس میں ناچتی اور گاتی بجاتی تھیں۔ ہم بھی اس مجمع پرستان میں پہنچکر ایک طرف ادب سے بیٹھ گئیں۔ اتنے میں سب عورتیں کھڑی ہو گئیں۔ سامنے کی طرف سے مہارانی صاحبہ ایک زرق برق لباس میں سراپا خوبصورتی کا مجسمہ حسن کی دیوی بنکر خاموشی سے آہستہ آہستہ قدم رکھتی ہوئی نمودار ہوئیں۔ ان کے ساتھ خواصیں بھی بہت خوبصورت اور رنگین لباس میں ملبوس تھیں۔ کسی کے ہاتھ چاندی کی چوری۔ کسی کے پاس خوشبو کا عطردان۔ کسی کے ہاتھ میں ریشمی رومال۔ مہارانی کو چوری کرتی ہوئی لا رہی تھیں۔ تمام عورتیں نے مہارانی صاحبہ کی تعظیم کی۔ جونہی مہارانی صاحبہ نے فرشِ مخمل پر قدم رکھا۔ مراسنوں نے ایسی دعائیں دیکر کلیاں کرنا شروع کیا۔ کہ مہارانی کے تمام اگلے پچھلے رشتہ دار شمار کر ڈالے۔ چاروں طرف سے مبارک بادی کا ڈنکا بجنے لگا۔ اب مہارانی صاحبہ نے مراسنوں کو ایک پونڈ بطور بیل عطا کیا۔ اس پر مراسنوں نے اور بھی شور مچایا۔ پھر سب اہلکاروں کی بیگمات مسلمان اور ہندو دیوان صاحبان کی خواتین نے بھی مراسنوں کو روپے دئے۔ چند منٹ میں قریباً دو سو روپیہ مراسنوں کو مل گیا۔ شادیانہ شروع ہوا۔ پھر سب کو مٹھائی دی گئی۔ اور نقال عورتیں مضحکہ خیز باتوں سے

محفل کو خوش کرتی ہیں تمام دن یہ جشن ہوتا رہا اس بے اندازہ خوشی میں سب خورد و کلاں مسرور ہوکر دعائیں دے رہے تھے۔ کہ خدا مہاراجہ کو ہمیشہ راحت نصیب کرے۔ آخر شام کو سب لوگ گھروں کو واپس چلے گئے قلعہ بند ہوا۔ پھر سے حسب دستور قائم ہو گئے۔ میں اس محفل میں دو ماہ تک لگاتار جاتی رہی۔ کبھی کسی اہل کار کے گھر میں ٹیکہ صاحب کے تولد کی خوشی میں کبھی کسی دیوان کے گھر میں محفل پر ہر روز نئے نئے راگ اور باجے سننے جاتے تھے۔ ہمارے گھر سے بھی ٹکا صاحب اور مہارانی صاحبہ کے واسطے کچھ زیورا در پوشاک خاص طور پر تحفہ دیے گئے۔ انہوں نے خوشی سے قبول کئے۔ اس عرصہ میں میاں بخت نصر صاحب کا خط آیا۔ کہ ہمشیرہ عزیزہ زہرا سلطان کی شادی کی تیاری ہو رہی ہے۔ بہتر ہے مہاراجہ صاحب سے دو ماہ کی چھٹی لیکر سب کے ساتھ لاہور آجاؤ۔ میاں قمر الزماں نے رخصت لینے کی درخواست کی منظور ہونے پر ہم سب پونچھ سے لاہور روانہ ہوئے۔

میں اپنے والدین کی ملاقات کی خوشی میں پھولی نہ سماتی تھی۔ کیونکہ دور دراز کی رہائش کی وجہ سے مجھے اُن سے ملے ہوئے ایک برس گذر گیا تھا میں والدین کی جدائی میں اکثر پریشان رہا کرتی تھی۔ لاہور پہنچتے ہی میرے والدین زہرا بیگم کی شادی پر بلائے گئے۔ میں نے والدین سے آنکھیں روشن کیں۔ میرے والدین بھی نہایت بیقرار تھے۔ خدا نے جدائی کے ایام کو برطرف کر کے شادمانی دکھائی۔ دوسری خوشی کی بات یہ تھی۔ کہ عزیزہ زہرا بیگم کی شادی نواب والا گوہر کے بیٹے دانیال سے ہوئی تھی جو میرا پھوپھی زاد بھائی تھا۔

یہ بھی میرے لئے خوشی کا باعث ہوا۔ شادی پر سب کنبہ کے لوگ بلائے گئے لاہور کے رئیس لوگوں کی بیویاں آئیں۔ میرے دل میں اس شادی کی تیاری پر اپنی پھوپھی صاحبہ مرحومہ فرخ تاج کی یاد بھی تازہ ہو رہی تھی۔ پھوپھیا صاحب نواب والا گوہر کا انتقال ہو چکا تھا۔ اب اس شادی کی خوشی منانے والی فقط ایک آپا فرخندہ اختر تھی۔ لہذا امرت سر سے خواجہ محمد شاہ صاحب کا تمام کنبہ جو کہ زاہدہ بیگم کے سسرال والے تھے۔ جمع ہو گیا۔ زاہدہ بیگم کی گود میں ایک چھوٹا بچہ حامد صادق تھا۔ اور دوسری طرف سے میاں بخت نصیر صاحب کے سسرال والے بھی امرت سر کے رئیس یعنی سوداگر خیرالدین صاحب مرحوم کی بہو بیٹیاں سب آئی ہوئی تھیں۔ میرے اور بیگم صاحبہ بخت نصر اور اختر النسا کے ہاتھوں میں تمام انتظام تھا۔ جس طرح ہو سکا میں نے اپنی ہمت اور اختر النسا بیگم نے اپنی لیاقت سے سب کام انجام دئے۔ جب برات آئی تو میں نے دیکھا کہ دلہا میاں چھوٹے منے جھا مٹے سنہری لباس میں آرہے ہیں۔ بھائی کو دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی۔ میں نے واپس آکر زہرا بیگم سے مذاق کرنا شروع کیا۔

میں:۔ "زہرہ بیگم۔ اب میں تمہاری نند ہوں۔"

زہرا بیگم:۔ "شکر کرو۔ کہ یہ فخر حاصل ہوا۔"

میں:۔ "کیوں نہیں؟ اگر کسی اور جگہ تمہاری شادی ہوتی تو مجھے کیا مطلب تھا؟ مگر اب تو واقعی فخر ہے۔"

زہرا بیگم۔ (بے تکلفی سے) بھابی جان آپا فرخندہ اختر آپ سے کتنے برس بڑی ہونگی؟

ہیں"۔ شاید دو ڈھائی برس"۔

زہرا کا مطلب دانیال خاں کی عمر دریافت کرنا تھا۔ میں نے کہا دانیال مجھ سے دو ڈیڑھ برس چھوٹے ہیں۔ ممکن ہے تمہاری عمر دانیال سے ایک برس بڑی ہو۔

زہرا۔ (ہنس کر) اپنے بھائی کو تو آپ بالکل نادان ہی بنائیگا"۔

اس وقت ہمیں مہمان نوازی کا بے حد کام تھا۔ رات، دن اسی مصروفیت میں گذر گیا۔ آخر زہرا کی روانگی کا وقت آگیا۔ جہیز کی اشیاء جو کچھ زاہدہ بیگم کے لئے بنائی گئی تھیں وہی چیزیں زہرہ بیگم کے لیے تھیں۔ سب مہمان جمع ہوگئے۔ جہاں آرا بیگم صاحبہ اپنے دیور کے ساتھ برات میں آئی ہوئی تھیں۔ مراسنوں نے وداعی راگ گایا اور سب نے زہرا بیگم کو رخصت کر دیا۔ جہاں آرا بیگم بھی ساتھ روانہ ہوگئیں جب مہمان یکے بعد دیگرے رخصت ہوئے تو ہمیں زاہدہ بیگم نے بلایا۔ اُن کے دیور یعنی خواجہ غلام صادق صاحب کے چھوٹے بھائی خواجہ یٰسین کی شادی تھی۔ ہم بھی اس شادی میں امرت سر شامل ہوئے۔ اور پھر میں اپنے والدین کے پاس چند ماہ ٹھہری۔ اس اثنا میں مہرالنسا بیگم میری خوشدامن صاحبہ حج کیلئے مکہ شریف کو روانہ ہوگئیں۔ اور دوسری خوشدامن صاحبہ ریاست پونچھ میں تشریف لے گئیں۔ میاں بخت نصر صاحب کی اپنی بیگم اخترالنسا بیگم کے ساتھ کچھ شکر رنجی برسوں سے جاری تھی ان کا ارادہ دوسری شادی کا ہوگیا۔ بلکہ ایک صاحب ٹھیکیدار میاں غلام صمدانی صاحب نے اپنی لڑکی اُسے منسوب کردی یہ نیا گل کھلتے ہی چاروں طرف سے

میدان صاف ہوگیا۔ میں حیران تھی۔ کہ

زمینِ چمن گل کھلاتی ہے کیا کیا
بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

چوتھا باب

اپنے گھر کی مختاری کا زمانہ

میاں قمرالزماں صاحب ایک دن مجھ سے پوچھنے لگے۔ کہ تمہیں کس جگہ کی رہائش پسند ہے؟

میں۔"سب کو اپنا وطن عزیز ہوا کرتا ہے۔ اگر کوئی خاص خصوصیت نہ سمجھیئے تو مجھے پنجاب کی رہائش پسند ہے۔

میاں قمرالزماں۔ مگر تمہارے پنجاب کی گرمی اور شدت کی دہوپ۔ پناہ بخدا۔ اسکو کون برداشت کرسکتا ہے؟

میں۔ ہم لوگ جن کی پیدائش ہے!

میاں قمرالزماں۔ کیا پہاڑ کا موسم پسند نہیں؟

میں۔ پہاڑ کا موسم گرمی کے لئے مفید ہے۔ مگر سردی میں تو خدا بچائے جب

دیکھو پہاڑوں پر برف جمی ہوئی ہے۔ دن رات بارش کی وجہ سے طبیعت خراب ہو جاتی ہے"

میاں قمر الزماں:- "اگر ہم پنجاب کے کسی شہر میں رہائش اختیار کریں تو بہتر ہے؟"

میں یہ سنکر اس قدر خوش ہوئی کہ خدا ہی بہتر سمجھتا ہے۔ اس خیال سے کہ میرے والدین مجھے ملا کریں گے۔ اور میں ان کو جلدی جلدی مل سکوں گی۔ پہاڑی راستے دشوار گزار ہیں اور روپیہ خرچ کرنے پر بھی آرام نہیں ملتا۔ میں دل ہی دل میں بےحد خوش ہوئی اور پوچھا۔

"اچھا آپ کون سے شہر میں رہائش کرنا چاہتے ہیں؟"

میاں قمر الزماں:- "شیخوپورہ بیدادیں"

میں:- "وہ شیخوپورہ بیداد کہاں ہے؟"

میاں قمر الزماں:- "جہاں ہماری جاگیر ہے۔ والد صاحب مرحوم کے وقت سے ایک سو چھبیس ۱۲۶ مربعہ کا گاؤں ہے۔ تین سو کے قریب لوگ آباد ہیں جو سب ہماری ہی زمین آباد کرتے ہیں۔ ایک چھوٹا سا بنگلہ بھی وہاں بنا یا ہوا ہے۔ جب کبھی ہم لوگ شکار کو جاتے ہیں۔ تو وہاں ٹھہرا کرتے ہیں۔"

میں نے یہ باتیں میاں قمر الزماں کی زبانی سنکر اُس گاؤں کی رہائش کو پسند کیا۔ اور ان کو مشورہ دیا۔ کہ وہاں چلکر رہائش اختیار کریں۔ رفتہ رفتہ میاں قمر الزماں بھی میرے مشورہ سے متاثر ہو گئے۔ اور ایک دن صلاح کی کہ بھائی صاحب میاں بخت نصر صاحب کو پوچھا جائے۔ تا کہ وہ موضع شیخوپورہ میں رہنے کی اجازت دیں۔ آخر میاں قمر الزماں اور میاں بخت نصر صاحب نے آپس میں یہ معاملہ

طے کرلیا۔ میاں قمرالزماں صاحب کی تعلیم بہت کم تھی۔ مگر زمین آباد کرنیکا انہیں بے حد شوق تھا۔ میاں بخت نصر صاحب نے بھی یہ خیال پسند کیا۔ کہ اتنی بڑی جاگیر ہے وہاں جتنے منشی وغیرہ کام کرواتے تھے ہمیشہ نقصان ہی کرتے رہے۔ اب اگر ان کی رہائش ہوگی۔ تو گاؤں کی آبادی میں سہولیت اور رونق آجائے گی۔ شیخوپور کے کاغذات و نمبرداری میاں قمرالزماں کے سپرد کردی گئی پھر ہم شیخوپورہ میں آگئے۔ اور اُسی بنگلہ میں رہائش کی کچھ عمارت بڑھا کر کوٹھی بڑے پیمانہ پر تعمیر کروانی شروع کردی۔ باغ جو کوٹھی کے سامنے تھا۔ اسکو بڑھایا۔ اصطبل بنوایا۔ گائے بھینس بکریاں بھیڑیں۔ غرضکہ مویشیوں کے لئے جدا جدا عمارتیں بنا رلیں۔ گراونڈ میں چاروں طرف پھول پودے لگوائے۔ اور کئی مالی نوکر رکھے گئے۔ کوٹھی کے گرد گھماؤں بھر زمین خود کاشت کیلئے آباد کی گئی۔ خود کاشت کیلئے نوکر اور بیل خریدے گئے۔ سرمایہ داری میں کوئی چیز بھی خواہ کیسی بیش قیمت ہو فوراً مہیا ہوسکتی ہے۔ خدا کے فضل سے روپیہ کی کمی نہ تھی۔ ہم نے دن رات محنت کرکے سوچ سمجھ کر اپنی ضروریات کو بالکل امیرانہ ٹھاٹھ میں مکمل کرلیا۔ گاؤں کے لوگ بہت سے نوکر رکھ لئے۔ ان کا بھی گذارا اچھا ہونے لگا۔ تمام گاؤں میں ہماری آبادی سے رونق آگئی۔ کوٹھی کے اندر میری رہائش کے کمرے۔ غسل خانے۔ باورچی خانے۔ مردانے و زنانے۔ صحن بھی تھے۔ جن میں چاروں طرف باغیچہ اور درمیان میں ایک چوک تھا جس پر سرخ بجری کُٹی ہوئی تھی۔ چوک کے چاروں طرف چھوٹی چھوٹی سڑکیں ان کے کناروں پر رنگ برنگ کے خوشنما پھول دار پودے لگائے گئے تھے۔ درمیان میں گلاب اور چنبیلی اور بیلا وغیرہ تھا۔ کونوں پر سرو اور صنوبر کے

درخت استادہ تھے۔ ایک کوآں محض باغ کی خاطر ہر وقت چلتا رہتا۔ پانی کی افراط سے باغ ایک ہی برس میں کافی پر رونق ہوگیا۔ خود کاشت کی گندم اور چاول کی فصل بھی ہوا کرتی تھی۔ ایک نالہ جسکو وہ لوگ "ڈیک" کہکر پکارا کرتے تھے۔ جو دریائے چناب سے نکل کر ہمارے گاؤں میں سے بہتا ہوا باہر نکل جاتا تھا جسکر موسم برسات میں تو اس کا پانی اچھل کر تمام گاؤں میں آجایا کرتا تھا۔ اس پانی سے چاولوں کی خوب کاشت ہوا کرتی تھی۔ ہمارے ہاں چار قسم کے چاول ہوتے تھے۔ دو قسم تو بہت نفیس تھے۔ اعلیٰ درجہ کی باسمتی دو کم معمولی۔ بنجر زمین میں لوگوں کے مویشی چرا کرتے اور ان کی چروائی سال میں ہر چھ ماہ بعد لوگوں سے فی بھینس ۱۲ سے لیکر بکری تک ۳ وصول ہوتے غرضکہ اچھی خاصی آمدن ہوجایا کرتی تھی۔ اپنے مویشی گھوڑے۔ گائے بھینس کا چارہ وغیرہ بافراط تھا۔ گھر میں دودھ کی بہتات تھی۔ سبزیاں اپنے باغیچہ میں ہر وقت موجود رہا کرتیں۔ کوٹھی کے برآمدہ میں پانچ گملے تھے۔ ہماری کوٹھی دور سے بالکل جنت نشاں معلوم ہوتی تھی۔ باہر کے ڈرائنگ روم میں بہت خوبی سے تصویریں اور ریشم کے پردے۔ فانوس اور پھولدان وغیرہ آراستہ کر رکھے تھے۔ شیر۔ چیتے۔ ریچھ اور ہرن کی کھال کا فرش تھا۔ میں نے اپنے کمرے بھی حسب ضرورت آراستہ کر رکھے تھے۔ میز پوش اور انگیٹھی کے کنس میں نے اپنے ہاتھ کی کشیدہ کاری سے تیار کئے تھے۔ کئی قسم کے بستر اور رضائیاں ریشم کی علیحدہ اور سوتی علیحدہ غرضکہ سلوا کر ایک کمرہ میں محفوظ کر رکھی تھیں۔ دسترخوان۔ فرش اور چادریں سفید علیحدہ اور پھولدار علیحدہ۔ غرض جو کچھ میرے دل میں آتا کرتی رہی۔ اگرچہ مجھے خود تو کسی کام کا پورے طور پر تجربہ

نہ تھا۔ اور نہ اپنے ہاتھ سے کام کرنے کا موقعہ ملتا تھا لیکن پھر بھی ہر وقت یہ شوق میرے دل میں سمایا رہتا۔ کہ کوئی میرے کام میں نقص نہ نکالے اور مجھے ناکارہ نہ سمجھا جائے۔ لہذا میں نے کئی قسم کے کھانے بھی تیار کرنے سیکھ لئے۔ کیک۔ بسکٹ کئی قسم کے پڈنگ جیلی۔ فالودے۔ اچار اور کئی طرح کے مربے خود تیار کر لیتی تھی۔ ہمارے یہاں رہائش اختیار کرنے اور تمام سامان مکمل ہو جانے پر بہت مہمان آنے جانے لگے۔ بڑے بڑے امیر کبیر لوگ یہاں شکار کھیلنے آجاتے تھے۔ تو اُن کے کھانے پینے کا سامان باوجود باورچی اور خانساماؤں کے مجھے خود بھی بہت سا انجام دینا پڑتا تھا۔

غرض کہ مجھے اب اپنے وسیع گھر میں اپنی عقل سے ایک بڑے پیمانہ پر حکومت و خود مختاری حاصل تھی۔ ہر ایک کام میری مرضی سے ہوتا تھا۔ مگر میری طبیعت میں بے پروائی اور لاابالاپن حد سے زیادہ تھا۔ تاہم خانہ داری کا تمام بوجھ اپنے سر پر تھا۔ خدمتگار اگرچہ بیسیوں حاضر تھیں۔ مگر وہ گاؤں کی جاہل گنوار کسی بات کی تمیز نہ تھی پر ہر کام اُن کو بمشکل تمام دماغ سوزی کے بعد سکھلایا کرتی تھی۔ برتنوں کے نام۔ سامان کے نام۔ اُن کا رکھنا اٹھانا سکھاتی رہتی۔ گھر اگرچہ ایک چھوٹا سا لفظ ہے۔ جو تین حروف سے مرکب ہے۔ مگر اس کا انتظام ایک ملک کے برابر ہے۔ عورت کی تمام خوبی اس کے سلیقہ شعار ہونے پر منحصر ہوتی ہے۔ گھر کی مالکہ خواہ کیسے اچھے لباس میں ملبوس ہو۔ بیش بہا زیور سے آراستہ ہو۔ خوبصورت نازنین اور ماہ جبیں ہو۔ رفتار گفتار سے قیامت اٹھائے۔ مگر گھر کے انتظام کی لیاقت اور سلیقہ نہیں رکھتی۔ تو ایک سادہ لباس پہننے

والی عورت جس میں ظاہری خوبیاں بالکل نہ ہوں لیکن گھر کے سب کام سلیقہ سے انجام دینے کی لیاقت ہو۔ اس آرام طلب ماہ جبیں سے ہزار درجہ بہتر ہوگی۔ جو گھر کا انتظام اپنے ہاتھ اور اپنی عقل سے نہ کرسکے۔ سلیقہ مند بیوی کے نوکر بھی اچھے رہتے ہیں اور نقصان نہیں کرسکتے۔ کیونکہ ان کو اندازہ ہو جاتا ہے کہ گھر کی مالکہ ہماری سب حرکات کو نظر میں رکھتی ہے۔ اکثر امیر گھروں میں طرح طرح کے نوکر آیا کرتے ہیں۔ کبھی کبھی نوکروں کے ہاتھ سے نقصان اور بے عزتی بھی ہو جاتی ہے۔ گھر کا جو حال نوکروں کو معلوم ہوا کرتا ہے وہ کسی قریبی عزیز کو بھی معلوم نہیں ہوسکتا۔ اس لئے تمام نوکروں سے گھر کی مالکہ کو نہایت عقلمندی سے کام لینا چاہیئے۔ ہر وقت گالی گلوچ اور بدزبانی کرنا بھی غیر مناسب ہوا کرتا ہے۔ کیونکہ نوکر لوگوں کا فرقہ نہایت خطرناک ہوتا ہے۔ جن کے ہاتھوں بڑے بڑے گھر بدنام ہو جایا کرتے ہیں۔ نوکروں کو زیادہ رازدار بنانا اور ہر وقت ڈانٹ ڈپٹ کرنا بھی نامناسب ہے۔ سب سے زیادہ کم سن بی بی کو متلون مزاجی سے پرہیز کرنا چاہیئے۔ یہ عادت جوان اور کم سن ناتجربہ کار طبیعت میں ضرور ہوا کرتی ہے۔ مگر یہ عیب بھی بہت بڑی بُرائی ہے۔ جہاں تک ہوسکے خواہ کیسی ہی نادان طبیعت اور کمسن ہو۔ متلون مزاجی اس کے حق میں زہرِ قاتل ہے میں نے ایک بہن کی عادات و حرکات سے یہ تجربہ حاصل کیا تھا۔ جو متلون مزاجی سے بے حد خراب ہو چکی تھی۔ دانائی انسان کی صفت ہے۔ بقول شاعر۔

بزرگی بہ عقل است نہ بہ سال

تونگری بہ دل است نہ بہ مال

یعنی بزرگی بڑی عمر ہو جانے پر منحصر نہیں جسکو خدا بزرگی بخشتا ہے
خواہ دو برس کا بچہ ہو۔ سخاوت کرنے والا خواہ کیسا ہی تنگدست کیوں نہ ہو
وہ سخی ہی رہیگا۔ جس سے انسان محبّت کرے اُسے کبھی بُرا نہ سمجھے۔ ہرایک
بات کو حدِ اعتدال سے زیادہ نہ بڑھاوے سمجھ سوچ کر ہرایک معاملہ میں
قدم رکھنا چاہیئے جس کی طبیعت میں جلد بازی اور تلوّن ہو۔ وہ بہت نقصان
اُٹھاتا ہے۔ خداوند کریم کا بڑا احسان یہ تھا۔ کہ میں اگرچہ ناتجربہ کار اور لاپروا تھی۔
مگر اس گھر میں مجھے ذمہ داری کی ضرورت سی محسوس ہونے لگی۔ کیونکہ بڑے
امیر گھرانوں کے مرد عورتوں سے سابقہ پڑتا تھا ملازم اور منشی لوگ جو ستّر اسّی
روپیہ ماہوار تنخواہ پر مقرر تھے۔ اُن سے حساب کتاب اور گھر کے اخراجات کے
متعلق بازپرس کرنی پڑتی۔ تو میں اس وقت بہت سوچ سمجھکر گفتگو کیا کرتی تھی۔
بلکہ اُن لوگوں سے نرمی سے پیش آتی۔ اگر اُن کو ڈرانے دھمکانے کی ضرورت
ہوتی۔ تو عمدہ طریق سے اپنے مطلب کا اظہار کر دیتی۔ غرض کہ ان لوگوں میں بھی
کسی کو بُرا کہنے یا نفرت کرنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ ہرایک خدمتگار خورد و کلاں
میری رواداری سے خوش تھے۔ چاروں طرف جتنے قریب قریب گاؤں تھے
وہاں کے سب زمینداروں میں میرے اخلاق و محبّت کا چرچا تھا۔ اکثر عورتیں
جو ہمارے گاؤں میں مہمان بنکر اپنے رشتہ داروں کے ہاں آتیں۔ وہ ضرور مجھے
ملنے آیا کرتیں تھیں۔ میرا وقت نہایت خوبی سے گزرتا رہا۔ کسی نے کیا خوب کہا
ہے۔ "کسبِ کمال کن تا عزیزِ جہاں شوی"
دنیا کے کارخانہ میں اس صانع قدرت نے ہر ایک انسان کی خصوصیت

کو علیحدہ علیحدہ رکھا ہے۔ ہر ایک انسان کی شکل و شباہت، رنگ، کلام اور چال ڈھال میں فرق رکھدیا ہے۔ اگر یہ امتیاز نہ ہوتا۔ تو ایک انسان کو دوسرے سے تمیز کرنا مشکل ہو جاتا۔ بعض انسان آپس میں شکل و صورت کی بیحد مشابہت رکھتے ہیں۔ لیکن غور سے دیکھنے پر کوئی نہ کوئی فرق نکل آتا ہے۔ حتیٰ کہ سب بکریاں اور بھیڑیں اگرچہ ایک ہی شکل کی ہوتی ہیں۔ مگر اُن کے چرواہے ہم سے زیادہ ان کی شناخت رکھتے ہیں۔ کیا مجال ایک دوسرے کی بھیڑ بدل جائے۔ چرواہے ان میں بھی کوئی فرق پاکر جھٹ پہچان لیتے ہیں۔ اس صانع ازل نے ہر چیز کے اندر کچھ نہ کچھ فرق ضرور رکھ دیا ہے۔ اسی طرح انسانی مزاج میں بھی تفاوت ہے۔ آب و ہوا، رہائش، کھانا، محنت، آرام، رنج، راحت سب مختلف طریقہ پر ہوتے ہیں۔ قدرت کی کارسازی ہے کہ کنبے اور خاندان کے لوگوں میں ہر ایک فرد کا اپنا علیحدہ علیحدہ اور مختلف مزاج ہوتا ہے۔ یہ اختلاف بعض حالتوں میں اسقدر زیادہ ہوتا ہے کہ دیکھنے والے کو تعجب ہونے لگتا ہے۔ بعض انسان اس قدر مختلف مذاق کے ہوتے ہیں کہ ان کی باتوں میں عجیب اثر ہوتا ہے۔ ان کی امیدیں بھی مختلف اور ان کے ارادے بھی مختلف ہوتے ہیں۔ اسی کا نام دنیا ہے جہاں ہر انسان اپنے ہی رنگ میں مدہوش دکھائی دیتا ہے۔ اب اس صورت میں مشکل امر یہ ہے۔ کہ ہر شخص کو اپنے خیال پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ اپنی طبیعت پر جبر کر کے دوسرے انسان کے ارادے کو معلوم کرتے ہوئے اسکو اپنے خیال سے مانوس کر لینا بہت بڑی مہم ہے۔ اختلاف رائے کو برداشت کرنا سخت مشکل سہی۔ لیکن انسان میں یہ وصف ہونا چاہیئے کہ اگر اپنے خلاف منشا

کوئی بات ہو جائے یا کوئی طریقہ ایسا پیدا ہو۔ تو اس پر دانائی عقلمندی حوصلہ اور بُردباری سے کام لینا چاہیئے ذرا ذرا سے اختلافِ طبع پر ناراض ہونا اور ذرا سی بات میں سُرخ ہو جانا متلون مزاجی ہے۔ بعض موقعے ایسے بھی ہوتے ہیں۔ کہ جن پر برداشت اور طاقت کا اندازہ لگا یا جاتا ہے۔ ہمیشہ انسان کو تدبیر سے کام لینا چاہیئے جس میں ضبط اور صبر کی طاقت ہے۔ اس میں یہ ایک خاص جوہر ہوگا جس سے وہ اپنے متعلق بہت کچھ سن سکتا ہے۔ خواہ لوگ کیسے ہی خلاف طبع کیوں نہ ہوں وہ آسانی سے قابو میں آجاتے ہیں۔ ایسے انسان کے دل میں غصہ کے بخارات نہیں اُٹھتے۔ وہ ہمیشہ خلاف طبع بات کا ٹھنڈے دل سے جواب دے سکتا ہے۔ اگرچہ غصّہ تو ہر بشر میں ہے۔ کون ہے جسکو غیض و غضب میں آکر گھبراہٹ نہ ہوگی؟ مگر یہ سب اختلافِ طبع پر منحصر ہے۔ اگر صرف برداشت کی طاقت پیدا کی جائے۔ تو بہت سی مشکلیں آسان ہو جاتی ہیں۔ ایک بات یہ بھی یاد رکھنی چاہیئے۔ کہ ہر انسان غلطی کا پُتلا ہے غلطی کا ہونا تقاضائے بشریت ہے۔ اس لئے ہم سب سے غلطی کا ہونا یقینی اور لازمی ہے۔ خدا محفوظ رکھے مگر اپنی غلطی پر ہم کس طرح یہ امید رکھ سکتے ہیں۔ کہ دوسرے انسان ہمیں ضرور درگزر کر دیں گے۔ اس خیال کو مدنظر رکھتے ہوئے یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ اگر دوسرا انسان بھی کوئی غلطی کر بیٹھیں یا دانستہ قصور ان سے سرزد ہو جائے۔ تو ہم کو چاہیئے کہ برداشت کریں۔ غصّے میں انسان کی عقل و دانش قائم نہیں رہ سکتی۔ لہذا اسکو اپنے سے بہتر خیال کرنا چاہیئے۔

اس کے متعلق بہت سی ہدایات حدیث شریف میں ہیں۔ زیادہ طوالت کی ضرورت نہیں۔ میں نے جن عادات سے فائدہ اُٹھایا۔ ان کا لکھنا ضروری

سمجھتی ہوں۔ میرا وقت عادتِ برداشت کی وجہ سے ہر قسم کی عورتوں کے ساتھ اچھی طرح گذرنے لگا۔ دل ان کی مدارات کا عادی تھا۔ یہاں تک کہ وہ میرے ہر حکم پہ دلی محبت سے جان نثار کرنے کو تیار رہتیں۔ کبھی کسی نے میری غیبت نہ کی تھی۔ میں نے ان لوگوں کو اس قدر مانوس کر لیا کہ تمام گاؤں کی عورتیں میرے ساتھ دلی اُنس کرنے لگیں۔ وہ مجھ کو ہر وقت دعائے خیر سے یاد کیا کرتی تھیں۔ ایسا عروج صرف اپنے دل کو مقید اور نفس پر تشدد کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ دنیا ایک درسگاہِ حقیقت ہے۔ جہاں روح کو عبرت پذیر و حقیقت شناسی کا سبق حاصل ہوتا ہے۔ فانی دنیا کے تمام مناظر مسرت انگیز ہوں یا عبرت آمیز۔ انسان کے لئے اتالیق فطرت ہیں۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں انسان ان تمام قدرت کے پیدا کردہ و مقرر کردہ اتالیقوں کے ذریعے حقیقت شناس ہو سکتا ہے۔ بعض لوگ دنیا کے وجود کو قابل نفرت سمجھتے ہیں اور اس فانی دنیا سے دل لگانے کو بُرا جانتے ہیں۔ مگر چاہیں۔ تو سب کچھ اس دنیا میں میسر ہو سکتا ہے۔ بد سے بدتر اور بہتر سے بہتر۔ اس وقت میرا اقبال ترقی یافتہ تھا۔ ہر کوئی مجھے دل سے پسند کرتا۔ اور میری التفات کو فخر سمجھتا تھا۔

گاؤں میں کوئی حادثہ پیش آتا۔ تو تھانہ اور پولیس کے لوگ ہمارے پاس آکر قیام کرتے۔ تا وقتیکہ اُس حادثہ کی تحقیق نہ ہو۔ مجھے ان کے کھانے وغیرہ کا بھی انتظام کرنا پڑتا۔ جس قدر میری طبیعت لاپرواہ تھی۔ قدرت نے اسی قدر بڑے پیمانہ کے گھر کا انتظام میرے سپرد کر دیا۔ میاں قمرالزماں صاحب کسی وقت لاہور تشریف لے جاتے یا باہر شکار کو چلے جاتے تو میں مہمانوں

کی خاطر تواضع کا خود ہی خیال رکھا کرتی۔ اب اِس گاؤں میں ہمارے مقابلہ کا کون ہوسکتا تھا۔ تمام لوگ جو آباد تھے۔ ہمارے دست نگر تھے۔ بہت سی عورتیں اور خدمتگاریں موجود رہتیں۔ مگر اُن کے ساتھ مجھے بیحد دماغ سوزی کرنی پڑتی تھی۔ اگرچہ لاہور سے ہروقت ضروری اشیاء منگوائی جاتی تھیں۔ مگر پھر بھی گاؤں تھا لاہور سے ۲۵ میل کا فاصلہ۔ اگر کوئی ضرورت کی چیز ختم ہوجاتی تو بس کام رک جاتا۔ میں سب اشیاء ضروریات کا ہر وقت خیال رکھا کرتی تھی۔ سگرٹ چرٹ۔ چائے۔ بسکٹ چینی ایسی بے شمار اشیاء جو سب گھروں میں استعمال کی جاتی ہیں۔ موجود رکھتی۔ گرمی کے موسم میں شربت۔ خوشبودار کُلفہ۔ آئسکریم وغیرہ وغیرہ خود تیار کرلیا کرتی تھی۔

میاں قمر الزماں میری ہوشیاری اور گھر کے انتظام پر نہایت خوش رہتے اور اپنے دوستوں کے پاس میرے سلیقہ کی تعریف کیا کرتے تھے۔ اکثر میرے پاس جہاں آرا بیگم۔ زہرا بیگم اور زاہدہ بیگم بھی آیا کرتی تھیں۔ وہ بھی میرے سلیقہ کو پسند کرتیں۔ ایک دفعہ جہاں آپا کا دیور میرا پھوپھی زاد جن کا نام عنیزت جہاں خاں تھا اور میرے چچا صاحب قبلہ میاں فیض محمد صاحب تشریف لائے۔ تو انہوں نے کہا کہ ہم آج ایک فرمائش کریں گے۔ بھلا دیکھیں تیار ہوتی ہے یا نہیں؟

میرے چچا نے کہا بیٹی آج تو ہمارا دل دیسی مٹھائی کو چاہتا ہے۔ یہ بسکٹ اور ٹوسٹ ہم چائے کیسا تھ تیسرے پہر کو نہ کھائینگے۔ میں نے کہا بہت بہتر۔ اس پر میرے عزیز بھائی صاحب خوب کھِل کھلا کر ہنس پڑے اور کہا۔ کسی ملازم

کولاہور بھیجکر مٹھائی منگوالو گی ؟ مگر میں نے جواب نہ دیا۔ باورچی خانہ میں جاکر کھوئے
میں تھوڑا سا میدہ ملاکر گلاب جامن اور کچھ کھوئے کے پیڑے تیار کئے اور
میدے میں گھی ملاکر نمکین مٹھیاں (سموسے) تیار کئے۔ اور کچھ بیسن کا مونگرا۔ یہ
سب چیزیں خود تیار کرکے چائے کے ہمراہ بھیجدیں۔ میرے عزیز بھائی مجھے دیکھنے
آئے۔ کہ آیا خود تیار کی ہیں یا کسی سے پکوائی ہیں۔ میں ابھی چولھے کے پاس ہی بیٹھی
تھی۔ یہ دیکھکر وہ بہت خوش ہوئے۔

چچا صاحب نے مجھے انعام دیا۔ اب میں شوق سے ان کے لئے ہر روز
ایک نئی چیز تیار کرنے لگی۔ ان دنوں ہماری خود کاشت میں آلو بہت ہوئے تھے
میں روز آلوؤں کا ایک نیا سالن نئے طریقہ سے تیار کرتی اور کھانے کے
ساتھ رکھدیتی۔ حتیٰ کہ آلوؤں کے ۱۷ قسم کے سالن ان کو کھلائے۔ اسی طرح
میں دن بدن ہر کام میں ماہر ہوتی جاتی تھی۔ اس زمانے میں دستکاری کا بھی رواج
نہ تھا۔ اور کوئی خاص فیشن بھی نہ تھے۔ مگر میری طبیعت میں جدت تھی اور
اسکو جو کوئی دیکھتا پسند کرتا۔ میری تعلیم وتربیت کا حال تو آپ نے شروع
میں پڑھا ہی ہے۔ اس زمانے میں خاندانی لڑکیوں کے واسطے پردہ اور
خاموشی شرم وحیا ہی سب کاروبار پر حاوی تھی۔ زیادہ بولنا۔ بڑوں کی باتیں
قطع کلامی کرنا۔ گفتگو سے پرہیز کرنا۔ اگر کوئی اختراع دماغ سے نکلے بھی تو اُسے
ملیا میٹ کردینا آج سے پچاس برس پہلے کا زمانہ تھا۔ میں اس گھر میں
جہاں نہ ساس نہ نند نہ کوئی آس پاس۔ خود ہی سب کی جگہ ہر کام بنھاتی
تھی۔ میں ہی خوب جانتی تھی۔ کہ کس طرح سے تمام کام انجام دئے جاتے ہیں ؟

خدا کی مہربانی اور ترقی و اقبال کا زمانہ تھا۔ ہر ایک رشتہ دار اور نوکر پیشہ بھی مجھ سے خوش رہتے۔ میرے حکم سے کبھی پس و پیش نہ کرتے۔ تمام گاؤں کی عورتیں میری عزت و بڑائی گاؤں کی مالکہ سمجھ کر نہیں کرتی تھیں۔ بلکہ قدرتاً انکے دل میں میری طرف احساسِ محبت تھا۔ البتہ مجھے وہاں ایک مشکل تھی۔ کہ جب کسی وقت میں بے کار ہوتی۔ تو دل چاہتا کہ کوئی ہم عمر سہیلی ہنسلی یا کوئی اچھی سوسائٹی ہو۔ کیونکہ دیہاتی عورتوں کا مذاق کچھ اور تھا۔ میں کچھ کہتی اور وہ کچھ سمجھتیں۔ میرا دل چاہتا تھا۔ کہ میں کوئی کتاب پڑھوں اور یہ سنیں۔ مگر وہاں اس شوق کا فقدان تھا۔ آخر میں نے نماز کے متعلق ان کو ہدایت کی تو وہ شوق سے نماز پڑھنے لگیں۔

ایک دفعہ ایک نوجوان عورت نے مجھے کہا۔ کہ بی بی جی آپ ہیر رانجھا کی کتاب نہیں پڑھا کرتیں؟

میں نے کہا۔ آج تک تو میں نے پڑھی نہیں اگر تم سننا چاہتی ہو تو میں ضرور لاہور سے "ہیر وارث شاہ"[1] منگوا لوں گی۔ پہلے تو مجھے اس کتاب کا پڑھنا مشکل معلوم ہوا۔ آخر کچھ طریقہ سا آگیا۔

میں جب رات کو سنانے بیٹھی۔ تو اسے ترنم کے ساتھ پڑھا۔ اگرچہ اس کتاب میں معرفت کا سبق تھا۔ مگر یہ گاؤں کی عورتوں کے مذاق کی چیز تھی۔ اس لئے وہ پوری توجہ دیکر اُسے غور سے سننے لگیں۔ اور اسکے بعد وہ ہمیشہ ترنم سے سُنانے کیلئے میری منت خوشامد کرتی رہتی تھیں۔ مگر میں اپنی آواز کسی نامحرم کو سنانا معیوب سمجھتی تھی۔ لہذا ایسی جگہ بیٹھکر پڑھا کرتی۔ جہاں میری آواز

---

[1] یہ کتاب پنجابی نظم میں ایک روحانی داستان ہے۔

دیوار سے باہر نہ جا سکے۔ تاہم گاؤں میں شور مچ جاتا۔ عورتیں سننے کے لئے آتیں۔ میں نے سوچا۔ کہ یہ تو بہت بری بات ہے لہٰذا میں نے اُن عورتوں سے پوچھا۔ کہ "ہیر رانجھا" کے حالات آپ کو پسند ہیں یا میری آواز؟ چند عورتوں نے کہا کہ حالات تو جو کچھ ہیں وہ بھی سننے کے قابل ہیں۔ مگر تمہاری آواز اور طرزِ ادا ہمیں زیادہ پسند ہے۔ میں نے کہا۔ اگر میں اسی لہجہ میں اور کوئی چیز سناؤں یا سکھاؤں تو پسند کرو گی؟ اُنہوں نے کہا کیوں نہیں!۔ اس کے بعد میں نے ان کو نعت شریف رسول کریمؐ کی شان میں سنانی شروع کر دیں۔ غرضیکہ اس طرف توجہ دے کر اُن کو میلاد شریف پڑھنا سکھایا اور اسی دوران میں قرآن مجید کا ترجمہ بھی۔

اکثر جمعرات کی شب کسی جگہ کو سردی گرمی کے لحاظ سے پاکیزہ بنا کر عمدہ خوشبو چھڑک کر چوکی بچھائی جاتی۔ وہاں تمام عورتیں اور لڑکیاں نعت خوانی کیا کرتیں تھیں میں انکو کچھ حدیث اور مسائل سناتی۔ ہر ہفتہ دو ہفتہ کے بعد میرا یہ شغل رہا کرتا تھا تمام گاؤں کی عورتیں دلدادہ ہوگئیں۔ میرا دل بھی اس جنگل بیابان میں ان جنگلی لوگوں کے لئے کوشش اور جدوجہد کرنے سے مانوس ہو گیا۔ اب میرا دل جس وقت چاہتا اپنے والدین کو شیخوپورہ میں بلا یا کرتی تھی میرے والدین میری حکومت اور خوش بختی پر شاد ہؤا کرتے۔ اور میرے واسطے جو ضروریات یہاں نہ مل سکتیں۔ اپنے شہر سے بھیج دیتے تھے۔ میرے دن رات مسرت میں گزرتے۔ سسرال والوں کی طرف سے جو کوئی مہمان آتا۔ میرے انتظام پر شاباش کہتا۔ مجھے ایک منٹ بھی اپنے گھر کے اہتمام و خانہ داری سے فرصت نہ ملتی تھی۔

گرمی کے موسم کا مجھے ایک سہانا منظر یاد آتا ہے کہ صحن چمن میں جو درمیانی

چوک تھا۔ اس میں میاں قمرالزماں کا اور میرا بستر لگا ہُوا تھا۔ دوسری طرف ایک تخت پوش پر شب کے کھانے کا سامان۔ ایک طرف میز و کرسیاں۔ اس چوک کے چاروں طرف اراک تھے۔ جن میں موتیا اور گلاب کے کھلے ہوئے پھول دماغ کو معطر کر رہے تھے۔

میاں قمرالزماں ہارمونیم کے شوقین تھے۔ ان کے پاس ہارمونیم گراموفون اور میز پر گراموفون کے اچھے اچھے دلکش ریکارڈ رکھے ہوئے تھے۔ اس وقت دستی پنکھے اور گیس لیمپ کے پنکھے ہُوا کرتے تھے۔ جو پلنگ کے ساتھ لگے رہتے تین صد خدام ہمیشہ ہم دونوں کی خدمت میں چوبیس گھنٹے حاضر رہا کرتے تھے۔ ہم اس راحت میں مسرت کی میٹھی نیند سوتے۔ ایک دوسرے کے دلدادہ تھے ایک شب میری آنکھ کھلی۔ چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ چمنستان میں سفید پھول کھلے ہوئے تھے۔ چاروں طرف عیش و مسرت کا سامان تھا۔ میاں قمرالزماں بیخبر سو رہے تھے۔ اور ان کا مرادہ حسن تعریف کے قابل تھا۔ گو یا نہایت ہی وجیہہ جوان تھے۔ چاندنی ہی دلکش اور ایک عجیب سماں تھا۔ میں نے چاروں طرف نظر اُٹھائی اسوقت مجھے یہ منظر بے حد خوبصورت معلوم ہُوا۔ چوک کے چاروں کونوں میں سرو سفیدے کے درخت ایسے معلوم ہوتے تھے گویا سنتری ہماری حفاظت کو ایستادہ ہیں جہاں صبح پانچ بجے تک ہم سوتے رہتے۔ بلکہ میں صبح کی نماز کے بعد تلاوت قرآن بھی وہاں ہی کیا کرتی تھی۔ میرے نماز کے تخت پوش کے قریب سرو کے درخت میں بلبل کا گھونسلا تھا۔ وہ اکثر ہمارے جاگنے کے وقت اس سرو کے درخت پر نغمہ سرائی کیا کرتی۔ اس کی آواز پیاری

پیاری صبح کے سہانے وقت میں بے حد دلکش معلوم ہوتی تھی۔ آج بھی مجھے لکھتے ہوئے وہ منظرِ دلکشا یاد آکر عجیب کیفیت پیدا کر رہا ہے جسے بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ بلبل کی تعریف اور نغمہ سرایاں کتابوں میں پڑھی اور شعروں میں سنی تھی۔ مگر وہاں یہ نظارہ میں ہر روز آنکھ کھلتے ہی دیکھتی اور اس بلبل کی صدائیں سنتی۔ ایک صبح غیر معمولی آوازیں آنے لگیں۔ اور دوسری بلبل شاید نر ہوگا یا مادہ دونوں مل کر چہچہانے لگے۔

میں ان کی شیریں آوازیں سنکر ایک محویت کے عالم میں ٹکٹکی لگائے کچھ کھوسی گئی۔ اپنے بستر پر لیٹے ہوئے دونوں بلبلوں کے نغموں پر سر دھن رہی تھی۔ کہ اتنے میں میری خوشدامن مہرالنسا کی ایک خدمتگار جس کا نام زیب النسا تھا۔ جو بے حد پاکیزہ خیال اور پرہیزگار تھی۔ ہم سب اس کی نیکی کی وجہ سے اس کا ادب کیا کرتی تھیں۔ وہ بیماری کی وجہ سے شیخوپورہ میں اب تبدیل آب و ہوا کے لئے آئی ہوئی تھی۔ اور یہاں آکر صحت یاب ہوگئی تھی۔ صبح ہی صبح نماز سے فارغ ہو کر چمن میں ٹہلتی ہوئی آہستہ آہستہ قدم رکھتی ہمارے چوک کی طرف آئی۔ اور مجھے اشارہ سے پوچھا کہ آج نماز نہیں پڑھوگی!

میں نے کہا۔ "پڑھوگی"

زیب النسا: پھر دیر کیوں کر رہی ہو؟

مجھے بہت غصہ آیا۔ کہ میں کس مزے سے بلبلوں کی آواز سن رہی تھی اور زیب النسا نے جواب سوال کرنے شروع کر دیئے۔ میں نے اشارہ سے کہا کہ مہربانی کرکے آگے نہ آنا۔ بلبلیں بولتی ہیں۔ اُڑ جائیں گی۔

زیب النسا۔ بھلا جانوروں کی آوازوں کا کیا سننا؟
اتنا کہکر اُلٹے پاؤں واپس چلی گئی۔ اور مجھے بدمزا ہونا پڑا۔ ایک بلبل اڑ گئی۔ دوسری بھی پھول پر جا بیٹھی۔ میں زیب النسا کو کوسنے لگی تو میاں قمر الزماں بیدار ہو گئے اور کہا کیا بات ہے؟

میں "بلبل بول رہی تھی۔ زیب النسا نے اپنے مولوی پن کا اظہار شروع کر دیا تھا۔ "نماز پڑھو۔ دیر ہوتی ہے"۔ حالانکہ کافی وقت نماز کا تھا۔ وہ کیسی اچھی بول رہی تھیں۔ اڑ گئیں۔

میاں قمر الزماں۔ یہ نوروز نغمہ سرائی کرتی ہیں۔

میں۔ خدا معلوم آج جیسی آواز ہو یا نہ ہو۔ آج تو دونوں نر و مادہ مل کر باتیں کرتے معلوم ہوتے تھے۔

میاں قمر الزماں۔ کہیں ہماری باتیں تو نہیں ہو رہی تھیں؟
میں (ہنسکر) ہماری کیا بات ہو گی۔ غضب کر دیا اِس کمبخت نے۔

میاں قمر الزماں ہنستے ہوئے باہر چلے گئے۔ میں نے نماز ادا کی۔ اور اسی بیچ میں زیب النسا کو مولانا صاحب کہکر پکارنے لگی۔ مجھے ہر ایک چیز کا اس مسرت آمیز زمانہ میں شوق تھا۔ لباس کا۔ کھانے کا۔ صفائی کا میل ملاپ کا۔ سیر و سیاحت کا غرض کہ میری طبیعت میں نشاشت اور چستی اسقدر تھی۔ کہ جو کام دیکھ لیتی فوراً میرے ذہن نشین ہو جاتا تھا۔ میں ہوائی بندوق بھی چلا لیا کرتی ۔اور اکثر کچی دیوار پر نشانہ بازی کیا کرتی تھی میاں قمر الزماں صاحب میری حرکتوں سے خوش ہوتے۔ اور میری ہر بات میں تعریف کرتے۔ نئے نئے

خیال میرے دل میں پیدا ہوتے تھے۔ ایک دن میں نے میاں قمرالزماں صاحب
سے کہا۔ میرا دل چاہتا ہے کہ اپنی چند سہیلیوں کو اپنے گھر بلاؤں اور ان کیلئے چائے
اور کھانے کا اہتمام کردں۔ بلعد میں گانے بجانے کا بھی تفریح طبع کیلئے کوئی انتظام
ہونا چاہیئے۔ چنانچہ میاں قمرالزماں نے بڑی خوشی سے اجازت دی اور کہا" شوق
سے کرو" میں نے اپنی چند سہیلیوں کو دعوت دی۔ عین وقت مقررہ پر میری
تمام بہنیں تشریف لے آئیں وہ سب میری زندہ دلی سے دلچسپی رکھا کرتی تھیں میں
نے ان کے لئے حسب دلخواہ کھانے اور چائے کا مکمل انتظام کیا۔ پھر
خیال آیا۔ کہ ان بہنوں سے کوئی تقریر کروائی جائے۔ جو گاؤں کی جاہل عورتوں
کیلئے نصیحت آموز ہو۔ مگر تقریر اسقدر عام فہم ہونی چاہیئے۔ جس کا ان
عورتوں کی سمجھ میں ہر ایک لفظ آجائے۔ چنانچہ ایک خاتون نے کہا۔ کہ
میں ایسی تقریر کرونگی۔ جو عام فہم ہوگی۔ میں نے فوراً تمام گاؤں کی عورتوں کو
بلا بھیجا۔ اُن کے جمع ہونے پر ایک خاتون نے تقریر شروع کر دی:۔

(یہ تقریر سیرۃ النبوی جلد دوم صفحہ ۸۲ پر درج ہے)

مسلمان بہنو! آپ کو معلوم ہونا چاہیئے۔ کہ اسلام کی بنیاد پانچ
چیزوں پر قائم کی گئی ہے۔ ان میں سے توحید و رسالت کے علاوہ بقیہ
چار چیزیں ہیں۔ یعنی نماز۔ روزہ۔ حج۔ زکاۃ۔ عبادت میں داخل ہے۔ ان
میں سب سے اول شئے نماز ہے۔ نماز کی صحت کے لئے متعدد شرائط ہیں
سب سے اول ضروری شرط طہارت ہے۔ طہارت کے معنے ہیں۔ کہ جسم اور
لباس کا ظاہری و معنوی ہر قسم کی نجاستوں سے پاک ہونا عبادت کو اسلام

میں جو اہمیت حاصل ہے۔ اس کا اندازہ اس سے کرو۔ دوسری ہی دفعہ کی وحی سے جب احکام اور فرائض کا آغاز ہوا۔ تو توحید کے بعد دوسرا حکم عبادت ہی کا دیا گیا۔ عربی میں قرآن مجید کی آیت سورہ مدثر اُتری:۔

یَا اَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَاَنْذِرْ ۝ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝ وَثِیَابَكَ فَطَهِّرْ ۝ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ۝ یعنی "اے کپڑا اوڑھنے والے پس ڈرا لوگوں کو اور پروردگار اپنے کی بڑائی کر۔ اور کپڑوں اپنوں کو پس پاک کر۔ اور پلیدی کو چھوڑ دے۔"

اگرچہ مفسروں نے عموماً کپڑے کی عبادت سے دل کی عبادت اور ناپاکی سے بت پرستی مراد لی۔ تاہم اس سے ظاہر ہوتا ہے۔ نماز سے پہلے وضو کا طریقہ آغاز وحی سے حضرت جبریل نے آپ کو سکھایا تھا۔ حاکم نے مُتدرک میں حضرت ابن عباس سے ایک روایت کی ہے جس سے ظاہر ہوا کہ آپ ہجرت سے پہلے بھی وضو فرماتے تھے۔ لیکن قرآن میں وضو کا حکم بالاتفاق محدثین مدینہ میں نازل ہوا۔

یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِذَا قُمْتُمْ اِلَی الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَیْدِیَكُمْ اِلَی الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَی الْكَعْبَیْنِ ۝ یعنی اے مسلمانوں جب تم نماز کے لئے کھڑے ہو تو منہ اور کہنیوں تک ہاتھ دھو لیا کرو۔ سر کا مسح کرو۔ اور پاؤں ٹخنوں تک دھو لو۔

بہنو! نماز سے پہلے طہارت کا خیال رکھا کرو۔ عورت کو مرد سے زیادہ نجاست ہوتی ہے۔ اس لئے ہم عورتوں کو جسم کی صفائی کا مردوں سے کئی درجہ بڑھکر خیال رکھنا چاہیئے۔ یہ تقریر سب گاؤں کی عورتوں کے

ذہن نشین ہو گئی۔

اسکے بعد دوسری خاتون نے عام فہم زبان میں مندرجہ ذیل خیالات کا اظہار کیا۔

میری بہنو اور بچیو! آپ کو اندازہ ہوگا۔ کہ جب کبھی کسی شادی یا موت کی تقریب میں چند عورتیں مل کر بیٹھتی ہیں۔ تو ان میں قسم قسم کی یا وہ گوئی اور فضول باتیں ہونے لگتی ہیں۔ وہ خاصکر عیب جوئی اور نفاق کی باتیں کیا کرتی ہیں۔ اگر ذرہ بھر بھی کسی کی بُرائی سنتی ہیں۔ تو ضرور اس برائی کو دوسری بہنوں کے کانوں تک پہنچانا اپنا فرض اولین سمجھتی ہیں۔ میری بہنو! آپ کو ہمیشہ اسبات کا خیال ہونا چاہیئے۔ کہ جس وقت کسی کی بُرائی مُنہ سے نکالنے کا خیال پیدا ہو۔ اس وقت اپنے دل میں یہ سوچ لیا کرو۔ کہ میں بھی گنہگار ہوں۔ لہذا کس بنا پر میں یہ کلام منہ سے نکال رہی ہوں۔ اپنے آپ کو ندامت دلاؤ۔ اور عیب نکالتے وقت عبرت پکڑو۔ یہ کبیرہ گناہ ہے۔ اس کے متعلق بھی قرآن مجید میں بہت سی آیات آئی ہیں۔ مگر بدگوئی عیب جوئی کا جن باتوں پر خاتمہ ہو سکتا ہے۔ وہ یہ کہ انسان ہمیشہ کم گفتگو کرے زیادہ باتونی انسان گناہ کا عادی ہو جاتا ہے۔ عورتوں میں زیادہ باتیں کرنے کا نقص واقعی ہُوا کرتا ہے۔ بیہودہ گوئی سے بڑھ کر انسان کے حق میں کوئی دوسری بُری چیز نہ ہوگی۔ جسکو سلامت رہنا ہو۔ وہ سکوت کی عادت اختیار کرے۔ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے۔ کہ مومن کی زبان دل سے پیچھے رہتی ہے۔ یعنی بولتا ہے تو دل میں سوچتا ہے۔ تب زبان سے بات نکالتا ہے۔ گویا زبان کو قابو میں رکھنا بھی بہادری میں شمار کیا گیا ہے۔ غصے کی حالت میں اگر زبان پر قابو نہ ہوگا تو خدا معلوم غضب ناک حالت میں انسان

کیا کیا بکواس کردے۔ جو زہر قاتل بنکر انسان کو اکثر مصیبت میں گرفتار کردیتی ہے۔ خاموشی میں وہ جوہر ہے۔ جو قوت گویائی میں نہاں نہیں۔ سعدی رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا کیسے گزرتی ہے۔ کہا منہ تو نعمت کھانے میں اور زبان شکایت کرنے میں۔ حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو نصیحت کی تھی۔ کہ مجلس میں جب بیٹھو اپنی زبان کی حفاظت کرو۔ جس طرح آگ کا ایک شعلہ عالم کو تباہ کردیتا ہے۔ اس طرح بد کلامی انسان کی عزت و توقیر کو برباد کردیتی ہے۔ کثیر الفہم اور کم سخن رہو تاکہ حالت خاموشی میں سوچ اور فہم اپنا کام کرتے رہیں۔ کھانے سے بے شک تو بھوکا رہے۔ مگر حکمت سے سیر رہنا خاموشی کو اپنا شعار بنا تاکہ زبان شر سے محفوظ رہے۔ بیہودہ گوئی میں انسان غصہ ور بھی زیادہ ہوجاتا ہے۔ اور بد لحاظ بھی غرض کہ جو شر زبان سے پیدا ہوتے ہیں۔ وہ کسی اور شے سے نہیں ہوسکتے۔ کم گو بے شمار مصیبتوں سے محفوظ رہا کرتا ہے ؎

لب خاموش کا دونو جہاں میں بول بالا ہے
وہی محفوظ رہتا ہے کہ جس کے در پہ تالا ہے

یہ تقریر بھی عام فہم تھی۔ اس سے بھی گاؤں کی عورتیں بہت متاثر ہوئیں ان کی جہالت کی وجہ سے فساد جھگڑے ہیں اکثر سنا کرتی تھی مگر اب مجھے ان کی طرف سے کچھ تسلی ہوگئی۔ کیونکہ اب تک کچھ فحش کلامی بہت سی عورتوں کی طبیعت میں تھی۔ یہ تقریر سنکر وہ شرمسار ہونے لگیں اور انہوں نے عہد کیا کہ آئندہ ہم ایسی سب باتوں سے پرہیز کرینگی۔ کیونکہ زیادہ باتوں سے واقعی فساد ہو

جاتے ہیں

اب مجھ سے میری سہیلیاں تقاضا کرنے لگیں۔ میں چونکہ مسلسل تقریر نہیں کر سکتی تھی۔ اس لئے ٹالدینا مناسب سمجھا۔ مگر انہوں نے کہا کہ اپنی خدمتگاروں میں بولنا کوئی بڑی بات نہیں۔ ضرور کچھ کہو۔ میں نے جھجکتے ہوئے سیرۃ نبوی کے ۱۹۸ صفحے پر لکھی ہوئی عبادات نبوی کے کچھ حالات سنانے شروع کئے۔

بہنو! یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ ہمیں اپنے پیارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کس قدر محبت ہے۔ عام مثال ہے کہ "فلاں شخص کو فلاں شخص سے اس قدر محبت ہے کہ وہ اس کا کلمہ پڑھتا ہے۔" میری بہنو! جس کا ہمیں کلمہ پڑھوایا گیا اور ہمارا ایمان سلامت ہوا لہٰذا اس نبی کے حالات سے ہمیں واقف ہونا ضروری ہے۔ ہمارے رسول اکرم نے خداوند کریم کی کس طریقے پر عبادت کی اور کس طرح سے فرمانبرداری کی۔ مندرجہ ذیل آیت سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ عبادت کرنے کا حکم خداوند کریم نے کس طرح دیا ہے۔

فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ وَ اِلٰی رَبِّکَ فَارْغَبْ ۝

"یعنی اے محمدؐ جب تجھے فرصت ملے عبادت کیلئے کھڑا ہو جا۔ اور اپنے رب سے دل لگا۔"

دنیا میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا اور کوئی پیغمبر ایسا نہیں گزرا جس کے متعلق صحیح طور پر یہ معلوم ہو سکے۔ کہ اس کا طریق عبادت کیا تھا؟ اور کون کون سے اوقات اس کے لئے مخصوص تھے۔ اور ان کی عبادتوں کی

نوعیت کیا تھی۔ گذشتہ انبیاءؑ میں حضرت نوحؑ بلکہ آدمؑ سے لیکر حضرت موسیٰؑ تک جن کے حالات توراۃ میں مذکور ہیں۔ ان کی زندگی کا یہ باب صحائف بنی اسرائیل سے قطعاً مفقود ہے۔ انجیل میں حضرت عیسیٰؑ کے متعلق کہیں کہیں صرف اس قدر ملتا ہے کہ وہ کبھی کبھی دعائیں مانگا کرتے تھے۔

ان مذاہب کے پیروؤں نے اپنے پیغمبروں کے ساتھ اسقدر بے اعتنائی کی۔ کہ وہ تمام ضروری امور بھی جن پر دین و شریعت کا دارومدار ہے انہیں محفوظ نہ رکھ سکے! البتہ پیروانِ اسلام کو یہ فخر ہے کہ انہوں نے اول سے آخر تک اپنے پیغمبرؐ کے اوقاتِ عبادت اُس کے طریقے۔ اس کے انواع اس کی کیفیات غرض اسکے ایک ایک حکم کو خوب محفوظ رکھا ہے۔ آنحضرت صلعم نبوت سے پہلے بھی عبادت الہٰی میں مصروف رہتے تھے۔ غارِ حرا میں جاکر مہینوں قیام اور مراقبہ کرتے تھے۔ نماز کا وقت جہاں آجاتا وہیں نماز پڑھ لیا کرتے۔ اکثر پہاڑوں کی گھاٹیوں میں جاکر نماز ادا کیا کرتے تھے۔

پیاری بہنو! نماز ایسی چیز ہے۔ جو کسی صورت میں معاف نہیں ہوسکتی۔ کیسی مصفا اور سہل عبادت ہے۔ بتاؤ تو اس میں کونسی تکلیف محسوس کرتی ہو؟ جب کہ ہم گھر کے کام کاج سخت سے سخت انجام دیں۔ تو بھلا نماز ہمیں کیوں مشکل معلوم ہو۔ قرآنمجید میں باربار نماز کی تاکید لکھی ہے۔ ستر بار فرمایا ہے۔ وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ۔ یعنی نماز پڑھو اور زکوٰۃ دو۔

اول نماز کا حکم ہے۔ بعد میں زکوٰۃ کا۔ نماز ہمارے نبی کریم نے جس محبت سے پڑھی ہے۔ ہمیں بھی اسی طرح نماز سے محبت کرنی چاہیئے۔ یہ

دنیا کے کام تو ختم نہیں ہوں گے مگر ہم ختم ہو جائیں گے۔ ہمارے ساتھ یہ نماز ہی جائے گی۔ نماز کی عادی ہو جاؤ۔ لہذا چند بہنوں نے ہاتھ کھڑے کر کے کہا۔ آج سے ہم نماز میں ہرگز ہرگز ناغہ نہ کریں گی۔ چند عورتیں آگے بڑھیں کہ بی بی صاحبہ آپ کو بھی معلوم ہے اور دریافت کر لیں ہم تو نماز کی عادی ہیں۔ میں نے ان عورتوں کو انعام کے طور پر کچھ چادریں نماز میں اوڑھنے کیلئے دیں اسپر وہ بہت خوش ہوئیں۔ اور پھر چند شعر جو مجھے یاد تھے سنائے جو میرے حسب حال تھے اور کچھ آنے والے وقت کے مطابق میرے ذہن میں تھے۔

محبت سے بنا لیتے ہیں اپنا دوست دشمن کو
جھکاتی ہے ہماری عاجزی سرکش کی گردن کو

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام!
کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے!

ہر گردشِ فلک بہ سرِ انتقام ہے
ہر شام عیش صبحِ الم کا پیام ہے

دل دے تو اس مزاج کا پروردگار دے
جو رنج کی گھڑی کو خوشی سے گذار دے

بشر نے خاک پایا لعل پایا یا گوہر پایا
مزاج اچھا اگر پایا تو سب کچھ اُسنے بھر پایا

اگر قربِ خدا چاہے تو خوش خوئی کو پیدا کر
ترش روئی میں تجھ بس فلاحت مل نہیں سکتی

میرا مطلب ان تقریروں سے گاؤں کی عورتوں کو سدھارنا ہی تھا۔ تاکہ وہ کچھ تمیز سیکھ جائیں۔ کیونکہ ان عورتوں سے مجھے بہت دماغی محنت کرنی پڑتی تھی۔ وہ اکثر میرا نقصان کردیا کرتی تھیں۔ مگر مجھے ان ہی لوگوں سے گزر کرنا پڑتا تھا۔ ان کو سکھانا پڑھانا اور تاک کرنا پڑتا۔ مجھے خوشی ہوئی کہ ان عورتوں اور لڑکیوں کے دل متاثر ہو گئے۔ آخر اس اجتماع کو منتشر کر کے میں نے اپنی مہمانوں کو آرام کرنے کیلئے اپنے غریب خانہ میں رہنے کو کہا۔ چند بہنوں نے تو یہ منظور کرلیا۔ مگر چند ایک نے معذرت کر کے رخصت چاہی۔ میں نے اپنی لینڈ روور تیار کروا کر انہیں اسٹیشن پر بھجوا دیا۔ اور باقی سہیلیوں نے رات کے کھانے سے فراغت حاصل کر کے مراسنوں سے راگ اور راگنیاں سننا شروع کیں۔ میں راگ سننے اور خود گانے کی شوقین تھی۔ اس مشغلہ میں میرا گھر روحانی دلفریبیوں کا مسکن بنا ہوا تھا۔ یا ایک عشرت گاہ تھی۔ جس میں زندگی کی ہر شے ہر وقت مہیا رہتی۔ فیشن پرستی میرا معیار تھا۔ اور دنیا کا ہر کام مجھے خود کرنے کا شوق تھا۔ میری سہیلیوں نے میرا تمام گھر دیکھا۔ میرے ہاتھ کی بنی ہوئی مٹی کی چیزیں دیہاتی طرزِ معاشرت کی اور فیشن ایبل چیزیں جو میرے کمرے کا سنگار تھا۔ دیکھ کر حیرت میں آگئیں۔ اور بار بار کہتیں واہ بی بی تمہارا گھر تو عجائب گھر سے کم نہیں۔ اکثر گاؤں میں جو مہمان آتیں۔ وہ ہماری کوٹھی دیکھنے آیا کرتی تھیں۔ غرض کہ وقت بہت اچھا گزر رہا تھا گویا دن عید اور رات عشرت میں کاہل دسمت الوجود نہ تھی۔ بلکہ طبیعت میں چالاکی، ہوشیاری اور حاضر جوابی تھی۔ خداوند کریم کا بڑا احسان ہے کہ میں نماز کی عادت بھی رکھتی تھی۔ اگرچہ جوانی کے زمانے میں مہینے میں ۲۰

بائیس دن نماز کا موقعہ ملا کرتا تھا۔ مگر میں بے نماز ہو کر پریشان رہا کرتی۔ عبادت وظائف کا بھی مجھے شوق رہتا۔ شرع کی باتیں بزرگوں کی زبانی سننے اور علم حاصل کرنے کی بھی مجھے تمنا رہتی۔ اس کے ساتھ ہی زندہ دلی طبیعت میں بھری ہوئی تھی۔ جب کوئی گھر میں آجاتا تو میں بے حد خوشیاں مناتی اور اس کی خوب خاطر تواضع کرتی۔

میاں قمرالزماں نے کچھ وقت چھٹی کی درخواست پر گزار کر رسالہ کی کمانڈ سے استعفیٰ دے دیا۔ کیونکہ موضع شیخوپورہ میں اس قدر دلچسپی ہو گئی تھی۔ کہ اس جنگل میں منگل نیا کر اب کہیں جانے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ مہاراجہ بلدیو سنگھ صاحب والئے ریاست پونچھ اکثر موسم سرما لاہور مزنگ کے قریب اپنی کوٹھی "پونچھ ہوس" میں گزارا کرتے تھے۔ ان کی رانیاں بھی اسی جگہ رہا کرتی تھیں۔ میاں بخت نصر اور میاں قمرالزماں وقتاً فوقتاً سلام کو جایا کرتے تھے۔ چنانچہ ایک دن میاں قمرالزماں صاحب لاہور سے واپس آئے۔ تو فرمانے لگے "آج تمہیں نئی خبر سناؤں؛ پرسوں ہمارے راجہ صاحب یہاں شیخوپورہ میں تشریف لائیں گے۔" میں اس خبر سے بہت خوش ہوئی۔

میں "کیسے تشریف لا رہے ہیں؟"

میاں قمرالزماں "شکار کے لئے! میدانی علاقہ جو یہاں سے ۱۵ میل کے فاصلہ پر ہے وہاں جائیں گے! لہذا اس موقعہ کو غنیمت سمجھ کر میں نے مہاراجہ کی خدمت میں عرض کی کہ میرے غریب خانہ پر صبح کی چائے نوش فرما کر اسی راستہ سے تشریف لے جائیں۔ تو مجھے بہت خوشی ہوگی۔ چنانچہ انہوں نے منظور کر لیا ہے اب مجھے کل پھر لاہور جانا ہے۔ تاکہ مہاراجہ صاحب کے واسطے کچھ پھل وغیرہ خرید

لاؤں۔ تم پھاٹک سجا رکھنا۔ مالی اور باغ کے ملازم لوگوں سے پھول اور پتوں کا خوبصورت دروازہ بنوا لینا۔ میں نے باجے والے بھی بلوائے ہیں۔ وہ سلامی کے لئے پھاٹک پر موجود ہونگے۔ کوٹھی کی صفائی کرا لینا۔ اور چوک میں فرش کرکے ایک سو چنگیروں میں رنگ دار کاغذ لگا کر پھل سجا رکھنا۔ اور تم خود دیوان خانہ کے پیچھے جو مکان ہے۔ اس میں چلی جانا۔ کوٹھی میں کوئی زائد سامان نہ رہے۔ میں چیزیں بھیجدونگا۔ اور خود مہاراجہ صاحب کے ساتھ آؤنگا۔ خوش آمدید اور استقبالیہ شعر پھاٹک پر اور کوٹھی کے سامنے لگوا دینا۔ یہ ہدایات کرکے وہ تو لاہور چلے گئے۔ مجھے ایک تو راجہ صاحب کی تشریف آوری کی خوشی اور اس پر اہتمام شاہانہ۔ میں نے وہ دن اور رات ایک کر دئے۔ سب چیز درست کروائیں۔ مزید سامان لاہور سے آ گیا تھا۔ بے شمار خشک و تر میوجات سب خوبی سے سجا کر صحن چمن میں لگا دئے گئے۔ پھاٹک پھولوں کی کثرت سے چمن زار بن گیا۔ ہندو باورچی چائے تیار کرنے لگے اور مسلمان اہل کار جو راجہ صاحب کے ہمرکاب تھے۔ ان کے لئے بھی کھانے کا انتظام کیا گیا۔ میرے والدین بھی اتفاق سے میرے پاس تشریف لائے ہوئے تھے۔ وہ میرے حسنِ انتظام پر پھولے نہ سمائے۔

غرضکہ سب سامان درست کرنے کے بعد مجھے راجہ صاحب کو تشریف لاتے ہوئے دیکھنے کا شوق پیدا ہُوا۔ عورتیں بہت سی چھتوں پر راجہ صاحب کو دیکھنے کیلئے چڑھ گئیں۔ میں بھی اُن عورتوں کا سا لباس پہنکر سر پر سُرخ پھولکاری اوڑھ کر انھیں کے پاس کھڑی ہوگئی۔ میرے دل میں خوشی اور مسرت لہریں لے رہی تھی جب دل میں راحت ہوتی ہے۔ تو چاروں طرف خوشی ہی خوشی دکھائی دیتی ہے۔

تمام دنیا مجھے مسکراتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ سورج کی شعاعیں قہقہے لگاتی تھیں ہوا کی سرسراہٹ میں ایک ترنم تھا۔ میرے بشاش دل میں ایک گدگدی سی پیدا ہو رہی تھی۔ عین سامنے کی طرف سے راجہ صاحب کی سواری نظر آئی۔ بہت سے سوار۔ گھوڑوں پر ان کے چاروں طرف تھے۔ خوش آمدید کی صدائیں بلند نعروں میں سنائی دینے لگیں۔ لنڈو گاڑی میں میاں قمرالزماں و میاں بخت نصر صاحب کیطرف اور میاں فرخ سیر سامنے کی جانب تھے۔ آہستہ آہستہ سواری پھاٹک کے قریب آ گئی۔ گاؤں کے لوگ جو با ادب ایک قطار میں کھڑے تھے سب نے سلام کیا اور ادب سے سر جھکا دئے۔ یہ طریقہ ان کو ایک ملازم نے سکھایا تھا۔ مگر ان لوگوں نے اچھی طرح سے ادا کیا۔ قمرالزماں کا چہرہ انہیں دیکھ کر بشاش ہو رہا تھا۔ باجے والوں نے بھی بینڈ بجایا۔ خوش آمدید زندہ باد کے نعرے لگائے۔ راجہ صاحب باغ میں داخل ہوئے۔ اور آہستہ آہستہ قدم رکھتے ہوئے اپنے وزیرزادوں کے ساتھ آئے۔ کوٹھی میں اگربتیاں سلگائی ہوئی تھیں۔ پہلے سے ہی خاص آدمی ہاتھ میں گلاب پاش لئے کھڑے تھے۔ جونہی انہوں نے برآمدے میں قدم رکھا۔ ہمارے ملازم منشی رام نے خاص پھولوں کا ہار جو نہایت خوبصورتی سے تیار کیا ہوا تھا۔ اور دیگر ہار سب کے سب پیش کئے۔ میاں بخت نصر صاحب نے وہ بڑا ہار مہاراجہ صاحب کے گلے میں پہنایا۔ اور باقی جتنے اہلکار ساتھ تھے۔ ان کو پہنائے راجہ صاحب نے چند منٹ گلے میں ہار رکھ کر میاں قمرالزماں کے گلے میں ڈال دیا۔ میاں قمرالزماں نے ادب سے سر جھکا کر شکریہ ادا کیا۔ اس کے بعد خاص

کمرے میں آبیٹھے۔ پھر کھانے والے کمرے میں جاکر چائے پی۔ اس کے بعد صحنِ چمن کی طرف نکل گئے۔

پھلوں پر نظر کی اور میاں قمر الزماں کی طرف متوجہ ہو کر کہا

راجہ۔ بھلا اس کی کیا ضرورت تھی؟

میاں قمر الزماں۔ اس خوشی سے بڑھ کر اور کون سی خوشی ہو سکتی ہے۔ کہ آپ اس وقت میرے غریب خانہ پر قدم رنجہ فرماہیں۔ میں جو کچھ اس خوشی میں اظہارِ خوشنودی کروں کم ہے۔

وہ گفتگو کرنے کے بعد باہر تشریف لے گئے۔ اور ایک ملازم کو حکم دیا۔ کہ پانچ پھلوں کے چنگیر اُٹھا کر ساتھ رکھدو۔ کیونکہ راجہ صاحب کی روانگی کا وقت تھا۔ مہاراجہ صاحب باغ میں ایک چکر لگا کر پھاٹک کی طرف آئے۔ تمام گاؤں کے لوگ ویسے ہی کھڑے تھے۔ ہمارے ملازم سب کام باادب طریقہ سے کرتے رہے۔ راجہ صاحب نے سوار ہوتے وقت ہمارے ملازموں کو یکصد روپیہ انعام دیا۔ جو میاں قمر الزماں نے ادب سے واپس کرنے کا تقاضا کیا۔ مگر راجہ صاحب نے جہاں ہمارے ملازم کھڑے تھے۔ ان کی طرف نوٹ پھینک دیا۔ اور گاؤں کے لوگوں کو ہاتھ کے اشارہ سے سلام کرتے ہوئے روانہ ہو گئے۔ یہ وقت اس خوبی سے گزرا۔ کہ سبحان اللہ آمد کی رونق اور جانے کی خوبی۔ اس پر راجہ صاحب کی مشفقانہ نگاہوں نے ہر چیز کو محبت سے پسند کیا۔ ان کی غریب نوازی اور حلیم طبع اور ذرہ پروری سے سب دیکھنے والوں کے دل بشاش ہو گئے۔ نوکر لوگ ان کی نوازش سے خوش ہو کر اپنے اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔ میں کثرتِ کام کی وجہ سے تھک کر چُور

ہو چکی تھی۔ سب سامان ملازموں سے درست کروا کر ڈھکانے پر رکھوا دیا۔ اور وہ تمام پھل جو بچ رہے تھے۔ گاؤں میں تقسیم کر دئے۔

جب میاں قمرالزماں صاحب راجہ صاحب کے ساتھ شکار کھیل کر واپس آئے۔ اُن کا بھی دل بہت خوش تھا۔ اور میرے انتظام پر بھی خوش ہوئے۔

ایک دن پھر میاں قمرالزماں لاہور تشریف لے گئے۔ ایک اور پیغام لائے "کہ تم لاہور چلو۔ میاں بخت نصر صاحب کی نئی دلہن کو پشاور سے لینے جانا ہے" چنانچہ میں لاہور چلی گئی۔ وہاں زیب النسا حج سے تشریف لا چکی تھیں۔ انہوں نے گھر کا تمام انتظام میرے سپرد کر دیا۔ کہ نئی دلہن آنے والی ہے۔ تم جانو۔ اس اہتمام کی مجھے واقفیت نہیں۔ میاں بخت نصر صاحب تشریف لائے۔ مجھے جو کام کہنا تھا کہا۔ اور فرمایا کہ پرسوں صبح گیارہ بجے کا کھانا تیار کر دار کھنا۔ ہم پشاور سے واپس آویں گے۔ اب دولہن کو لینے کے لئے چند معززین میاں بخت نصر صاحب کے ساتھ گئے۔ میاں غلام صمدانی صاحب ٹھیکیدار ملٹن بہت امیر کبیر آدمی تھے اور شریعت کے پابند تھے۔ انہوں نے لڑکی کو شرعی طریقہ سے رخصت کیا۔ حسب توفیق جہیز بھی اچھا دیا۔ وقت مقررہ پر میں میاں بخت نصر صاحب اور نئی دلہن کا انتظار کر رہی تھی۔ کہ ایک رقعہ مجھے بیگم کلاں میاں بخت نصر صاحب یعنی اختر النسا کا ملا۔ "کہ تم نئی دولہن یعنی اپنے بھائی کی چہیتی بیوی کا انتظار کرتے ہوئے خوشیاں منا رہی ہو۔ مگر میرے حال کی خبر صرف خدا کو ہے۔ تم مصروف راحت ہو۔ میں مبتلائے آلام" مجھے اس رقعہ سے کچھ رنج سا پیدا ہوا۔ میں نے جواب لکھ دیا "کہ ہمشیرہ صاحبہ خدا کو یہ ہی منظور تھا۔ کہ آپ برطرف ہو جائیں

کیونکہ اس نوشتۂ تقدیر میں کوئی چوں چرا نہیں ہو سکتی۔ مجھے آپ کے علیحدہ ہونے کا اگرچہ بے حد رنج ہو رہا ہے۔ مگر کیا کر سکتی ہوں۔

میاں قمر الزماں صاحب نے جہاں تک ممکن تھا۔ زور لگایا۔ بھائی صاحب کو ہر چند سمجھایا۔ مگر انہوں نے اظہار نفرت کیا۔ وہ آپ کا کوئی قصور نہیں بتاتے بلکہ آپ کی عقلمندی کی تعریف کیا کرتے ہیں۔ آپ صبر سے کام لیجئے۔ کیونکہ آپ ان کی بیگم ہیں۔ اگر اُن کے زیرِ سایہ وقت گزاریں گی۔ تو وہ آپ کو کسی بات سے تنگ نہ ہونے دیں گے۔ کیونکہ خود بھی میاں بخت نصر صاحب فرماتے ہیں کہ میں حق تلفی ہرگز نہیں کر سکتا۔ خرچ باقاعدہ ملتا رہے گا۔ میں اگر موقع ملا تو کسی وقت ملوں گی۔ یہ جواب لکھ کر میں نے اپنی ملازمہ کو دے دیا۔ اتنے میں دلہن کی سواری دروازے پر آ گئی۔

میں آگے بڑھی تو دولہن کی خدمتگاریں دولہن کو صحن میں لے آئیں۔ میں نے دروازے پر اندر داخل ہونے کے وقت دولہن کو پھولوں کا ہار پہنایا اور بسم اللہ کہہ کر مسند پر بٹھایا۔ ادھر سے مہر النسا بیگم بھی تشریف لے آئیں۔ دولہن کو سلامی دی۔ رونمائی کی رسم ادا کر کے جہیز دیکھا گیا۔ ہر ایک چیز بیش قیمت تھی۔

دلہن بھی نہایت خوبصورت سنگ مرمر کی پتلی۔ میری ہم عمر۔ بہت خوش اخلاق تھی۔ بہت جلد میرے ساتھ مانوس اور میاں بخت نصر صاحب کی بھی منظورِ نظر ہو گئی۔ ہم نے شکر کیا۔ کہ میاں بخت نصر صاحب کو بھی حسب منشا بیوی مل گئی۔ اب وہ دن رات خوش رہا کرتے تھے۔ بیوی کا نام آصف جہاں تھا

از حد سلیقہ شعار نیک چلن بیگم تھی ۔ خدا خدا کر کے امید کی صورت بھی ہو گئی
ایک بچی اللہ نے دی ۔ گھر میں کوئی بچہ نہ ہونے کی وجہ سے ہم سب کو بہت شوق
تھا ۔ ننھی کا نام سعیدہ سلطانہ رکھا گیا ۔ وہ چچا کی نور دیدہ تھی ۔ میاں بخت نصر
بھی اُسے بے حد پیار کرنے ۔ اور ہر وقت پیش نظر رکھتے ۔ بچی کی پیدائش کے کچھ عرصہ
بعد ہی جہاں آرا بیگم کے بچے کی رسم ختنہ تھی ۔ آصف جہاں اور میں وہاں پہنچیں ۔
جہاں نواب والا گوہر کا اپنا قصبہ راولپنڈی اور پشاور کے عین درمیان واقع تھا ۔
وہاں جانے اور اس تقریب میں شامل ہونے کی زیادہ خوشی مجھے ہی تھی ۔ کیونکہ
مجھے اپنی سہیلیوں کے ملنے ۔ اور شغل میں حصّہ لینے کا بے حد شوق تھا ۔ میں نے
خوب بناؤ سنگار کیا ۔ میرا دل جذبۂ شوق سے پُر تھا ۔ نوجوانی کا زمانہ دل میں نئی ملاقاتوں
اور رشتہ داروں کے دیکھنے کا اشتیاق ۔ ان مسرتوں سے میرا دل عشرت گاہ
بنا ہوُا تھا ۔ ان کے ہاں یہ دستور تھا ۔ کہ جب کسی تقریب یا شادی پر نواب
صاحب کے گھر میں مہمان آتے ۔ تو مراسنیں استقبال کرتی تھیں اور ان کے
ہاتھوں میں جھنجھنا تے ساز ہوُا کرتے تھے ۔ وہ چھم چھم کرتی شور مچاتی ہوئیں دروازے
پر سے لیجاتیں ۔ لہذا ہمیں بھی اسی طریقہ سے لینے آئیں ۔ جب ہم اُن کے ساتھ
صحن میں پہنچیں تو وہاں جا کر میرا دل پریشان ہو گیا ۔ کیونکہ میری پھوپھی صاحبہ تھیں اور
نہ ان کی بیٹی ۔

فرخندہ اختر کا بھی تین برس سے انتقال ہو چکا تھا ۔ ان دونو مرحومہ خواتین
کی یاد سے میری طبیعت بے چین ہو گئی ۔ وہاں کی بیگمات جو مجھے جانتی تھیں
اور نواب والا گوہر صاحب کی پھوپھی جان فرخ تاج سے پہلے کی بیبیاں تھیں ۔ وہ

مجھے بے حد شفقت و محبت سے ملیں۔ اور ساتھ ہی یہ کلمہ بھی افسوسناک لہجہ میں کہا۔ کہ آج تمہارے پھوپھا ہوتے۔ بہن ہوتی۔ تو کس قدر خوش ہوتیں۔" مجھے ان فقروں کے سننے سے اور بھی اُن کی یاد تازہ ہوگئی۔ مگر وہ خوشی کا مقام تھا۔ میں نے اپنی رنجیدگی کو کسی پر ظاہر نہ ہونے دیا۔ مراسنیں شور مچا کر گا رہی تھیں۔ شادیانے بجتے تھے۔ صحن برج میں ہمارے رہنے کا انتظام ہو گیا۔ یہ صحن بھی نواب صاحب کے وقت کا تعمیر شدہ تھا۔ میموں حیات جہاں آرا کے بیٹے کے ختنہ کی خوشی میں سہرا بندی کی رسم ادا ہوئی۔ اور سب برادری کی عورتیں سہرا بندی کے بعد اس قصبہ کے میدان میں چلی گئیں۔ آگے آگے تمام مراسنیں بدستور چھم چھم کرتی گاتی جاتی تھیں۔ ایک میدان میں کنواں آیا۔ اس میں سے ایک سہاگن نے پانی بھرا اور نواب والا گوہر کی خاندانی کنبہ داروں نے رسم ادا کر کے خاص خوشی منائی۔ جسے وہ جھومر کہتے ہیں۔ مراسنیں کھڑی ہو کر گلے میں ڈھولک ڈالے بجائے جاتی تھیں۔ اور تمام جوان بہو بیٹیاں چکر لگاتیں اور قدم آگے پیچھے رکھتے ہوئے ایک ادا سے چکر کاٹتے ہوئے گول ہو جاتیں۔ ان کے دوپٹوں کی کناری، اور لچکے اور سلمہ ستارہ کی چمک بے حد چکا چوند پیدا کر رہی تھی۔ گویا پریوں کا جھنڈ تھا۔ دیر تک یہ منظر گرم رہا۔ پھر اسی طرح گاتی بجاتی صحن برج کے اندر محل میں آگئیں۔ سب نے کھانا کھایا جس میں کئی قسم کے حلوے تھے زعفرانی رنگ کا حلوہ۔ سبز رنگ کا۔ شہابی رنگ کا۔ کچھ امرتسر کی عورتیں بھی تھیں وہ دسترخوان پر حلوے دیکھ کر ہنس پڑیں۔ کہ شادی کی تقریب میں یہ کیا؟ نواب صاحب کی لڑکی جو پہلی بیوی سے تھی۔ اُس نے کہا ہمارے ہاں شادی میں یہ دستور

ہوتا ہے۔ کہ کھانے کے ساتھ حلوے ضرور کھلائے جاتے ہیں۔ امرتسر کی
مہمان پھر بھی مذاق بازی کرتی گئیں۔ رات کو مردانہ محفل دیکھی۔ جو صحن برج کی دیوار
کے نیچے ایک میدان میں تھی۔ تمام مردانہ سامان آراستہ تھا۔ ہم کھڑکیوں میں
سے دیکھ رہی تھیں۔ بڑے بڑے امیر "ٹوانے" عمر حیات وغیرہ نواب صاحب
کے لڑکوں کے پاس میموں حیات کی تقریب سعید پر مہمان آئے ہوئے تھے۔
ان کے سامنے طوائفوں کے مجرے ہو رہے تھے۔ ایک طوائف گانا ختم
کرتی تو دوسری آجاتی۔ بہت اچھا ناچ اور گانا ہوتا رہا۔ سننے والے دس
دس روپے طوائفوں کو دے رہے تھے۔

آخر جب گانا ختم ہوا تو نواب صاحب کے کنبہ کے مرد بھی اسی طرح مل کر
جھومر کی شکل میں سب کے سب چکر کاٹنے لگے۔ درمیان میں ایک ڈھولک
بجانے والا کھڑا تھا۔ سارے ایک آواز اور ایک ادا سے چکر لگاتے تھے خوب
ہی منظر تھا۔ غرضیکہ یہ شغل تمام رات ہی ہوتا رہا۔ صبح پھر آراستہ پیراستہ ہو گئے
بے شمار مراسنیں کوئی لاہور کی کوئی پشاور کی کوئی اسی جگہ کی غرض کہ کئی ٹولیاں
شام تک گاتی رہیں۔ جب تقریب ختم ہوئی۔ تو سب مہمان اپنے اپنے گھروں کو
لوٹ گئے۔ اور میں بھی اپنے گھر پہنچکر خوشی و مسرت کی زندگی بسر کرنے لگی۔ مگر اب مجھے
یہ بہت شوق تھا۔ کہ میری نانی اماں میرا گھر دیکھیں۔ چنانچہ وہ میرے گھر آئیں۔
میرے نوکروں کو نانی اماں نے انعام دئے اور میرے گھر میں حضرت علی مولا مشکلکشا
کی نیاز پکا کر ختم دلوایا۔ نانی اماں نے کہا۔

بیٹی یہ منت میری مانی ہوئی تھی۔ کہ تم اپنے گھر آباد ہو۔ تو میں دیکھوں۔ اور

نیاز ادا کروں"۔ نیاز سے فارغ ہو کر چند دن مسرت و خوشی سے گزرتے رہے
ایک دن تیسرے پہر کے وقت نانی اماں کو کچھ بخار سا ہو گیا۔ میں نے پریشان
ہو کر پوچھا۔ نانی اماں آپ کی طبیعت کیسے خراب ہو گئی؟

نانی اماں۔ بیٹی میرا وقت قریب آگیا ہے۔ بڑی مشکل ہے۔

میں نے یہ سنکر رونا چیخنا شروع کر دیا۔ چنانچہ ابّا جان بھی باہر سے آگئے
نانی اماں کو دیکھتے اور مجھے دلاسا دیتے رہے۔ والدہ صاحبہ بھی متفکر سی ہو
گئیں۔ اس پریشانی میں نانی امّاں دفعتاً کلمہ شہادت کہکر رخصت ہوگئیں۔ میرے
لئے وہ وقت قیامت صغرا بن گیا۔ میں نے کسی کی نہ موت دیکھی تھی اور نہ ہی
کسی کو مرتے دیکھا تھا۔ لہذا میں نیم پاگل ہو گئی۔

والد صاحب نانی امّاں کا جنازہ اپنے وطن لے جانے کی تیاری کرنے لگے۔
مگر میں نے ان کو روکنا چاہا۔ آخر قمر الزماں صاحب نے ہماری جنگ کا فیصلہ
کر دیا کہ یہاں ہی اس بزرگوار شہزادی کا خمیر تھا۔ تمام عمر ستّر برس گذار کر یہاں
دم رخصت کیا۔ بہتر ہے یہیں دفن کیا جاوے۔ اس پر وہ بھی کچھ اصرار کے
بعد رضا مند ہو گئے۔ نانی اماں کو غسل دیا گیا۔ اور میں نے اپنی کوٹھی کے
سامنے قبر کی جگہ تجویز کی۔ اس وقت ہمارے باغ میں گلاب کے پھول بے حد
تھے۔ پھولوں میں بھر پور جنازہ قبر میں رکھدیا گیا۔ میرے والد صاحب نے خزانہ
میں موت کی اطلاع دی اور چند دنوں بعد نانی صاحبہ کی تنخواہ گورنمنٹ کے خزانہ
سے ۱۷ روپے ۳ آنے ایک پائی آخری وقت کے حساب تک ہمیں مل گئی۔ اس
دن مجھے اور میرے والدین کو سخت صدمہ ہوا۔ میرے لئے یہ رنج کئی مہینوں

کیلئے کافی ہوگیا۔ مگر عمر کا تقاضا اور دل خوش تھا۔ کوئی خاص فکر کی بات نہ تھی۔ رفتہ رفتہ صبر آگیا جس وقت نانی اماں کی یاد آتی۔ قبر پر جا کر قرآن مجید پڑھا کرتی تھی۔ اور ہر روز صبح کوٹھی کی چھت پر سے سامنے قبر پر فاتحہ پڑھ دیا کرتی تھی۔ مگر اُنکا شفقت اور مہربانی سے پرورش کرنا مجھے بھولنے والی بات نہ تھی۔

آخر دنیا میں وقت یکساں نہیں رہا کرتا۔ مگر یاد بھی ایک ایسی چیز ہے جو اگر سچی تڑپ رکھتی ہو تو مرتے دم تک نہیں بھول سکتی۔ خدا مغفرت کرے ایسے نیک بندوں کو۔ آمین!

مجھے کتابوں کے مطالعہ کا شوق زیادہ تھا۔ کیونکہ گھر کے لئے آرائشی چیزیں تو سب مہیا اور کل سامان مکمل ہو چکا تھا۔ کپڑے سینے کے لئے درزی ملازم رکھ لیا گیا۔ مجھے صرف گھر کی نگرانی کا کام تھا۔ اس صورت میں اکثر میں کتابیں اور رسالے دیکھا کرتی تھی۔ مجھے یہ شوق پیدا ہوگیا۔ کہ میں کوئی مضمون لکھوں یا کسی تقریر میں حصہ لوں یا کوئی کہانی لکھوں۔ مگر اس تھوڑی سی تعلیم کے باوجود مجھے تعلیم کی نمائش کا از حد خیال پیدا ہو رہا تھا۔ مگر اس زمانے میں تو تحریر کو بھی پردہ۔ آواز کو بھی پردہ۔ نام لکھنے کا بھی حجرہ تھا۔ ان پابندیوں میں مقید رہ کر دل میں اک جوش سا پیدا ہوتا۔ اور پھر وہاں ہی رہ جاتا۔ نہ کوئی سوسائٹی اور نہ کوئی اُستاد جس سے کچھ سیکھتی۔ یا کوئی نیا کام کرتی۔ کبھی کبھی لاہور جانے کا اتفاق ہوتا۔ تو کئی بہنوں سے ملاقات ہوتی وہ میری دلدادہ ہو جاتی تھیں۔ ابتک مجھے یاد ہے کہ خجستہ خصال کی شادی کی تقریب سعید میں آپا جہاں آرا بیگم کی خوش اخلاقی سے لاہور کی بہت سی بیگمات تشریف لائی ہوئی تھیں بیگم سر شفیع صاحبہ بیگم سر عبدالقادر صاحب۔ بیگم

سر فضل حسین صاحب۔ بیگم لفٹننٹ عمر حیات صاحب۔ چنانچہ ان سب بیگمات سے میری اچھی خاصی واقفیت ہوگئی۔ بیگم عمر حیات صاحب جو سر عبد القادر صاحب کی خالہ زاد بہن تھی۔ اس سے تو بہت محبت ہوگئی۔ وہ میرے ساتھ اتنی محبت سے پیش آئیں کہ انہوں نے میرے ساتھ خط و کتابت کی رسم بھی جاری کرلی۔ ایک لڑکی سید محمد شاہ پلیڈر جو انجمن خاتونِ اسلام کی سکرٹری تھی۔ اس سے بے حد مراسم بڑھے اور انتہا کی محبت ہوگئی۔ محبوب عالم صاحب مالک پیسہ اخبار کی دختر فاطمہ بیگم صاحبہ۔ احمد حسن بیرسٹر صاحب کی بیگم سے بھی ایسے ہی مراسم تھے جبتک میرا ستارہ یاور تھا۔ میرا نوشتہ چمکتا رہا۔ میری شکل و شباہت میں کشش۔ میرا تخیل زبردست تھا۔ بڑے گھرانوں کی عورتیں اور لڑکیاں فوراً مجھ سے مراسم بڑھا لیتیں۔ میرا اعلیٰ درجہ کا لباس اور جواہرات کا زیور۔ اس پر پہننے کا انداز۔ غرضیکہ جو کوئی دیکھتا پسند کرتا۔ چاروں طرف شہرہ تھا۔ بہت سی خواتین میری خوش بختی پر رشک کھاتیں۔ کئی بہنیں میرے گھونگریالے بالوں کی دلدادہ تھیں۔ وہ مشین اور سلائیوں سے بالوں میں گھونگر ڈالتیں۔ اور میرے بالوں پر رشک کھاتیں میں بفضلِ خدا بد ماغی سے نفرت کیا کرتی۔ سب سے ہنستے کھیلتے وقت گزار دیتی۔ میں اپنی سہیلیوں، بہنوں کے لئے کشتِ زعفران بنی ہوئی تھی۔ نئے نئے شوق سوجھا کرتے۔ تنہائی میں بھی اپنی تفریح کا سامان اور اپنی ہمجولی بہنوں اور سہیلیوں میں بھی شغل کی بانی مبانی رہا کرتی تھی۔ کنبہ والے مرد عورتیں مجھ پر نہایت مہربان تھے۔ نہ کوئی میرا نقص یعنی عیب نکلتا۔ اور نہ کوئی مجھے نفرت کی نگاہ سے دیکھتا۔ ہر دلعزیز۔ جس جگہ اور جس محفل میں جاتی سب کی توجہ میری طرف ہو جایا کرتی تھی۔

خداوند کریم کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میرا دل بخل۔ نخوت۔ غرور اور غیبت جیسی برائیوں پر آمادہ نہ ہوتا۔ سب کی تابعداری اور سب کی عزت کرنا اپنا فرض سمجھ رکھا تھا کیونکہ میرے ضمیر نے محسوس کر لیا تھا کہ یہ خوشیاں چند روزہ ہیں۔ زیادہ دیر تک رہنے والی نہیں ہے "ہر کمالے را زوال" ایک یقینی امر ہے۔

میری طبیعت میں انکساری کا جذبہ تھا۔ میں خیال کیا کرتی تھی۔ کہ میں ایک گناہگار ہستی۔ ایک ناکارہ انسان اور دنیا کی خاک پا ہوں۔ جان بوجھ کر میں نے کبھی نخوت غرور نہیں کیا۔ ہاں انسانی تخیل کی برگشتہ حالت میں شاید کسی وقت رنجیدہ ہو کر کسی کو کچھ کہا۔ یا ہو۔ یا ایسا سلوک کیا ہو۔ تو اور بات ہے۔ مگر نہ کسی نے مجھے اذیت پہنچائی اور نہ میری کسی سے دشمنی ہوئی۔ بہر حال بہت سی ذی شعور سہیلیاں میری گرویدہ اخلاص تھیں۔

میری نند صاحبہ جہاں آرا بیگم کو میری گود میں بچہ دیکھنے کی ہر وقت آرزو رہتی تھی۔ وہ جگہ جگہ بزرگان دین کے مزاروں پر منتیں مانا کرتیں۔ اور جہاں کہیں کسی پیر یا فقیر کامل کا سن لیتیں میرے لئے اولاد کی تمنا کیا کرتی تھیں۔ خواجہ اجمیر شریف کے بزرگ حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمت اللہ علیہ کی زیارت کا ان دنوں بیحد شوق تھا۔ مجھے بھی ان کی زبانی سن سنا کر ایک امنگ پیدا ہو گئی۔ اور میں نے میاں قمر الزماں صاحب سے کہا کہ میرا دل چاہتا ہے۔ کہ اجمیر شریف جاؤں۔ انہوں نے کہا۔ کہ اچھا فصل کی کٹائی کے بعد چلیں گے۔ چنانچہ فصل کی کٹائی کے بعد موسم گرما آ گیا۔ یہ پہاڑی لوگ تھے۔ فوراً پہاڑ پر چلے گئے۔ کچھ عرصہ گزر جانے پر پھر مجھے شوق پیدا ہوا۔ بلکہ دل میں ایک دھن سی لگ گئی۔ ایک بزرگ

نے مجھے ایک وظیفہ بھی بتا دیا جو حضرت خواجہ معین الدین رحمت اللہ علیہ کی شان میں پڑھا جاتا تھا۔ اور ان کا وسیلہ درمیان کر کے جو التجا کی جاتی۔ وہ مراد پوری ہو جاتی۔ غرض کہ اس شادماں زندگی میں بھی جب اولاد کی خواہش سے میرا دل کسی کسی وقت سوچ بچار میں پڑ جایا کرتا تھا۔ تو میں ایک فکر میں غوطہ زن ہو جاتی۔ گھر کی رونق۔ حکومت و عزت کو دیکھ کر سب لوگ میرے واسطے دلی توجہ سے دعا کیا کرتے۔ اولاد کے لئے بڑے بڑے بزرگ مجھے تعویذ بنا کر دیتے۔ مگر بے فائدہ اور سب کچھ بے اثر تھا۔

ایک دن ایک لیڈی ڈاکٹر نے میرا ملاحظہ کر کے مجھ سے دریافت کیا "تمہاری شادی کو کتنے برس ہوئے"؟

میں نے کہا "چھ برس!"

لیڈی ڈاکٹر۔ اس عرصہ میں کوئی اولاد نہیں ہوئی؟

میں۔ صرف ایک دفعہ تین ماہ کا اسقاط ہو گیا تھا۔ جس کے بعد دیر تک بیمار رہی۔ مگر اب تو بالکل تندرست ہوں۔ مجھے کوئی تکلیف نہیں۔

لیڈی ڈاکٹر۔ تکلیف نہ ہو گی۔ مگر ابھی نقص باقی ہے۔ اگر پیٹ کا اپریشن کروالو۔ تو یقیناً بامراد ہو جاؤ گی۔

یہ سنتے ہی میں خوف زدہ ہو کر خاموش ہو گئی۔ مگر کسی پر اپنی پریشانی کو ظاہر نہ کیا۔ بلکہ حسب دستور آرام و آسائش کی زندگی بسر کرتی رہی۔ کچھ عرصہ کے بعد میں اپنے والدین کے ہاں چلی گئی۔ کیونکہ میری طبیعت کچھ پراگندہ اور پریشان حال رہنے لگی تھی۔

میرے والدین کو میرے وطن میں آنے کا بے حد انتظار تھا۔ انہیں ہمیشہ ہی خوشی ہوا کرتی تھی۔ اور اکثر کام میرے انتظار میں اٹکے رہتے۔ اور کئی جگہ کی آمد و رفت بھی ملتوی کر دی جایا کرتی تھی۔ کہ جب ہماری بچی آوے گی۔ تو یہ کام اس کی موجودگی میں ہوگا۔ میرا اپنے والدین کے گھر جانا بھی گویا کسی حاکم کی آمد سے کم نہ ہوتا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا۔ کہ تمام شہر میری خوشی میں مخمور ہے۔ جو کوئی سنتا۔ مجھے ملنے چلا آتا۔ میرے والدین کے ملنے ملانے والوں کا تانتا لگا رہتا۔ ہماری پرانی ملازمہ جس کا نام عظیمن تھا۔ وہ شہر میں کسی اور جگہ ملازم تھی۔ میں نے اس کے متعلق دریافت کیا۔ تو والدہ صاحبہ نے بلا بھیجا۔ چنانچہ وہ مجھے ملنے آئی۔ اور اس نے جاکر اپنی بی بی جس کے پاس وہ ملازمہ تھی۔ میری تعریف کی۔ اس خاتون کے دل میں بھی میری ملاقات کا شوق پیدا ہوا۔ جب وہ مجھے ملنے آئیں تو میں نے بھی بڑے تپاک سے انکا خیر مقدم کیا۔ رفتہ رفتہ یہ سلسلہ محبت بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ میاں قمرالزماں صاحب بھی ان کی محبت اور اخلاص کے دلدادہ ہو گئے۔ ہم عورتوں کے علاوہ مردوں کا بھی آپس میں اس قدر خلوص بڑھا کہ ایک دوسرے کے شیدائی بن گئے۔ میں جب کبھی والدین کے پاس آتی تھی۔ وہ میری عزیز سہیلی بے حد خوش ہوتی۔ وہ مجھے نئی نئی چیزیں اور اعلےٰ اعلےٰ درجہ کے تحفے دیا کرتی تھی۔ میں بھی کچھ ایسی ہی سوغاتیں ان کے واسطے لایا کرتی تھی۔ ایک دفعہ انہوں نے ہمیں کھانے پر بلایا۔ میاں قمرالزماں اور میں دونو سر شام تیار ہو کر اُن کے گھر پہنچے میری سہیلی کا نام نشاط افزا تھا۔ ہماری خاطر مدارات میں انہوں نے کوئی دقیقہ باقی نہ رکھا۔ دلی تمنا اور دلی شوق سے انہوں نے ہماری تواضع کی۔ ان کی

ہر ادا سے محبت کا ثبوت ملتا تھا۔ ہم سب کی طبیعت اس شعر کے مطابق تھی۔

ے دشمن بھی ہو تو دوستی سے پیش آئیں ہم
بیگانگی سے اپنا نہیں آشنا مزاج

ایک وسیع دسترخوان پر تکلف کھانوں سے پُر تھا۔ اور تمام کنبہ کی عورتیں جمع تھیں۔ باہر مردوں میں بھی یہی سلسلہ انتظام تھا۔ دونوں طرف سے کھانے میں خوب دل لگی اور بذاق کی باتیں ہوتی رہیں۔ نشاط افزا کے میاں بھی پرلے درجہ کے خوش خلق اور خوش مزاج تھے۔ نشاط افزا کی چند سہیلیاں بھی کھانے میں شامل تھیں۔ بڑے لطف سے سب نے کھانا کھایا۔ نشاط افزا کی ایک بہن نہایت چلبلے مزاج کی تھی۔ اس کا نام زہرا جبیں تھا۔ نشاط افزا نے فرمائش کی۔ کہ تمہاری آواز بہت سُریلی ہے۔ میری بہن گانا سننے کی شائق ہیں۔ کوئی غزل تو سناؤ زہرا جبیں نے شرماتے ہوئے بہت اچھے لہجے میں ایک غزل سنائی جس کے مصرعے دلکش تھے۔ الفت کی شعاعیں گرمی کی شعاعوں کی طرح میرے دل پر اثر کر رہی تھیں۔ باہر مردانے سے بھی آوازیں آنے لگیں۔ کیونکہ وہاں بہت سے گویّے ملائے گئے تھے۔ ہم سب عورتوں نے ڈرائنگ روم کے قریب بیٹھ کر سننا شروع کیا۔ کئی گھنٹوں تک یہ محفل اسی طرح بشاش اور پُر مذاق رہی۔ میاں قمر الزماں صاحب بڑے خوش نظر آ رہے تھے۔ ہر بار کوئی نیا شعر سنکر اپنے دوستوں کو توجہ دلاتے۔ جب گانے والے رخصت کر دئے گئے۔ تو جتنے دوست واحباب موجود تھے۔ انہوں نے ہارمونیم بجانا شروع کیا۔ نشاط افزا کے میاں سے تقاضا کیا۔ کہ تم بھی کچھ سناؤ۔ انہوں نے ہارمونیم پر ہاتھ رکھا اور اپنے دوست

یعنی قمرالزماں کے حکم کی تعمیل میں ایک غزل شروع کردی۔ جس کے چند شعر مجھے یاد ہیں۔

عدم تک مضطرب رکھے محبّت ایسی ہوتی ہے
بتوں کے عشق میں انساں کی حالت ایسی ہوتی ہے
ابھی کم سن ہو کیا جانو کسی پر دل کا آجانا
بتائیں گے تمہیں احساں طبیعت ایسی ہوتی ہے

میاں قمرالزماں نے داد دیتے ہوئے کہا۔ اب ہمیں اجازت دیجئے۔ آپ کی مہربانی کا بہت بہت شکریہ۔ آپنے خلوص دل سے مدارات کی۔ اور ہمیں نوازا۔ خوش رہو میرے عزیز دوست! اس کلمہ پر ہاتھ ملاکر ایک دوسرے کو خدا حافظ کہتے ہوئے کوٹھی کے پھاٹک تک صاحب خانہ ہمیں پہنچانے آئے۔ (نشاط افزا کے میاں کا اسم گرامی افتخار تھا) وہاں آکر ایک بار پھر دونوں دوست یعنی میاں قمرالزماں اور افتخار بڑے تپاک سے بغل گیر ہوئے اور لینڈ و پر سوار ہو گئے۔ میں نے بھی سب بہنوں سے رخصت ہو کر خاص کر نشاط افزا کا شکریہ ادا کیا۔ اور محبّت کی نگاہوں سے ایک دوسری کو دیکھتی ہوئی رخصت ہوئیں۔ سواری کے قریب آکر نشاط افزا نے آخری سلام کیا۔ میں نے گلے لگایا اور خدا حافظ ناصر کہتی ہوئی سوار ہو گئی۔ اس محفل کی یاد اب تک دل میں باقی ہے میں پھر والدین کے گھر سے شیخوپورہ بیداد میں آگئی۔ جہاں میری خوشگوار زندگی حکومت اور مسرت سے گزرتی تھی۔ کیونکہ والدین بھی میرے ساتھ آگئے تھے میں نے میاں قمرالزماں سے کہا۔ کہ اگر آپ اجازت دیں۔ تو میں خواجہ

اجمیر کی درگاہ پرجانے کا شوق جو ایک برس سے دل میں پرورش پا رہا ہے پورا کروں۔ چنانچہ میاں قمرالزماں صاحب نے خوشی سے اجازت دے دی۔ میں اپنے والدین اور چند خدمت گاروں کو ساتھ لئے اجمیر شریف روانہ ہو گئی بہت دور دراز کا فاصلہ تھا۔ میرے گاؤں سے سات سومیل کی مسافت تھی میں بڑے ذوق اور شوق سے تمام راستہ میں نماز اور وظائف پڑھتی ہوئی بہت اشتیاق کے ساتھ شہر اجمیر شریف کے اسٹیشن پر پہنچی اور خدا کا شکر ادا کیا وہاں اسٹیشن پر بیسیوں مجاور خادم حضرت خواجہ اجمیری کے زائرین کا استقبال کرتے ہیں۔ پنجاب سے آنے والی ریل کی آمد پر ہر ایک سے دریافت کرتے۔ جو کوئی کہتا کہ میں زیارت کیلئے آیا ہوں۔ اسکو احترام کے ساتھ منزل مقصود تک لیجاتے تھے۔ لہذا جب ہم سے دریافت کیا۔ تو والد صاحب نے جو خود بھی بزرگان دین کے شیدائی تھے۔ نہایت ادب سے فرمایا۔ کہ ہم خواجہ غریب نواز کی قدم بوسی کو حاضر ہوئے ہیں۔ یہ سنکر وہ حضور کے خادم ہمارے ساتھ قدم بہ قدم بسم اللہ کہتے ہوئے سواری تک آئے اور انتظام کے ساتھ سامان اٹھوایا۔ پھر درگاہ شریف کے قریب ایک مکان کرائے پر لیکر اس میں ہمیں ٹھہرا دیا اور پلنگ وغیرہ سب کچھ وہ لوگ لے آئے ہم سب نے غسل کیا۔ کپڑے بدلے اور درگاہ شریف پر جانے کی تیاری کی۔ ہمارے ساتھ خانساماں تھا۔ وہ کھانا تیار کر رہا تھا۔ درگاہ شریف کے خادم ہمیں لینے کے واسطے آ گئے۔ حضور کے لنگر خانے کا جو "بھات" ہر روز پکا کرتا تھا۔ اس کا ایک پیالہ ہمارے واسطے بھی لائے۔ وہ بھات جو حضور کی روزانہ خوراک تھی۔

لوگ تبرک سمجھ کر کھاتے ہیں۔ ہم درگاہ شریف پہنچے۔ جہاں صحن میں قدم رکھتے ہی ایک شاہی جلوہ نظر آ رہا تھا۔ سنگ مرمر کا فرش ایک طرف ہندالولی کا توشہ خانہ۔ دوسری طرف دربانوں کی جگہ۔ وہ بھی شاہی دستور کے مطابق تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ شاہی دربار ہے۔ دربانوں کو کچھ روپیہ دیا تو انہوں نے بڑی عزت و توقیر سے ہمیں ایک اندھیرے کمرے میں سے گذار کر حضور غریب نواز خواجہ معین الدین رحمۃ اللہ علیہ کے قدموں میں جا بٹھایا۔ حضور کے سرہانے مبارک کی طرف ایک چاندی کی کھڑکی تھی۔ اس میں ایک چاندی کا تالا تھا۔ وہ کھولا گیا۔ مزار کے ارد گرد چاندی کا کٹہرا تھا۔ جو حضور کے مزار مبارک کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھا۔ آپ کے روضہ کے گرداگرد نہایت اعلیٰ درجہ کی نقش نگار کردہ جالی کسی خاص کاریگر کے ہاتھ کی بنی ہوئی تھی۔ ہم عورتوں کو بڑے کٹہرے کے اندر جانے کی اجازت نہ تھی۔ بیرونی حصہ میں چکر لگا کر میں نے فاتحہ پڑھی۔ خادمان نے ہمیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اب ہم دونوں ماں بیٹی۔ والد صاحب اور ہماری خدمتگاریں سب بیٹھ گئے۔ میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو رہے تھے۔ کیونکہ خادموں کی رقت انگیز التجا ہندوستانی لہجہ میں اس قدر کشش آمیز تھی۔ کہ سبحان اللہ۔ گویا ہماری طرف سے حضور کے آگے التجا کرتے تھے۔ اور ہماری طرف سے جو کلمات حضور کی شان میں وہ خادم استعمال کرتے تھے اُن کا ایک ایک لفظ دل میں اُترتا جاتا تھا۔ ان کی التجا کے الفاظ میرے دل میں نقش ہوتے جاتے تھے۔ وہ کہہ رہے تھے " اے ہندالولی یہ مسافر غریب الوطن آپ کے حضور میں اپنی مایوس امید دل کو لئے ہوئے روضہ اقدس پر التجا کرنے

آئے ہیں۔ اور آپ کا وسیلہ چاہتے ہیں۔ ان کی مراد بر آوے۔ پھر ہم سب کو کہدیں بولو آمین! ثم آمین! پھر حضور کی تربت کا ایک کونا پکڑا کر ہمیں توجہ دلاتے بہت سی التجا کے بعد کہتے پکڑو حضور کا دامن۔ اے غریب نواز خواجہ بیکیوں کے پیکر۔ محبوبِ خدا۔ مراد مند دل کی آرزو پوری کردیجیئے۔ آمین!۔ غرضکہ ایسے دردناک الفاظ سے حضور کی خدمت میں التجا کرتے تھے۔ کہ ان کی تقریر سے دل خود بخود متاثر ہوا جاتا تھا۔ دوسرے حضور کی شان بھی اس کے شایاں ہے۔ حضور انور کے مزار مبارک کے چاروں طرف بادشاہی وقت کی چیزیں موجود تھیں۔ دو نقرئی قندیل جس میں بہت سے چراغ لگے ہوئے تھے۔ ایک بڑے جھاڑ کی شکل میں تھے۔ اصل میں وہ شمع دان تھے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ شہنشاہ اورنگ زیب کے نذر کردہ ہیں۔ اور ایسی بہت سی چیزیں عجائب وغرائب دیکھنے میں آئیں۔ دو عدد اتنی بڑی دیگیں جنمیں کئی من چاول پکائے جا سکتے اور کئی دن پکتے رہتے۔ اور کئی دن ٹھنڈے ہوتے رہتے موجود تھیں۔ حضور کے توشہ خانہ میں بڑے بڑے صندوق تھے جن میں سے حضور کے سلام کرنے والوں کو سروپا کپڑا حضور کی طرف سے ملتا تھا۔ غرضیکہ بہت کچھ دیکھا۔ خوشبو حضور کے مزار مبارک پر اس قدر تھی کہ ایک جگہ ہمارے برقعے رکھے تھے۔ وہ بھی معطر ہوگئے۔ حضور کی تربت شریف کے تعویذ میں صندل جمایا ہوا تھا۔ جس کا ایک ٹکڑا ہمیں خادموں نے دیا۔ اس سے دماغ معطر ہوگیا۔ دوسرے دن جمعرات تھی۔ وہ بھی سماں عجیب تھا۔ حضور انور کے صحن میں ایک طرف چوبدار ہاتھ میں چاندی کی چوب لئے کھڑے تھے۔ مسند پر زری لگے ہوئے

تکیہ تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ گویا حضور خواجہ مسند پر رونق افروز ہیں۔ سامنے قوالی ہو رہی تھی۔ اور چاروں طرف لوگ با ادب بیٹھے تھے۔ روشنی کا سامان بے حد تھا۔ یہاں ہر جمعرات کو میلہ ہوتا ہے۔ دوسرے دن نماز جمعہ کا وقت ہُوا تو پہلے ایک توپ کی آواز آئی۔ اس پر لوگ جمع ہونے لگے پھر ایک مسجد جو شاہجہاں کی تعمیر کردہ تھی۔ اس میں دو نقارے جو بمشکل ایک کمرے میں آسکتے تھے۔ ان پر چوٹ پڑی۔ نقارے کی گونج سے تمام شہر میں منادی ہو گئی۔

نماز جمعہ کا وہ نظارہ قابل دید تھا۔ ہزاروں کی تعداد میں صفیں باندھی ہوئی دکھائی دیتی تھیں میرے والد صاحب بھی نماز میں شامل ہو گئے۔ اور مجھے بھی جماعت کے پیچھے نماز ادا کرنے کا از حد شوق تھا۔ میں بھی باقی عورتوں کے ساتھ پردہ میں نماز کے لئے شامل ہو گئی۔ یہ پردہ نہایت عمدہ قنات کا صرف عورتوں کے لئے مخصوص تھا۔ نماز کے بعد دعا شروع ہوئی تو مجھ پر محویت کا عالم طاری ہو گیا۔ میں خدا کی درگاہ میں التجا کر رہی کہ خداوند کریم تو غفور الرحیم ہے مجھے صاحب اولاد کر دے۔ اس محویت کے عالم میں کیا دیکھتی ہوں۔ کہ ایک نوجوان عورت آفتابی چہرہ۔ موٹے موٹے نقش سامنے کھڑی ہے۔ اس کو دیکھتے ہی مجھے القا ہُوا۔ کہ میرے خاوند کی دوسری بیوی جو اس شکل کی ہو گی اور اس کے اولاد ہو گی۔ میں اس قدر افسردہ خاطر ہوئی۔ کہ بالکل مایوسی کے عالم میں ہراساں ہو کر نماز سے بعد مزار پر گئی۔ وہاں فاتحہ خوانی کر کے التجا کی کہ غریب نوازا میں تو تیرے دربار میں بڑی امید لیکر آئی تھی مجھے یہ دکھائی دیا۔ اچھا جو خدا کو منظور ہے۔ وہی ہو کر رہا کرتا ہے۔ میں اب تیرے دربار سے مایوس ہو کر جاؤں گی۔ شکر ہے جد

کچھ میرے مقدر میں لکھا تھا وہی ملیگا۔ اس التجا کے بعد میں نے خوب اپنے دل کا غبار نکالا۔ میری آنکھوں سے آنسو مینہ کی طرح برس رہے تھے۔ میں نے ساون بھادوں کی جھڑی لگادی۔ یہانتک کہ میری ہچکی بندھ گئی۔ آخر میری والدہ صاحبہ صاحبہ نے مجھے گلے لگایا۔ میں نے ان کے پاس اس بشارت کا تذکرہ نہ کیا۔ مگر میرے دل میں خواجہ غریب نواز کی اس قدر محبت پیدا ہوگئی۔ کہ دل چاہتا تھا کہ اس دربار پر فقیر بنکر بیٹھ جاؤں۔ میرا دل وہاں سے ہلنے کو نہ چاہتا تھا۔ بجائے اس کے کہ مایوس ہو کر دل ٹوٹ جاتا۔ اُلٹا یہ اثر ہوا کہ مجھے اور بھی آرزو بڑھ گئی۔ گھر واپس جانے کے لئے طبیعت راغب ہی نہ ہوتی تھی۔

پانچواں باب

اولاد کے فکر میں بیقرار رہنا

میرے خیالات پریشان ہو رہے تھے۔ مگر اپنی عقیدت کی بنا پر میرا دل چاہتا تھا۔ کہ حضور خواجہ معین الدین چشتی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دربار میں بیٹھی رہوں۔ لیکن دل میں اسقدر حوصلہ اور طاقت کہاں تھی۔ ایک ہفتہ بڑی مشکل سے گزرا پھر گھر کے انتظام کا خیال دامنگیر ہونے لگا۔ دل کو مجبور کر کے واپسی کی تیاری شروع کردی۔ ایک اضطراب تھا جو دل کو کھائے جا رہا تھا۔

نہ پوچھو حال کچھ ناکامیوں سے ضعف ہمت کا
کروں گی امتحاں اِک بار لیکن اپنی قسمت کا

جب کسی وقت میں خاموش ہو جاتی۔ تو والدہ صاحبہ مجھے اس کا سبب

پوچھا کرتی تھیں۔ مگر میں ہمیشہ اس راز کو چھپاتی۔ اور والدہ صاحبہ کو ادھر ادھر کی باتوں میں ٹال دیتی۔

ہوتے ہوتے میری ہر وقت کی افسردگی سے تمام گھر والے بھی بیقرار ہونے لگے۔ مگر کیا کرتی۔ میں خود وارفتہ سی ہو رہی تھی۔ خیر ہم نے واپسی کی تیاری کی اور دہلی کے راستے واپس آئے۔ دہلی چند دن ٹھہرے ایڈورڈ ہوٹل میں جہاں کھانے کا اچھا انتظام تھا۔ قیام کیا۔ دوسرے دن شہر کی سیر کی۔ کچھ چیزیں خریدیں۔ اور گھر واپس آ گئے۔ میاں قمر الزماں صاحب انتظار میں تھے۔ انہوں نے ہمارے سفر و سیر و سیاحت اور زیارت کا مفصل حال سنا۔ بہت خوش ہوئے مگر میرے دل میں ایک بات کانٹے کی طرح چبھتی تھی وہ اس عورت کی شکل تھی جو مجھے دکھائی گئی تھی۔ لہذا میں ہر نماز کے بعد خدا سے سکونِ قلب کی التجا کرتی رہی۔

میں اکثر تنہائی کے وقت سوچا کرتی تھی۔ کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیئے؟ اگر اسی طرح چند برس اور گزر گئے۔ تو پھر سب کو تشویش ہو گی۔ فی الحال تو کسی کو بھی زیادہ محسوس نہیں ہوتا۔ کبھی دل چاہتا۔ کہ کسی لائق ڈاکٹر یا حکیم سے علاج معالجہ شروع کراؤں۔ مگر آخری خیال اس پر ختم ہوتا کہ بہتر یہ ہے کہ میاں کی شادی کرا دی جائے پھر ساتھ ہی یہ خیال پیدا ہوتا۔ کہ میری حکومت اور شوہر کی محبت کا اس کے ساتھ ہی خاتمہ ہو جائے گا۔ میرے والدین کو میری اس مصیبت کا کس قدر رنج ہوگا؟ اور میرا کیا حشر ہوگا؟ غرض کہ میرے دل میں گھن سا لگ گیا تھا۔ دن رات اپنے ضمیر سے باتیں کرتی رہتی۔ نہ کوئی میرا ساتھی اور نہ کوئی میرا اصلاح کار۔ نہ کسی سے مشورہ۔ سوائے ضعیف العمر والدین کے اور میرا کوئی حقیقی رشتہ دار نہ تھا

اُن کو ایسی پیچیدہ اور دلفگار باتیں سنانا طبیعت گوارہ نہ کرتی تھی۔ بس ایک دل ہی میرا صلاح کار اور یہی مونس و غمخوار تھا۔ اس حالت میں مجھے کوئی مشورہ دینے والا نہ تھا۔ میں ہروقت دل و دماغ سے الجھی رہتی۔ اس وقت مجھے یہ خیال آتے ہی دل پہ چوٹ سی لگتی۔ کہ اگر میری حقیقی بہن زندہ ہوتی تو وہ میری صلاح کار ہوتی۔ رہ رہ کر افسوس آتا تھا کہ اس جنگل میں کوئی میری طبیعت کو سمجھنے والا نہیں۔ اگر مہربان تھے تو میاں قمر الزماں کے بھائی بہنیں اور کنبہ کے لوگ۔ مگر میں اپنی دلی تمناؤں کا اظہار کس طرح کر سکتی تھی۔

ایک دن میاں قمر الزماں بڑی خوشی میں بیٹھے تھے۔ ان کی طبیعت تو ہر وقت خوش رہا کرتی تھی۔ امیر مردوں کی طرح زیادہ عیب نہ تھے۔ ہاں ایک نقص ضرور تھا کہ وسکی کا پیگ ضرور استعمال کر لیتے۔ جب سے ریاست پونچھ میں ملازمت کی تھی۔ وہاں مہاراجہ صاحب خود بھی وسکی کے عادی تھے۔ وہ اکثر شام کو سب اہلکاروں میں شغل کے ساتھ پیا کرتے تھے۔ ان کو بھی عادت ہو گئی تھی۔ مگر میاں تحبت نصر صاحب چونکہ بیحد پرہیزگار تھے ان کے خوف سے کبھی گھر میں نام تک نہ لیتے۔ اگر کسی وقت گھر میں استعمال کرتے تو بہت پوشیدہ طور پر۔ اور مجھے ان کا کوئی ناجائز فعل معلوم نہ تھا۔ میں سمجھتی تھی جیسی محبت میاں کو میرے ساتھ ہے ایسے مہربان شوہر شاذ و نادر ہی کسی کے ہونگے۔ اس صورت میں دوسرا پہلو سوچنا جو میرے اور میاں کے درمیان جدائی ڈالنے والی چیز تھی۔ گویا اپنے ہاتھ سے زہر کا گھونٹ پینا۔ یہ کس قدر مشکل امر تھا۔ مگر میرے ضمیر کی آواز تقاضا کر رہی تھی۔ کہ اے وزیر! اب تجھے عیش و عشرت سے منہ موڑنا چاہیئے۔ بس تیری مسرت اس وقت

تک ہی محدود تھی۔ بھلا کسی کی تقدیر کا لکھا بھی مٹا ہے؟

آخر حوصلہ کر کے میاں قمر الزماں کو میں نے اس طرف متوجہ کیا۔ اس طریقہ سے کہ اب میں اکیلی اداس ہو جاتی ہوں۔ کیونکہ گھر میں کوئی بچہ نہیں۔ خدا کا دیا ہوا اور سبھی کچھ ہے۔ مگر بے اولاد ہونے کی وجہ سے مجھے کوئی چیز بھلی نہیں لگتی۔

قمر الزماں "۔کیا آج کچھ دماغ میں فتور ہو گیا ہے؟"

میں "۔فتور تو نہیں۔ البتہ یہ سوچتی ہوں کہ آپ کب تک بے اولاد رہ کر اپنا وقت گزار ینگے؟"

قمر الزماں "۔بڑی خوشی سے وقت گزرتا ہے۔ ایسے ہی گزرتا جائیگا۔ ابھی ہم خود ہی بچے ہیں۔ اولاد پیدا کرنے کا کافی وقت ہے (حساب کرتے ہوئے) ابھی شادی ہوئے آٹھ برس ہوئے ہیں کیا بہت وقت گزر گیا ہے؟"

میں "۔بیشک! میرے خیال میں تو بہت وقت ہے!"

قمر الزماں "۔تم تو پاگلوں کی سی باتیں کر رہی ہو۔ جاؤ کہیں سیر کرو۔ دل کو دوسری طرف توجہ دلاؤ!"

میں نے اس کلمہ پر آنسوؤں کی جھڑی لگا دی۔ طبیعت بہت بیقرار ہونے لگی۔ میاں قمر الزماں افسردہ خاطر ہو گئے۔ میرے رونے کا ان کے دل پر بہت بُرا اثر ہُوا۔

میاں قمر الزماں عورتیں اکثر کمزور دل ہوتی ہیں۔ جس بات کا خیال دل میں سما جاتا ہے۔ بس خدا جانے اس پر کتنی قیاس آرائیاں کرتی رہتی ہیں۔ میں تو تمہیں نہایت خوش باش طبیعت کی عورت سمجھتا ہوں۔ بخدا جب صبح کو سو کر اُٹھتے

وقت تمہاری صورت دیکھ لیتا ہوں۔ تو میرا تمام دن ہنستے کھیلتے گزرتا ہے
تم بہت خوش مزاج اور خوش بخت خاتون ہو!"

میں نے کہا۔ میری خوش مزاجی اُس وقت تک تھی اب بس ہو گئی ہے۔
میاں **قمر الزماں**۔ خاموش کیوں ہو گئی ہو۔ کوئی اور بات کرو۔ ایسی فضول باتیں
میں نہیں سن سکتا۔ خواہ مخواہ خود پریشان ہو کر دوسروں کو بھی آشفتہ
حال کرتی ہو۔ چلو ذرا باہر چلیں۔ باغ میں نئے پھول اور ریشیا ور سے
آلوچے کی قلمیں منگوائی گئی تھیں۔ وہ سب لگوادی گئی ہیں۔ اندر کی طرح
باہر بھی ایک چوک تیار کروایا ہے۔ تم نے نہیں دیکھا۔ چلو دکھاؤں!"
میں۔ نہیں۔ میں باہر نہیں جاؤں گی۔ اوپر چل کر دکھا دو۔
قمر الزماں۔ بہت اچھا۔ اوپر چلو۔

ہم دونو اوپر چلے گئے۔ تو باغ کا جو حصّہ بالکل کوٹھی کی دیوار کے قریب تھا
اس طرف واقعی بڑی خوبی سے اراک لگوا کر درمیان میں ایک چوک بنوایا گیا تھا
میاں قمر الزماں نے چوک کی طرف انگلی سے اشارہ کر کے کہا۔ یہاں چوک میں میری
اور تمہاری قبروں کے واسطے جگہ رکھی گئی ہے۔

میں نے کہا خدا سے فضل مانگو!

قمر الزماں نے فرمایا۔ آخر ایک دن مرنا ہی ہے۔ ہم دونوں کی چوک میں قبریں
بہت اچھی رہیں گی۔

میں نے کہا۔ اگر میں آپ سے پہلے مر جاؤں تو آپ کو کس قدر رنج ہو؟
قمر الزماں۔ بہت سخت۔

میں۔ بات کاٹ کر۔ تو مجھے کیسے معلوم ہوگا کہ آپ اس قدر رنجیدہ ہیں۔
قمر الزماں (مذاق سے) تم مر کر دیکھو۔ میں تمہیں یاد کرکے دنیا کو حیران کر دوں
تمہاری قبر پر بہت عمدہ پتھر لگا کر کنارے پر پھول لگا دوں۔
میں نے کہا سب جھوٹ ہے۔ مرد تو اُسی وقت دوسری شادی کے فکر
میں لگ جایا کرتے ہیں۔
قمر الزماں۔ آج تو ضرور کچھ تمہارے دماغ میں کوئی اور خبط سمایا ہوا ہے کہیں
میری طرف سے کسی نے بہکا تو نہیں دیا؟
ایسی فضول باتوں میں وقت گزر گیا مگر میرا مطلب حل نہ ہوا۔ اس واقعہ
کے کچھ عرصہ بعد ایک دن یہی تذکرہ پھر شروع ہو گیا۔ میں نے کہا۔ جی آپ سے
ایک بات کہنا چاہتی ہوں۔ بشرطیکہ آپ منظور کریں۔ پیچھے تو دیکھا جائیگا۔
میاں قمر الزماں۔ وہ کونسی ایسی مہم درپیش ہے؟
میں۔ مہم ہی ہے۔
قمر الزماں۔ اچھا! کیا معاملہ ہے؟
میں۔ آخر کب تک ہم اولاد کو ترستے رہیں گے؟
قمر الزماں۔ واہ جی! خوب، معاملہ نکلا۔ یہ خدا کے حکم کی چیزیں ہیں۔ اس
میں ہمیں کیا دخل جس وقت وہ چاہے گا دیگا۔ نہیں ہو گیا کیا ہے؟
اگر کچھ ایسا ہی خیال ہے تو اپنا علاج کرواؤ۔
میں۔ علاج کیا کروانا ہے آپ کا ہی علاج سوچ رکھا ہے۔
قمر الزماں۔ میں کوئی خدانخواستہ مریض ہوں؟ مجھے علاج کی ضرورت نہیں

البتہ تمہیں کچھ شکایت رہی تھی نا؟ اس سے ممکن ہے تمہاری صحت میں کوئی فتور آگیا ہو۔

میں - یہی میرا خیال ہے!

قمر الزماں - پھر اس کا علاج نہیں ہو سکتا؟

میں - علاج کرنا فضول ہے - مجھے بظاہر تو کوئی شکایت نہیں۔ جس کا علاج کیا جائے۔

میاں قمر الزماں - خاموش ہو کر اچھا بس کر دو ۔۔ اور باتیں کرو - دنیا میں ہر وقت اولاد کو رونے رہنا ٹھیک نہیں - میں بھائی کی بیٹی سعیدہ کو تمہارے دل بہلانے کے واسطے لے آتا ہوں - اب دوسری بچی حمیدہ سلطان پیدا ہو گئی ہے وہ سعیدہ کو تمہارے پاس رہنے دیں گے۔

میں نے اسباب پر زور سے جواب دیا - سعیدہ سلطان بھی ہماری بچی ہے - مگر اپنی اولاد اپنی ہوتی ہے - اتنے میں کسی نے باہر سے میاں قمر الزماں کو بلایا - گفتگو ختم ہو گئی - میرے دل کی وارفتگی اور پریشانی دن بدن بڑھتی جاتی تھی - سوائے خدا کے میرا کوئی نہ تھا - اس صورت میں اکثر عورتیں بے اولاد ہونے کی وجہ سے بہت سی فضولیات پر ایمان خراب کرتی ہیں - اور ہر کس و ناکس کے پاس اپنی کہانیاں سناتی ہیں - روتی ہیں - ہر پیر فقیر سے دعا کرواتی ہیں - اور فضول روپیہ خرچ کرتی ہیں - ایسی باتوں سے مجھے دلی نفرت تھی - ہاں جو کچھ تھا میرے دل ہی میں مضمر تھا - میں اس پر عمل کیا کرتی - انسان اپنی زندگی کے مختلف شعبوں میں جو کچھ بھی کرتا ہے - وہ اپنے دل کی آواز پر کرتا ہے - کیونکہ درحقیقت

یہ آواز اُس مالک الملک کی آواز کا ظہور ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ضمیر میں نیکی اور صفائی کا ہونا بھی لازمی ہے۔ بُرائی کرنے والے انسان کے دل کی آواز کبھی صحیح نہیں ہو سکتی۔ خدا حسد و بخل سے بچائے۔ اگر ضمیر گمراہی کی طرف راہبری کرے۔ تو ہرگز اس پر غور نہ کرنا چاہیئے۔ فرض کرو اگر دنیا میں کسی سے فساد ہو گیا۔ تو دل یہی چاہتا ہے۔ کہ اس کو جان سے ہلاک کر دیا جائے۔ یا کوئی اور اس کے متعلق بُرائیاں سوچ کر اسے اذیت پہنچانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اِس معاملہ میں ضمیر سے مشورہ لینا ایمان کی ذلت ہے۔ ایماندار آدمی کبھی کسی کے متعلق بُرائی نہیں سوچا کرتے۔ اگر ضمیر گمراہ کرے تو اُس پر کبھی غور نہ کیجیئے۔ بلکہ ان خیالات کو فاسد خیال اور شیطانی وسوسے سمجھنا چاہیئے۔ ضمیر میں جو خدا کا جلوہ انسان کے اندر موجود ہے۔ نیک ہدایت لیکر رونما ہوتا ہے۔ وہ جذبات جو میرے دل میں پیدا ہوا کرتے تھے۔ میں ان پر خوب غور کر کے فیصلہ کر لیا کرتی تھی اکثر میاں قمرالزماں کے دل میں دوسری شادی کرنے کے متعلق کیا خیال ہے معلوم کرنیکی کوشش کرتی اور اپنے دل کو بہت سی مثالیں پیش کر کے سمجھایا کرتی۔ چنانچہ تو گرفتارِ غم تھی لہذا ہر وقت دل سے سرد آہیں نکلتی رہتیں۔ مگر قدرت اور رحمت کا دیا ہُوا حوصلہ تھا کہ سب کی نگاہوں میں خوش باش رہتی۔ اور ہر کس و ناکس پر ظاہر کرنا مناسب نہ سمجھتی تھی۔ آخر میں نے دل مضبوط کر لیا۔ کہ "اے ذریرِ بے اولادی تیری بدبختی کا نشان ہے۔ اب سوائے صبر و حوصلہ کے کچھ نہیں بن سکتا۔ جو بھی گزرے برداشت کئے جانا۔ دیکھنا مت گھبرانا۔ دلکو قابو میں رکھنا۔

کیونکہ یہ ایک قدرت کی طرف سے امتحان ہے ؎

بدل جائے جو تھوڑے رنج غم میں وہ طبیعت کیا
کیا ہو شکر جس منہ سے کریں اُس سے شکایت کیا
زمانہ رنج دنیا ہے بقدر حال انساں کو
گدا کو فکر ناں ، اندیشۂ عالم ہے سلطاں کو
جہاں مشکل کی پڑ جائے گرہ ناخن تدبیر اکھوے
تو ہر اک درد میں شامل ہو ہر آواز میں بولے!

سکوت کا عالم۔ چاندنی رات آب و تاب کے ساتھ پورا چاند آسمان پر جلوہ فگن تھا۔ ہوا کے دلفریب جھونکے خوشنما درختوں کے ساتھ اٹھکیلیاں کر رہے تھے۔ میاں قمر الزماں باہر سے تشریف لائے۔ اور دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے مگر میں اُن کے پاس خاموش بیٹھی تھی۔ وہ میرے چہرے کو غور سے دیکھنے لگے۔ اور کچھ پریشانی کے لہجے میں کہا "زبیرا تمہاری صورت پر افسردگی کیوں چھائی رہتی ہے؟

میں نے پُر نم آنکھوں میں آنسو ڈبڈباتے ہوئے ایک عاجزانہ نگاہ سے میاں قمر الزماں کی طرف دیکھا۔ میرا دیکھنا تھا۔ کہ میاں قمر الزماں نے مجھے گلے سے لگا لیا۔ اور خود بھی اس قدر روئے کہ میں بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ آخر مجھے ہی حوصلہ کر کے تشفی دینے کی کوشش کرنی پڑی۔ مگر میرا دل بھی بیٹھا جاتا تھا۔ چند منٹ تو میاں قمر الزماں بالکل خاموش رہے۔ میں نے بھی زیادہ گفتگو کرنی مناسب نہ سمجھی۔ جب خاموشی میں وقت بہت بیت گیا۔ تو

اس سکوت کے عالم میں میاں قمرالزماں نے ایک سرد آہ بھری اور میری طرف متوجہ ہو کر کہا۔ "وزیر سلطان! تم میری باتوں کو غور سے سنو! مجھے تم سے دلی محبّت ہے۔ اور میں نے تمہاری بے اولادی کو بھی اب تک بخدا کبھی محسوس نہیں کیا۔ یہ خیال صرف تمہارے دل میں پیدا ہو رہا ہے۔ میری زبان سے تم نے کوئی شکایت سنی ہے"؟

میں۔ کبھی نہیں!

قمرالزماں۔ تو پھر اس قدر متفکر رہنے کا کیا باعث ہے؟ میں حیران ہوں۔ یہاں نہیں کوئی سکھانے والا بھی نہیں۔ دوسرے تم ایسے فضول خیالات کی عورت نہیں ہو۔ جو بہک کر بگڑ جاؤ۔

میں۔ جس وقت دل پریشان ہونے لگے۔ تو بے وقوف سے بے وقوف اور دانا سے دانا انسان بھی افسردگی کا مسکن بن جایا کرتا ہے!

میاں قمرالزماں۔ آخر مجھے بھی تو پتہ لگے۔ اصل منشا کیا ہے۔ اور اس کا حل کس صورت میں ہو سکتا ہے؟

میں۔ سچ بات تو یہ ہے کہ مجھے اپنے سے زیادہ آپ کے ساتھ محبت ہے آپ خود ہی اندازہ کر سکتے ہیں!

قمرالزماں۔ درست ہے لیکن اداسی کس بات کی ہے؟

میں۔ اگر آپ میری وجہ سے کچھ برس اور خاموشی سے گزار دیں گے۔ تو مجھے یقین ہے کہ اس وقت پھر آپ کے خیالات دوسری شادی پر مائل ہو جائینگے۔ یہ میرے اور میرے والدین کے لئے کسی قدر رنج

کا مقام ہو گا۔

میاں قمرالزماں۔ کیا تمہیں الہام ہوتے ہیں کہ اس عرصہ میں تمہارے اولاد نہ ہو گی؟

میں۔ ہاں۔ نہیں ہو گی۔

قمرالزماں۔ وزیراتم کیوں ایمان خراب کر رہی ہو۔ خدا کی رحمت سے ہر وقت امیدوار رہنا چاہیئے۔ وہ قادر کریم ارحم الرحمین ہے۔

میں۔ اس ارحم الرحمین نے مجھے آگاہ کر دیا ہے کہ تمہارے اولاد نہیں ہو گی تم اپنے خاوند کی دوسری شادی کر دو۔

میاں قمرالزماں۔ سبحان اللہ۔ یہ ادر فرمان جاری ہوا۔ میں تو دوسری شادی کی زحمت کبھی گوارا نہیں کر سکتا۔

میں۔ معاف کرنا۔ آپ کے ہاں تو دستور ہے۔ وزیر صاحب مرحوم کی کتنی شادیاں ہوئیں۔ میاں بخت نصر صاحب نے دوسری شادی کی۔ تو آپ کے لیئے کونسی مشکل ہے؟

قمرالزماں۔ بھلا کیوں فضول جھگڑا لگا رکھا ہے؟ میاں بخت نصر صاحب کو پہلی بیگم سے نفرت تھی۔ یوں رفع وقتی کرتے رہے۔ آخر اپنے حسب منشا بیوی کی تلاش ضروری تھی۔ ان کی زندگی کیسی حسرتناک تھی۔ بڑے پیمانہ پر ہر کام کرنے۔ اور تمام گھر کے لوگوں کے نشیب و فراز سوچنے والے وہی تھے۔ لہذا اس مصروفیت میں اُن کا وقت گزر گیا۔ ورنہ کوئی کارندہ شخص ہوتا۔ تو فوراً دوسری بیوی کی تلاش میں مصروف ہو

جاتا ہے مجھے کیا مصیبت ہے کہ اچھی بھلی ایک خاندانی حسب پسند بیوی کی موجودگی میں دوسری شادی کرلوں۔ یہ تو میری سراسر بے وقوفی ہوگی۔ میرے خیالات ایسے نہیں ہیں۔ کہ گائے بھینسوں کی طرح گھر میں عورتیں رکھی جاویں۔ والد صاحب کا زمانہ کچھ اور تھا۔ وہ اپنے مذاق میں بہتر سمجھتے ہوں گے۔ میں ہرگز پسند نہیں کرتا۔

میں ان جوابات سے اور بھی پریشان ہوگئی مگر چند منٹ سکوت کے عالم اور مایوسی کے پیچیدہ مراحل میں غوطہ زن ہوکر بڑے جوش سے کہا۔ کہ ایک فیصلہ کرو۔ اگر اولاد کی ضرورت ہے۔ تو اب میری مرضی پر منحصر کردو۔ جس طرح میں مناسب سمجھوں کروں۔ اگر اس وقت آپ کو میری منشا منظور نہیں تو پھر کبھی میں ہرگز ہرگز نہیں کرنے دونگی۔ تا وقتیکہ آپ میرے ساتھ قطع تعلق نہ کریں۔

قمر الزماں۔ (چند منٹ خاموش رہ کر) کیا کروگی؟

میں۔ جس طرح مناسب ہوگا!

قمر الزماں۔ اچھا جاؤ جس طرح جی میں آئے کرو۔ پھر مجھ پر کوئی الزام نہ دینا۔

میں فوراً قرآن مجید اُٹھا کر لائی۔ اور قسم دلائی۔ کہ اپنے وعدہ پر قائم رہنا ہوگا۔

قمر الزماں۔ اگر تمہارا شوق میری اولاد سے ہے۔ تو تمہیں اختیار ہے۔ مگر عورت ایسی ہو جو تمہارے حسب منشا گزر اوقات کرسکے۔ تمہاری محبّت اور حکومت میں فرق نہ آنے پائے۔ تم ہر طرح خوش رہو! ۔ ذمہ داری تمہاری

ذات پر منحصر ہوگی۔ مجھے منظور ہے۔
میں تم سے کبھی کسی بات میں ایک ذرہ بھر بھی فرق نہ کرونگا۔ میرا خدا شاہد ہے۔
اب میرا دل تو مطمئن ہوگیا۔ مگر میرے خیالات میں اور بھی الجھن پیدا ہو گئی۔ سوچتے سوچتے دماغ تھک جاتا تھا۔ کہ کیا کروں۔ اب جو بات میرے ضمیر نے نشتر کر دی ہے اس کا پورا کرنا بھی ضروری ہے۔ کہاں تلاش کروں؟ کس قوم میں؟ کس گھرانے میں؟ سرمایہ داری میں؟ غریب لوگوں میں؟ کس طریقہ سے؟ اس مرحلے کو طے کروں؟ اے خدا تو ہی میرا مددگار بن!

چھٹا باب

میاں قمر الزماں کا نکاحِ ثانی

از درد بیقرارم فریاد رس الہٰی!
جُز تو کسے ندارم فریاد رس الہٰی!

میں نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ کبھی گاؤں کے امیر راجپوتوں کی لڑکیوں کی طرف۔ کبھی اپنے وطن میں۔ آخر قصبہ ریاسی میں جو میرے سسرال والوں کے قریبی رشتہ دار تھے اور چند وجوہات کی بنا پر ہم سے علیحدہ ہو گئے تھے۔ ان کی دو لڑکیوں کو جنہیں میں نے اپنے قصبہ ریاسی کی رہائش کے دوران میں دیکھا تھا منتخب کیا۔ ان کا ایک رشتہ دار ہمارے پاس ملازم تھا۔ میں نے اس ملازم کو بلایا۔ اور کہا۔ کلثوم" یعنی شاہ سوار کی

بیوی کو میری طرف سے پیغام دو۔ اور جو حالات میں بیان کرتی ہوں۔ اُس سے آگاہ کر کے اُسے میرے پاس بلا لاؤ۔ غرضیکہ کرایہ آمد و رفت دیکر میں نے روانہ کیا۔ اس ملازم نے سب ماجرا میری طرف سے بیان کر کے ان لوگوں کو مطمئن کر دیا۔ وہ لوگ میری طبیعت سے بخوبی واقف تھے۔ اور ان کی دلی منشا بھی تھی۔ کہ لاکھ پتی گھر میں اگر لڑکی صاحب اولاد ہو گئی۔ تو لاکھوں کی مالک بن جائے گی۔ دوسرے وہ پہاڑی لوگ تھے۔ اکثر سیدھے سادے مزاج کے ہوتے ہیں۔ انہوں نے دل میں سوچا۔ کہ ایسا رشتہ بُرے قسمت۔ وہ میرے پاس آئے۔ میں نے ان کو خوب سمجھایا۔ انہوں نے کہا کہ کنبہ کے لوگوں کے ساتھ تو دیر سے ہمارے تعلقات منقطع ہو چکے ہیں۔ مگر تمہاری خاطر ہمیں منظور ہے۔ بشرطیکہ تم اپنی ذمہ داری کا ہمیں قول دو؟ خیر میں نے کلثوم کو خوش کر لیا۔ اور ایک سو روپیہ دے کر رخصت کیا۔ اور کہا جس وقت میں اطلاع بھیجوں۔ آپ اپنی لڑکی کو لیکر آجائیں۔

میں نے یہ تمام حال میاں قمر الزماں کو سنایا۔ وہ کئی دنوں کے بعد یو۔ پی سے شکار کھیل کر آئے تھے۔ ان کی واپسی تک یہ سامان ہو گیا۔ اور تجویز بہم پہنچ گئی۔ جس وقت انہوں نے سارا حال سنا۔ تو وہ بہت حیران ہوئے اور تعجب سے مجھے کہنے لگے۔ کہ بہت دانشمند ہو۔ میرے تو وہم و گمان میں بھی یہ رشتہ نہ تھا۔ لیکن تمہیں خوب سوجھی۔ بیشک تم بڑی دانا اور لائق ہو۔ خیر مجھے تو ہر طرح منظور ہے۔ تم نے جیسا چاہا اپنا مقصد پورا کر لیا۔ مگر والدہ

صاحبہ مہرالنساء بیگم تم سے کشیدہ ہو جائیں گی۔ میں نے کہا خیر دیکھا جائیگا۔
اب مجھے یہ فکر بہت حیران کر رہا تھا۔ کہ میں اپنے والدین کو کس طرح مطمئن کردں ہیں نے فوراً وطن جانے کا ارادہ کیا۔ اور وہاں پہنچ کر بڑے اطمینان اور حکمت عملی کے ساتھ اپنے والدین کو مطمئن کرلیا۔ انہوں نے بھی میرے کہنے پر صبر وتحمل سے غور کرکے میرے پریشان دل کی تسلی و تشفی کی۔ اور کہا۔ ہم تمہارے ساتھ ہیں جس طرح تم اپنی سہولیت دیکھو عقل سلیم سے کام لو۔ غرضیکہ میں مطمئن ہو کر واپس آگئی۔ اب جو تاریخ مقرر کی تھی۔ اس پر کلثوم، شاہ سوار اور ان کی لڑکی کو ایک مکان میں جہاں ان کے ٹھہرنے کا انتظام کیا گیا تھا لاہور بلا لیا۔ اِدھر سے میاں قمرالزماں صاحب کو چند زیور اور پارچات دیکر میں نے لاہور روانہ کردیا۔ اور نکاح کے بعد میاں قمرالزماں نے ان کو میرے مشورہ کے مطابق کچھ رقم کرایہ وغیرہ کے لیئے دیکر واپس کرتے ہوئے سمجھا دیا۔ کہ رشتہ داروں کو خبر نہ ہو جائے۔ ورنہ مجھ سے شکایت کرینگے۔ کہ ہمیں خبر نہ کی۔ یہ سب کارروائی تو وزیر سلطان نے کی ہے۔ وہی خود سب کو جواب دے سکتی ہے کیونکہ وہ ایک دانشمند اعلےٰ خیال کی عورت ہے۔ اُس نے میری ہی بہتری کے واسطے یہ سوچا ہے اور اس کی پاکیزہ خیالی و نیک بختی کا مجھے اندازہ ہے غرض ان کو رخصت کرکے آپ اپنی نئی بیگم کو ساتھ لے کر اپنے گاؤں کی طرف روانہ ہوئے۔
نئی بیگم کا نام سجادہ بیگم تھا۔ اسکو ساتھ لیکر میرے پاس شیخوپورہ میں تشریف لے آئے۔ میں کھانا تیار کرکے انتظار میں بیٹھی تھی۔ اتنے میں میاں

قمرالزماں صاحب تشریف لائے۔

قمرالزماں۔ اسلام علیکم! لو صاحب آپ کے حکم کی تعمیل میں ایک اور بیگم نکاح میں آگئی!

میں نے اپنی ملازمہ کو اشارہ کیا۔ کہ جاؤ بیگم صاحبہ کو لے آؤ۔

سجادہ بیگم صاحبہ اندر قدم رکھتے ہی میری طرف دیکھ کر ہنسی۔ اور بھابی کے لقب سے مخاطب کر کے مجھے سلام کیا۔ میں نے ہنس کر کہا۔ اب میں تمہاری بھابی نہیں ہوں۔ اب مجھے آپا کہکر بلانا ہوگا۔

قصبہ رباسی میں یہ لڑکیاں اکثر مجھے بھابی کہا کرتی تھیں۔ ویسے ہی اب بھی سجادہ بیگم نے کہدیا۔ اُس کے بھولے پن پر بجائے کسی قسم کی کدورت کے مجھے کچھ رحم ہی آتا تھا۔ کہ اب یہ میرے بس میں ہے جس طرح میرا دل چاہے اچھا بُرا سلوک کروں۔ میں نے رفتہ رفتہ اُسے بھی گھر کے کام کاج میں شامل کرلیا۔ اور اُٹھتے بیٹھتے میاں قمرالزماں کی خدمت کی ہدایت کرتی رہتی۔ چنانچہ میاں قمرالزماں سجادہ بیگم کی باتوں اور سادہ مزاجی پر اکثر ہنستے اور مجھے کہتے۔ کہ اچھا جانور میرے سپرد کیا ہے عجب زبردستی ہے میرا دل تو بات کرنے کو بھی نہیں چاہتا۔

میں۔ آپ کا دل تو کسی چالاک ہوشیار سے بات کرنے کو چاہتا ہوگا۔

ناظرین اپنے خدا پر یقین رکھتے ہوئے میری اسباب پر یقین کیجئے کہ جو شکل مجھے حضرت خواجہ اجمیری کے دربار میں دکھائی دی تھی۔ یہ صورت وہی تھی۔ جو میاں قمرالزماں کے نکاح میں آئی۔ ان رشتہ دار لڑکیوں کی شکل

دیکھے کئی برس کا عرصہ ہوگیا تھا۔ دماغ سے اس کی یاد بھی نکل چکی تھی۔ اور یہ وہم دگمان بھی نہ تھا۔ آہ یہ قدرت کی ستم ظریفیاں ہیں۔ یہ معجزہ کراماتی تھا۔ یہ وہی شکل تھی۔ میں دیکھ کر محوِ حیرت ہوگئی۔ میرا دل پژمردہ ہو رہا تھا۔ آخر میں نے نماز پڑھی اور سجدے میں دعا کی۔ کہ اے رب العلمین جو کام ہونے والا ہو۔ مجھے اسی طرح تو پیشتر آگاہ کردیا کر۔ میں ایک گناہگار ہوں۔ ذرۂ خاک۔ نہ مجھ میں طاقت ہے اور نہ جرأت۔ تو اپنے حبیب کا صدقہ مجھ کو ایسے ہی دل کی صفائی عطا کر۔ تاکہ میرا دل تیری مہربانی سے باخبر ہوجایا کرے۔ دنیا کے مرحلے زبردست ہیں۔ میرا تیری ذات کے سوا کوئی وسیلہ نہیں۔ اور نہ میرا کوئی حقیقی رشتہ دار ہے۔ تو ہی میرا رہبر ہے۔ تو ہی میرا غمخوار۔ تو ہی مددگار ہے۔ اے قاضی الحاجات! میں نے تیری دنیا کے دھندوں میں دل لگا لیا ہے۔

اب میں جو کام گھر میں کرنا ہوتا تھا۔ سجادہ کو بھی اس میں شریک کرلیا کرتی تھی۔ اور اسکی ہر ضرورت کا خیال رکھتی۔ میری بےفکری اور آزادی میں فرق آگیا تھا۔ کجا میری پہلی زندگی۔ مگر اب ہر قسم کے خوف دامنگیر تھے گو میری ذات کو کوئی کسی قسم کی تکلیف نہیں پہنچ سکتی تھی۔ نہ میری تابعداری میں کسی قسم کی کوتاہی ہونے کی امید تھی البتہ اذن قدرت پر نظر پڑتی۔ تو ایسے ایسے کرشمات دکھائی دیتے۔ کہ میں اپنے پیدا کرنے والے کے آستانہ پر جھکتی اور دل کا غبار نکالتی۔ مگر اُف تنگ نہ کرتی تھی اپنی بےبسی پر اُنسوس آتا۔ عجیب عجیب خیالات پیدا ہو کر فنا ہوتے رہتے تھے۔

سجادہ بیگم کو میں نے ہدایت کر دی کہ میاں قمرالزماں کی خدمت کا ہر وقت خیال رکھا کرو۔ مگر سجادہ بیگم بعض وقت خوف زدہ ہو کر مجھ سے کہہ دیتی کہ آپ مجھ سے ہر وقت میاں صاحب کی خدمت کرواتی رہتی ہیں۔ اور میں اُن سے ڈرتی بہت ہوں۔ آپ اپنا کام جو جی چاہے مجھ سے کروالیا کریں۔ میں اسکو تسلی دیدیا کرتی۔ اسی طرح وقت گزرتا رہا۔ کسی وقت میاں قمرالزماں سجادہ کے کام سے گھبرا جایا کرتے۔ اور مجھ کو کہتے۔ کہ اس جانور کو میرے سپرد کرکے آپ سب کام کا علاقہ چھوڑ بیٹھی ہو۔ مجھے یہ منظور نہیں۔ میرا قافیہ تنگ ہو رہا ہے۔ میں کبھی سخت ہو کر اور کبھی مذاق سے ڈانٹ ڈپٹ کرکے وقت کو نبھاتی جارہی تھی۔

ایک دن میاں قمرالزماں نے بگڑ کر کہا۔ ذرا اپنی سوغات سے پوچھئے۔ کہ "مقراس" کیسے ٹوٹی ہے۔ میں نے کہا۔ نوکروں سے نہیں ٹوٹ جایا کرتی؟ کئی قیمتی چیزوں کا نقصان تو آپ معاف کر دیا کرتے ہیں۔

قمرالزماں۔ ہمیں تو ہر طرح دھمکی ملتی رہتی ہے۔ کیا کیا جائے "گو تم مشکل وگرنہ گو تم مشکل"

میں نے ہنس کر کہا بس چند دنوں تک آپ کے حسب منشا اور ہوشیار ہو جائیگی۔

میاں قمرالزماں۔ تم اپنے حسب منشا رکھو۔ میں تو تمہاری خوشی سے خوش ہوں۔

میں۔ (ان کا ہاتھ تھام کر) یہ آپ کی بندہ نوازی ہے۔ بہت بہت شکریہ!

ہم دونوں باہر ٹہلتے ہوئے آرہے تھے۔ کہ ایک ملازمہ نے خوشامد کے لہجے میں
کہا۔ بی بی صاحبہ میاں کے ساتھ تو آپ ہی چلتی پھرتی بات کرتی بھلی معلوم
ہوتی ہیں۔ میں نے اپنی خادمہ کو کہا۔ کہ آیندہ کبھی ایسا خیال نہ ظاہر کرنا۔ میں
ایسی باتوں کو پسند نہیں کرتی۔ خدا کے حکم کی تعمیل ہے۔ مقدر میں لکھا تھا وہ
ہو کر رہا۔ خدا کو ایسا ہی منظور تھا۔ میری قسمت میں پورے طور پر شادمانی نہ تھی
یہ سب کچھ بے اولادی نے کروایا ہے۔

خادمہ:- بیگم صاحبہ میاں صاحب کی تو مرضی نہ تھی۔ آپ ہی نے کیا جو کچھ
کیا۔

میں:- ہر بات میں ہر فعل میں قدرت کا راز ہوا کرتا ہے۔

خادمہ۔ اللہ آپ کو سلامت رکھے۔ تمام گاؤں تھا ہر ایک فرد و بشر کے
دل میں افسوس تھا۔ کہ یہ کیا معاملہ ہوا؟ یہ بی بی تو اس مصیبت کے لائق
نہ تھی۔ یہ تو غریب لوگ تھے۔ ان کے علاوہ اور جو بھی رشتہ دار اس خبر کو
سنتے ہاتھ ملتے افسوس کرتے اور میری ملاقات پر مجھے دیکھتے اور آنسو
بہاتے۔ میرا دل بھی اپنے مہربان لوگوں کی ہمدردی سے متاثر ہوتا تھا کسی
وقت دل بے قابو ہو جاتا۔ پھر صبر کرتی۔ لیکن بعض وقت تو بہت بے صبر
ہو جاتی تھی۔ کبھی تہیہ کر لیتی۔ کہ کسی سے سامنا نہ کرونگی۔ نہ مجھے کوئی دیکھے
اور نہ رنج و راحت کی گفتگو سنے۔

دل چاہتا ہے خاک میں مل جاؤں اسقدر
پیدا نہ ہو حشر کے دن تک نشاں کوئی

چوٹ جو دل کو لگے آہِ رسا پیدا ہو
صدمہ شیشے میں جو پہنچے تو صدا پیدا ہو

غرضکہ چاروں طرف میاں صاحب کے نکاح اور میری رضا مندی پر عزیز و اقارب متعجب ہو رہے تھے۔ کہ اس راحت خوشی کی زندگی میں اتنا حوصلہ بیبہ سب کس طرح ایک خوش مزاج ناز پروردہ نے برداشت کر رکھا ہے۔ جب کبھی بیں کسی سوسائٹی میں جاتی اور سجادہ بیگم بھی میرے ساتھ ہوتی۔ تو لوگوں میں ایک ہلچل سی مچ جاتی۔ اہلِ محفل کبھی مجھ کو دیکھتیں اور کبھی سجادہ کا اندازہ لگاتیں۔ مگر وہ نیک سجادہ بھی میرے حکم کی اسقدر تعمیل کرتی کہ دیکھنے والے اس حالت پر حیران ہوتے۔ اور ہمارے اتفاق پر شاباش کہتے۔ ایک برس کے بعد اللہ تعالیٰ نے سجادہ بیگم کو ایک فرزند عطا کیا۔ اب ہر شخص میری اس جد وجہد اور صدا قت پرستش عش کرنے لگا۔

میاں قمرالزماں کو جو شخص مبارک باد دیتا۔ یا خوشی کا اظہار کرتا۔ تو وہ میری طرف اشارہ کر کے کہتے۔ یہ سب مبارکباد ان کیلئے ہے۔ میاں صاحب بچے کو میری گود میں دیکھ کر ازحد خوش ہوتے اور میں جو جی چاہتا بچے کی تقریب میں خوشیاں مناتی جیسی پر تمام عزیز جمع ہوئے۔ سب نے اسکو میرا بچہ تصوّر کر لیا تھا۔ میرے نام سے میری طرف سے بچہ کی خوشی میں شامل ہوئے میں خوش تھی۔ میاں قمرالزماں اب اور زیادہ مجھ پر مہربان ہو گئے۔ میری مرضی کے بغیر کسی کی طرف اشارہ تک نہ کرتے۔ جو کچھ بھی گھر میں ہوتا میرے حکم

سے ہوتا۔ اس صورت میں نہ مجھے وہ رنج تھا جو اکثر ایسے معاملات میں ہُوا کرتا ہے۔ اور نہ میرے والدین کو کوئی تکلیف یا دکھ محسوس ہُوا۔ میرے والدین سجادہ بیگم کو اپنی مرحومہ بیٹی کے برابر سمجھنے۔ اور بچے کو دیکھ کر خوش ہونے۔ اور بالکل میری اولاد کی طرح محبت کرتے تھے یہ دل کی صفائی اور اتفاق کا اثر تھا۔ جو میری بدبختی پر حاوی ہو گیا۔ بقولِ شاعر ؎

شکلِ اطمینان کب اس عالمِ فانی میں ہے
کامیابی بھی جہاں میں اک پریشانی میں ہے

مگر اس عالمِ مسرت میں میاں قمر الزماں نے اپنی شراب بڑھا دی دن رات بدمست رہنے لگے۔ کبھی کبھی کام میں بھی کوتاہی کر جانے۔ منشی و ملازم لوگ بے خوف ہو گئے۔ کچھ کچھ نقصان ہونا شروع ہو گیا۔ اب اگرچہ میری طبیعت بچے کی خوشی اور گھر میں رونق دیکھکر بہل گئی تھی۔ اور بچے کی وجہ سے مجھے ہر کام میں راحت محسوس ہونے لگی تھی۔ اِدھر سجادہ بیگم بھی میری ازحد تابعداری کرتی تھی۔ مگر تقدیر کب چین لینے دیتی ہے۔ اس شادی کے بعد مجھے میاں قمر الزماں کی مصیبت چوبیس گھنٹے حیران کرنے لگی۔

اس صورتِ حال میں انسان کے لئے بہتر وقت وہ ہے۔ جو آپس میں اتفاق و محبت سے گذرے۔ چونکہ میرا دل خاوند کی محبت اور تابعداری اور انصاف و مہربانی سے پُر تھا۔ بخل اور حسد۔ فضولیات اور ذرہ ذرہ سی باتوں پر جلنا بفضلِ خدا میری طبیعت میں نہ تھا۔ میں تمام دن بچے کی پرورش میں لگی رہتی۔ باوجود اپنی دلی پریشانی کے کوئی تکلیف محسوس نہ کرتی تھی

میں ہمیشہ ہی درگزر کر کے اپنے وقت کو آرام وتسلی سے نبھانے کی کوشش
کرتی رہی۔ انسان جس بات میں خداوند کریم کو ضامن رکھتا ہے اور اسکی
مہربانی کا شکر اور اسکے حکم کی ذرہ بھر بھی تعمیل کرتا ہے۔ تو وہ رب العلمین
ضرور اس پر رحمت کرتا ہے۔ ہم گناہ گاروں سے اگرچہ تعمیل ارشاد
کب ہو سکتی ہے؟۔ مگر حتی الوسع خدا کے خوف سے کسی نہ کسی وقت ڈرنا
اور شیطان کے وسوسے سے دلکو بچانا۔ بُری صحبت اور خوشامد کی
باتوں سے پرہیز کرنا چاہیئے۔ اکثر امیر گھروں میں بعض ایسی عورتیں ہوتی ہیں
جو محض اپنی اغراض کیلیئے خواہ مخواہ ایسے رشتہ میں پھوٹ ڈال دیا کرتی
ہیں۔ ان کے آپس میں فساد ہو جایا کرتے ہیں۔ اس لئے میں کسی کو اپنے
اور سجادہ بیگم کے درمیان دخل انداز نہ ہونے دیتی تھی۔ اور نہ کسی کی
ایسی صحبت کو پسند کرتی تھی۔ سجادہ بیگم بھی میرے کہنے سننے یا حکم کے
بغیر کسی کام میں دخل نہ دیتی تھی۔ غرضیکہ دونو طرف ایسا سلوک تھا۔ کہ
دل جلانے والی کوئی بات نہ تھی۔ ادھر میاں قمرالزماں بھی پورے انصاف
سے چلتے۔ اور جو کچھ مجھ سے وعدہ کر رکھا تھا۔ اُسے ایک منٹ کیلیئے
نہ بھولتے۔ اسلیئے میری حکومت میں کوئی فرق نہ آیا۔ میں نے بھی سجادہ بیگم
کو ہر طرح اپنی ہم نشین بنائے رکھا۔ ہر ایک ضروریات خاوند سے زیادہ
سوتن کو بہم پہنچاتی تھی۔ اس کو خوش رکھنا میں نے اپنا فرض اولین سمجھ رکھا
تھا۔ اس صورت میں وقت بہت سہولت اور خوشی سے گزرتا رہا۔
کسی وقت میاں قمرالزماں کی طبیعت درست ہوتی۔ تو مجھے مسرت کا زمانہ

اور اپنے تمام کھیل کود کے سلسلے اور سیر و سیاحت کا رنگ یاد آجاتا کبھی
ہم دونو باغ کی سیر کو چلی جاتیں۔ اور تازہ پھل توڑ کر ان میں سے جام چٹنی
مربہ اور جوس وغیرہ تیار کرتیں۔ اور کبھی مچھلی پکڑنے نہر پر چلی جاتیں۔
ایسے شغل کسی نہ کسی وقت زندہ دلی کا اظہار کر دیتے۔ میں دل میں سوچا
کرتی تھی کہ خدا نے انسان کیواسطے بہت سی چیزیں پیدا کیں ہیں۔ مگر ایک
چیز لاثانی ہے۔ یعنی محبّت۔ جو دونوں جہان میں انسان کو کامیاب رکھیگی
یہ سب سے بڑا عطیہ ہے۔ اگر دنیا میں یہ چیز میسر آجائے تو ہر حال میں
زندگی خوشی سے بسر ہو سکتی ہے۔ اور مرنے کے بعد ہم اپنے مالکِ حقیقی
کے پاس بھی محبّت ہی پیش کرینگے۔ ایک معتبر حدیث ہے "کہ جس کے
دل میں انسانوں کا احساس نہیں۔ وہ انسان نہیں ہے حیوان سے بدتر
ہے" حیوان میں بھی خدا نے محبّت دی ہے۔ غرض کہ میرا وقت بہت اچھا گزرتا
رہا۔ مگر میاں قمرالزماں ہر وقت نشے میں غرق رہنے لگے کہیں گرے،
کہیں پڑے۔ میں دن رات خبرگیری میں مصروف رہا کرتی تھی۔ اس صورت
حالات میں اور کسی کام کی نہ سوجھتی۔ بلکہ ملنے ملانے سے بھی پرہیز کرنے لگی
سہیلیوں۔ بہنوں اور سوسائٹی کے سلسلے ختم کرنے پڑے۔

کبھی کبھی میاں قمرالزماں کو سمجھاتے ہوئے لڑائی فساد بھی ہو جاتا
تھا۔ ایک دفعہ گرمی شدت سے پڑنے لگی۔ جون کا مہینہ تھا۔ فصل کی
کٹائی سے فارغ ہوتے ہی ہم نے پہاڑ پر جانے کا ارادہ کیا۔ حسبِ دستور
میاں قمرالزماں فرمانے لگے۔ کہ اب کی دفعہ ہم گلمرگ کی سیر کریں گے۔

پختہ تیاری ہوگئی ہیں نے سب ضروریات کی چیزیں بند کیں۔ صبح کا ناشتہ تیار کروا کر چائے سے فارغ ہو کر کھانے کا سامان ٹفن باسکٹ میں بند کیا۔ اور ریلوے سٹیشن پر پہنچے۔ ٹکٹ خریدے اور سفر شروع کر دیا۔ جہلم پہنچے۔ ریل کی سڑک جو بارہ مولا ہو کر راولپنڈی کو جاتی ہے وہاں سے ربڑ ٹائر تانگے میں بچے اور سجادہ بیگم کو بٹھا دیا۔ میں اور میاں قمر الزماں دوسرے تانگے میں بیٹھے۔ یہ سڑک بہت لمبی اور صاف تھی۔ دونوں طرف سفیدے کے درخت بہار دے رہے تھے۔ سفیدوں کی قطار کے باہر کی جانب چاولوں کی فصل جو کشمیری علاقہ میں اکثر پیدا ہوتی ہے لہلہا رہی تھی۔ بارہ مولا والی سڑک چھوڑ کر ہم گلمرگ والی سڑک پر اترے۔ تین چار میل کی مسافت طے کر کے عجیب دلکش تر و تازہ سر سبز فصلوں والے پر فضا قصبہ میں پہنچے۔ راستہ بے حد خوبصورت تھا۔ جا بجا چشمے جاری تھے۔ اور پہاڑوں کی بلند بالا کا جواب نہ تھا۔ ابھی راستہ ختم نہ ہوا تھا۔ کہ کوہ ہمالیہ کی چوٹیاں دکھائی دینے لگیں۔ خاصکر سفر اور یہ پہاڑ کا سفر مجھے بہت پسند آیا۔ میاں قمر الزماں کو جوں جوں پر فضا منظر دکھائی دینے لگے وہ بیگب پر بیگب پی پی کر ہواس باختہ ہو رہے تھے۔ خیر ہم منزل مقصود پر پہنچ گئے۔ یہاں ایک چھوٹی سی کوٹھی میاں قمر الزماں کے دوست نے ہماری آمد سے پہلے سجا رکھی تھی۔ وہاں اترے سامان رکھا۔ غسل کیا۔ کپڑے بدلے۔ بچے کو غسل دیا۔ کھانا کھایا۔ تھوڑی دیر آرام کر کے سیر کے لئے ہم تینوں نکلے۔ چاروں طرف پھول ہی پھول دکھائی دے رہے تھے۔ مگر میرے خیالات پریشان سے تھے۔ چند گھنٹے چکر لگا کر واپس

آگئے۔ موسم نہایت شاندار اور پرفضا تھا۔ گھر آکر میاں قمرالزماں کی (جو مدہوش ہو رہے تھے) خدمت میں مصروف ہو گئی۔ میری طبیعت خراب ہو رہی تھی۔ غرض بے لطفی میں وقت گزرا۔ بچے کی صحت اور ہماری طبیعتیں گو موسم کی خنکی اور تازہ آب و ہوا سے اچھی ہو گئی تھیں۔ مگر جب میاں کی حالت بدتر دیکھتی تو بدمزہ ہو کر دل چاہتا۔ کہ ابھی واپس چلی جاؤں۔

چنانچہ ایک دن تنگ آگئی۔ انہیں نشے کی حالت میں غرقاب دیکھ کر میں نے کچھ سخت الفاظ کہہ ڈالے۔ اور پریشان ہو کر باہر جانے کا قصد کیا۔ برامدے میں کھڑی تھی۔ کہ ایک انگریز خاتون (جو ہمارے قریب کے بنگلے میں رہا کرتی تھی) اُس نے میری مغموم صورت دیکھ کر کہا۔ بیگم صاحبہ آپکی طبیعت اچھی ہے؟ میں نے کہا سر میں درد کی شکایت محسوس ہوتی ہے۔

انگریز خاتون نے کہا چلئے ذرا باہر کی ہوا کھائیں طبیعت میں تازگی آجائیگی۔ وہ جو سامنے باغ ہے اس میں چلیں۔ میں نے پھر کر دیکھا۔ تو سجادہ اپنے کمرے سے باہر آ رہی تھی۔ میں نے کہا۔ سجادہ تم میاں قمرالزماں کا خیال رکھنا۔ میں میم صاحبہ کے ساتھ سامنے والے باغ میں سیر کو جا رہی ہوں۔

ہم دونوں سیر و سیاحت کا ذکر کرتی ہوئیں باغ کی طرف چلدیں۔ باغ کی فصیل بتا رہی تھی۔ کہ اندر خاص ہی قسم کا گلستان ہو گا۔ اندر جا کر میں نے وہ منظر دیکھا جسکی تعریف سے زبان قاصر ہے۔ ہر شجر دھانی پوشاک میں ملبوس تھا۔ ہوا اپنی ترنم ریزہ موسیقی میں اٹھکھیلیاں کرتی تھی۔ غنچے کھل رہے تھے۔ پھول مسکرا رہے تھے۔ میں اس رنگین منظر کو دیکھ کر محبوط

سی ہوگئی۔ میرا دلی رنج سکون سے بدلنے لگا۔ اتنے میں ایک ملازم آیا اور کہا کہ جلد واپس آجائیے۔ میاں صاحب آپ کو یاد کر رہے ہیں؟

میں جلدی جلدی قدم اُٹھاتی ہوئی گھر میں داخل ہوئی۔ تو کیا دیکھتی ہوں کہ میاں قمرالزماں بے ہوش پڑے ہیں۔ اور جسم سے خون کے چشمے اُبل رہے ہیں۔ لباس کی دھجیاں اُڑ چکی ہیں۔ میں نے بدحواس ہو کر سجادہ سے پوچھا یہ کیا ماجرا ہے؟۔ سجادہ نے کہا۔ کہ آپ کے چلے جانے کے بعد آنکھیں کھول کر دیکھا۔ اور آپ کو پکارا۔ میں نے کہا وہ باہر مبہم صاحبہ کے پاس گئی ہیں جو ہمارے قریب رہتی ہے۔ یہ سنکر بہت ناراض ہوئے اور بڑے غضب سے کہنے لگے۔ جاؤ تم بلا لاؤ۔ میں نے آپ کی طرف ملازم بھیجدیا۔ اور خود اپنے کمرے میں چلی گئی۔ آپ ایسی حالت میں اُٹھے۔ اور وہ جو سامنے گلاب کا پیڑ ہے۔ اس کے اوپر گر گئے۔ اُٹھنے کی ہمت کہاں تھی۔ کانٹوں میں اُلجھ کر رہ گئے۔ بڑی مصیبت سے ہم نے اُٹھایا۔ تو کپڑے پھٹ کر جسم زخمی ہوگیا اب ویسے ہی پڑے ہیں۔

میاں صاحب کے اس طرح زخمی ہو جانے پر میرا دل دکھا۔ مارے رنج اور افسوس کے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ کہ الٰہی یہ کیا مصیبت ہے؟ جب ذرا ہوش میں آئے۔ تو میں نے کہا۔ یہ کیا حال بنایا ہے؟ تو کہنے لگے۔ تم کہاں گئی تھیں؟ میں نے کہا جانا کہاں تھا! آپ کی بے ہوشی نے تنگ کر رکھا ہے۔ دیکھئے تو تمام جسم زخمی ہوگیا ہے۔

میاں قمرالزماں۔ میں تمہیں تلاش کرنے گیا تھا۔ تمہاری سجادہ نے

کہا تھا۔ کہ آپا جان بہت ناراض ہوگئی ہیں۔ اس خیال سے میں نے تمہیں پکارا اور جب نہ آئی۔ تو باہر جاکر دیکھا۔

میں۔ آپ میری تلاش گلاب کی جھاڑیوں میں کرنے گئے تھے؟ گویا میں چڑیا تھی؟

اس پر میاں قمرالزماں بہت ہنسے اور خوش ہو کر کہا ؎

"چلو بس خیر جانے دو کہ ایسا ہو ہی جاتا ہے"

میں۔ اب تو ایسا ہونے کا ہر وقت اندیشہ ہے۔ یہ جو کچھ آپ نے رات دن اپنا حلیہ بگاڑ رکھا ہے۔ اسے تو وہ پنجاب کی گرمی ہی اچھی۔ یہاں تو ہر گھڑی خون خشک ہوتا رہتا ہے۔ آپ باہر جانے اور سفر کرنے کے لائق نہیں رہے بہتر ہے کہ یہاں سے چلیں۔ انہوں نے کچھ جواب نہ دیا۔

آخر کچھ وقت گزار کر ہم واپس شیخوپورہ میں آگئے۔ مگر میاں قمرالزماں کی طبیعت بدستور تھی۔ ایک دن لاہور سے پیغام آیا کہ جہاں آرا بیگم دو ہفتہ سے میعادی بخار میں مبتلا ہے۔ اس خبر کو سنتے ہی میں لاہور چلی گئی۔ آپا جان واقعی بہت کمزور ہو رہی تھی۔ مجھے ان کی حالت دیکھ کر واپس آنے کی نہ سوجھی اور وہاں ٹھہر گئی۔ آپا صاحبہ روز بروز زیادہ کمزور اور لاغر ہوتی گئیں۔ جب ان کی بیماری کی اطلاع میاں قمرالزماں تک پہنچی تو وہ بھی ایسی بیہوشی کے عالم میں اپنی ہمشیرہ صاحبہ کی عیادت کے لئے شیخوپورہ سے چلے آئے۔

میں آپا صاحبہ کی تیمارداری میں مصروف تھی۔ شیخوپورہ سے ایک ملازم منشی کا خط آیا۔ اس میں لکھا تھا۔ کہ میاں صاحب ہمشیرہ صاحبہ کی مزاج

پرسی کے لئے لاہور آرہے تھے۔ راستے میں ایک طرف گر گئے۔ پسلی میں سخت چوٹ آئی ہے۔ ہم ان کو گھر واپس لے آئے ہیں۔ ڈاکٹر کا علاج شروع ہے۔ آپ کو بلاتے ہیں۔

میں اس خبر سے بہت پریشان ہو کر اسی وقت شیخوپورہ پہنچی۔ ایسی عجیب حالت تھی۔ کہ خدا کی پناہ۔ آخر دوسرے دن یہ تجویز کی گئی۔ کہ ادھر ہمشیرہ صاحبہ کی حالت نازک ہوتی جارہی ہے اس لئے بہتر ہے کہ آپ میاں بخت نصر کے پاس لاہور ہی چلیں۔ تاکہ آپ کا باقاعدہ علاج ہو جائے۔ اور آپا جان کی تیمارداری بھی ہو سکے۔ ہم دوسرے دن لاہور پہنچے۔ میں تو اپنی ڈیوٹی پر جہاں آرا بیگم کے پاس مقیم ہو گئی۔ اور قمرالزماں صاحب میاں بخت نصر صاحب کی کوٹھی میں آرام فرما ہوئے۔ ہمشیرہ صاحبہ چونکہ بہت نیک اور مہربان طبیعت کی مالک تھیں۔ اس لئے ان کی شفقت پر تمام کنبہ کے لوگ جانثارانہ طریق پر ان کی تیمارداری کر رہے تھے۔ پھر میں تو ان کی قریبی عزیز تھی۔ میں نے دل میں ٹھان لی۔ کہ جس قدر ہو سکے ہمشیرہ صاحبہ کی خدمت میں کوئی دقیقہ باقی نہ رکھونگی۔ دو نرسیں رات کی ڈیوٹی پر متعین ہوا کرتی تھیں۔ ان کے ساتھ جہاں آپا کے دیور نواب والا گوہر کے منجھلے بیٹے بھی اپنی بڑی بھاوجہ کی تیمارداری میں مصروف رہا کرتے تھے۔ مگر مجھ سے آپا صاحبہ خاص محبت کے ساتھ اپنا کام کرایا کرتیں۔ اور کہا کرتیں۔ کہ مجھے تمہارا کام بہت پسند ہے۔ ایک شب مجھے نہایت پیار کے ساتھ رازدانہ طریق پر کہا۔ کہ دیکھو میرا ایک کام

کرنا۔ لیکن میرے یا تمہارے کسی رشتہ دار یا عزیز کو علم نہ ہو۔ جب میں نے وعدہ کر لیا۔ تو انہوں نے مجھے ایک چابی دی۔ کہ کوٹھی کی گیلری میں جو سامان پڑا ہے اس میں سے فلاں بکس کھول کر صندوقچی نکال لاؤ۔ اور اُسے میرے پلنگ کے نیچے جو ٹرنک پڑا ہے۔ اس میں رکھدینا۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔ بعد ازاں معلوم ہوا۔ کہ اس میں کچھ زیورات میموں کی شادی کے لئے تھا۔ دوسرے دن ان کی ایک سہیلی امیر جہاں جو امرتسر سے آئی ہوئی تھی۔ اس کے سپرد کر دیا۔ چنانچہ ان کے اس راز کو میں نے کسی پر ظاہر نہ کیا۔ آج اس کتاب میں درج کرتی ہوں۔ وہ نیک بی بی عقل مند اور با اخلاق تھیں۔ ان کے کنبہ میں ایسی صابرہ اور پرہیزگار اور کوئی نہ ہوگی۔ آخر کار بیماری نے موت کی شکل دکھا دی۔ موت سے چند دن پہلے انہوں نے درجہ بدرجہ سبکو وصیت کی۔ خصوصاً اپنی بچی خجستہ کی بابت۔ اور میرے متعلق بھی بہت کچھ کہا۔ میرا دل چاہتا ہے کہ جو جو ہدایات دلی اُنس کے ساتھ اس نیک بخت خاتون نے فرمائی تھیں۔ ان الفاظ کو سونے کے پانی سے لکھ کر اپنے پاس رکھوں۔ آہ افسوس دنیائے ناپائیدار نے بڑی بڑی ہستیاں فنا کر دیں۔ ہائے ہم اس جہانِ فانی میں کیا کیا دیکھتے ہیں۔ امیدوں اور خام خیالیوں پر ہی دنیا قائم ہے میری نسبت جو کچھ کلمات میری مہربان نے فرمائے تھے۔ ذیل میں درج کرتی ہوں۔ خدا مرحومہ مغفورہ کو غریق رحمت کرے۔ ان کی خندہ پیشانی اور غریب نوازی کسی وقت نہیں بھولتی۔ اپنی دونو ہمشیرگان زاہدہ بیگم اور زہرا بیگم کو اپنے

پاس بٹھا کر کہا۔ دیکھو بہنو! میری چند باتوں کو یاد رکھنا۔ جو کچھ میں وزیر سلطان کے متعلق کہتی ہوں۔" وزیر سلطان نے میری بے حد خدمت کی ہے۔ اگرچہ میں نہیں چاہتی تھی۔ کہ اس قدر تکلیف دوں۔ مگر وزیر سلطان نے باوجود بہت سے تیمارداروں کی موجودگی کے میری خدمت سب سے زیادہ کی ہے۔ چوبیس گھنٹے میری حاضری دی۔ کبھی کسی وقت بھی کوتاہی نہیں کی۔ میں اپنی عزیزہ بھاوج کی دل کی گہرائیوں سے ممنون و مشکور ہوں۔ اگر میں زندہ رہی۔ تو خود ہی اس کی خدمت کا صلہ دونگی۔ اگر موت کی آغوش نے مجھے نہ چھوڑا۔ کیونکہ میرے دل کو زندگی کی امید نہیں۔ تاہم خداوند کریم کے کرم کو پیش نظر رکھ کر کہتی ہوں۔ لہذا آخری دم تک رحمت کردگار کی امید رکھنی چاہیئے جیسا کہ اس نے فرمایا ہے لا تقنطو من رحمۃ اللہ۔ تو میرے مرنے کے بعد وزیر سلطان کو میری ہی جگہ تصوّر کرنا۔ اور ہمیشہ محبّت سے پیش آنا۔ ایک حسرت میرے دل میں باقی رہ گئی۔ کہ میں نے وزیر کو صاحب اولاد نہ دیکھا۔ خدا کی رحمت سے امید رکھنا انسانی فطرت اور قدرت کا فرمان ہے۔ اگر کوئی اولاد وزیر کے بطن سے میرے بھائی کے گھر میں ہوتی۔ تو مجھے بے اندازہ خوشی ہوتی میں نے اپنی زندگی اور صحت میں وزیر کی اولاد کی خاطر بہت کچھ جدوجہد کی۔ مگر اب بھی یہ تمنا میرے دم کے ساتھ ہے۔ اس حسرت کو ساتھ لے جاؤنگی اگر خدا وزیر کو اولاد سے شاد کردے۔ تو میری روح کو راحت ہوگی"۔ یہ کہکر آنکھوں میں آنسو بھر لئے۔ اور حسرت کی نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ ہمارے واسطے وہ ایسا خونچکاں وقت تھا۔ کہ

سے آنسوؤں کی جھڑیاں لگ گئیں۔ دوسری طرف خجستہ خصال اور میموں ماہئی بے آب کی طرح تڑپ رہے تھے۔ گویا ایک حشر برپا تھا عیادت کرنے والوں نے سب کو دلاسا دیا۔ اور بیمار کی تکلیف کے لحاظ سے خاموش کرایا۔ بخار کی شدت سے جہاں آپا کے یاقوتی لبوں پر نیلاہٹ آگئی۔ کئی ڈاکٹروں کا علاج شروع تھا۔ تمام کنبہ میں بیقراری پھیلی ہوئی تھی۔ سب کے دل میں جہاں آرا کی محبت تھی۔ اس لئے سب ہی افسردہ خاطر تھے۔ مرض بڑھتا جاتا تھا۔ مایوسی کی گھٹائیں سر پر منڈلا رہی تھیں۔ افسوس! یہ دنیا امیدوں کی جلوہ گاہ مایوسیوں کا ظلمتکدہ ہے۔ مریضہ کے خاوند صاحب بھی علاج پر بہت روپیہ خرچ کر رہے تھے۔ مگر سب بے سود تھا۔ نقاہت دن بدن بڑھنے لگی۔ آخر ایک شب کو بیہوشی کا عالم طاری ہوگیا۔ آکسیجن سے سانس دلانے کی کوشش کی گئی۔ رفتہ رفتہ ۲ بجے دم رخصت ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اسوقت ہم سب کی کیا کیفیت ہوگی۔ چیخ و پکار سے شور مچ گیا۔ ہر ایک کی آنکھ آنسوؤں سے پُرنم نظر آتی تھی۔ روتے روتے عزیزوں کی ہچکیاں بندھ گئیں کسی کو غش آرہے تھے۔ گویا تمام کنبہ کا روشن ستارہ جہاں آرا بیگم جو سسرال میں بھی سب خورد و کلاں کی مہربان اور والدین میں سب بھائی بہنوں اور بھاوجوں پر جان نثار کرنے والی تھی اس دنیا سے رخصت ہوچکی تھی۔ خجستہ خصال کے خاوند میاں غضنفر علیخان جن پر نہایت شفقت تھی۔ ان کو از حد صدمہ ہوا۔ غرضکہ سب کے سب پریشان تھے۔ اس

نیک خاتون کی مروت اور مہربانی تو غیر لوگوں کے دلوں سے بھی بھولنے والی نہ تھی۔ پھر عزیزوں کے لئے جانکاہ صدمہ کیوں نہ ہوتا۔ سب ہی ماہیٔ بے آب کی طرح بے قرار تھے ؎

مُردہ کچھ سنتا نہیں چلّا کے روتے ہیں عزیز
دم میں کتنا فاصلہ اللہ اکبر ہوگیا
اس سے بڑھکر اور عبرت کا سبق ممکن نہیں
جو نشاطِ زندگی تھے اُن کی میّت دیکھکر

مرحومہ بڑی سمجھداری کے ساتھ سب خورد و کلاں کو سنبھالے بیٹھی تھیں اب سب کے سب اِدھر اُدھر بکھر گئے۔ دانیال وہاں چلے گئے جہاں ان کی ملازمت تھی۔ زہرہ بیگم اور سب بچوں کو ساتھ لے گئے نجستہ خصال کے میاں غضنفر علی بھی چلے گئے۔ غرضیکہ گو پر روڈ کی کوٹھی ایک بیابان بن گئی۔ دانیال سے چھوٹے خان غیرت حیات خاں صاحب جن کی شادی کو چند ماہ گزرے تھے۔ جہاں آرا بیگم نے ان کی دلھن کو اپنے پاس رکھا ہوا تھا یہ بھی اپنے سسرال سے رخصت ہو کر ملازمت پر چلے گئے تھے۔ ان کے باہر جانے کا غیرت علی خاں کی بیگم صاحبہ کو بھی بہت رنج تھا۔ مگر اپنی جٹھانی صاحبہ جہاں آپا کی وفات پر وہ بھی پریشان تھی۔ جہاں آرا کے میاں بھی جہاں ان کی تبدیلی ہوگئی تھی میموں کو لے کر چلے گئے۔ غرضیکہ گو پر روڈ کی کوٹھی بالکل اُجڑ گئی۔ جس جگہ جہاں آپا کی نشست گاہ تھی۔ اب اس طرف سے گزرنے کو بھی دل نہیں چاہتا تھا۔ ہم بھی اپنے گھر واپس لوٹ آئے۔

میاں قمر الزماں کی چوٹ کو آرام آگیا تھا۔ مگر صحت بگڑ چکی تھی۔ تاہم نشے میں فرق نہ آیا۔ میری طبیعت انہیں اس حال میں دیکھ کر بے حد خراب ہوتی تھی۔ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ کہ کیا کروں۔ اکثر شراب میں زیادہ پانی ملا دیا کرتی تھی جس وقت خوب بیہوش ہو جاتے تو وسکی کی بوتل چھپا دیتی۔ اور جب کچھ وقفہ کے بعد پورے طور پر ہوش آتی تو سمجھایا کرتی تھی کہ دیکھو صاحب گاؤں میں نقصان ہو رہا ہے۔ آپ کے مدہوش رہنے سے تمام نظام درہم برہم ہو گیا ہے۔ خدا نے بچہ دیا ہے۔ اس کے واسطے بہترین سامان مہیا ہونا چاہیئے۔ مگر آپ تو بربادی پر آمادہ ہو گئے ہیں۔ اُن کے جسم میں رعشہ ہونے لگا تھا۔ بیہوشی کی حالت میں زیادہ تکلیف محسوس کرتے۔ بدن کا نپتا رہتا تھا۔

ایک دن ۴ بجے سہ پہر کو میں غسل خانے میں تھی۔ کہ ایک ہولناک آواز نے میرا دل ہلا دیا۔ مجھے غسل کرنا محال ہو گیا۔ میاں قمر الزماں ہاتھ میں تار لئے باہر کھڑے میرا انتظار کر رہے تھے۔ میں نے افسردہ صورت میں اُن کے روبرو آکر پوچھا کہ آپ نے مجھے غسلخانے کے دروازے پر کیا کہا تھا۔ کس کا انتقال ہو گیا۔

قمر الزماں۔ عنبرت علی خاں کا۔ یہ سنکر میں بے اختیار رونے لگی۔ اور گھر کی سب خدمتگاریں میرے چاروں طرف آکر بیٹھ گئیں۔ یہ اس قدر دہشت ناک خبر تھی۔ کہ میں اُسے برداشت نہ کر سکی۔ پہلے بھی پھوپھی صاحبہ مرحومہ کا ایک جوان بیٹا جس کی عمر میرے برابر تھی۔ چند برس ہوئے اس بیدرد موت کے ہاتھوں ہماری زندگیاں پریشان کر گیا تھا۔ مگر اب آناً فاناً

غیرت علی کی موت نے اور بھی خرمنِ دل پر بجلی گرادی۔ افسوس! اس جوانی کی موت نے میرے صبر و ہوش کی دنیا برباد کر دی۔ ایک ایک گذشتہ واقعات میری نگاہوں میں پھر گئے۔ آہ! ابھی غیرت میاں کی شادی کو بمشکل چار ماہ کا عرصہ ہُوا تھا۔ نوعمر بیوہ کیا کرے گی؟ اے خدا یہ کیا ہوگیا؟ آج سے ڈیڑھ ماہ پہلے تو دونوں میاں بیوی خوش و خرم تھے۔ یکدم کیا آفت آگئی۔ آپا جہاں آرا کی موت کے بعد یہ بربادی بھی دیکھنی تھی؟ ان تمام عزیزوں کی یاد سے میرے دل پر سخت چوٹ لگی۔ بیقراری میں دردبھری آہیں نکلتی تھیں اور دل بیٹھا جاتا تھا۔ رہ رہ کر ان کی محبت کی باتیں یاد آتیں۔ اسی رنج و الم میں کروٹیں بدلتے بدلتے کچھ غنودگی سی چھا گئی۔ گرمی کا موسم تھا۔ خواب میں کیا دیکھتی ہوں کہ ایک غیر معمولی جگہ ہے۔ میں ایک صحن کے کونے میں بیٹھی ہوں۔ میرے داہنی طرف ایک قبرستان ہے۔ جس میں زیرِ خاک ہزاروں نازنین سوتے ہیں۔ دوسرے کونے کی طرف برگد کا درخت ہے۔ جس کے سائے تلے ایک جوان میت قبر میں اتاری جا رہی ہے۔ چاروں طرف فاتحہ کا شور اور آنسوؤں کے طوفان اُمڈ رہے تھے کسی نے دھیمے سُروں میں یہ شعر کہے ؎

رونمائی کے لئے جب وا کئے بندِ کفن
تلملا اُٹھا میرا دل دیکھ کر جلوہ فگن
آہ غیرت کی جوانی آہ غیرت کا شباب
اسکو مٹی میں دبانا ہے اصولِ کائنات
دل یہ بولا آہ بس یہ ہے تیرا بھائی عزیز

دیکھ کر خوابیدہ نظروں سے کرواسکی تمیز

اس خواب نے مجھے گھبرا دیا۔ میں عالمِ خواب میں بلبلا رہی تھی کہ میری ملازمہ نے مجھے جگا دیا کہ بی بی ہوش کرو۔ کلمہ شریف پڑھو۔ جب میں عزیز بھائی کے انتقال پر اُن کے سسرال والوں کے پاس تعزیت کے لئے گئی۔ تو میں نے اس کی نوجوان بیوہ کے پاس تمام رات تڑپتے ہوئے بیداری میں وقت گزارا۔ ناگہانی موت بھولنے والی نہ تھی۔ مدت تک دل پر سخت صدمہ رہا۔ اب بھی جس وقت یاد آتی ہے تو ویسے ہی وہ تمام نقشے آنکھوں کے سامنے پیش ہو جاتے ہیں۔ خدا مرحوم کو غریقِ رحمت کرے۔ میرے بھولے بھالے بھائی کو جنت میں جگہ دے۔ آمین ثم آمین!

میاں قمرالزماں کو بھی غیرت علی خاں سے محبّت تھی۔ لہٰذا جب مجھے پریشان دیکھتے تو وہ بھی عزیز بھائی کی یاد میں آنسوؤں کا دریا بہاتے مگر میاں قمرالزماں کی طبیعت دن بدن کمزور ہو رہی تھی حتّٰی کہ وہ کئی کئی ہفتے نشے میں غلطان رہنے لگے۔ جب ذرا ہوش آتا۔ تو اور پی لیتے۔ میں انکی اس حالت سے بہت دُکھی ہو رہی تھی۔ مگر صبر و شکر سے کام لیتی جاتی۔ جب کوئی حاکم ملنے آتا تو اکثر اوقات میاں صاحب بیہوش ہُوا کرتے تھے۔ مجھے اُن کو ہوش میں لانا ایک مصیبت ہو جاتی تھی۔ کبھی حلق میں زبردستی عرق لیموں نچوڑا جاتا۔ کبھی سر میں پانی ڈالا جاتا۔ جب ذرا ہوش سنبھالتے۔ تو پھر لباس بدلتے شیو (حجامت) کرتے تب کہیں ملاقات کے قابل ہو کر آئے ہوئے مہمان سے ملاقاتی ہوتے۔ گاؤں کے متعلق جدوجہد جاری تھی۔ نہر کی شاخیں اپنی زمین

تک لائی گئی تھیں۔ زمین میں جو بنجر رقبے تھے۔ وہ سب زرخیز ہو رہے تھے۔ مگر انتظام خراب تھا۔ میاں قمر الزماں کی ہر وقت بے ترتیب شراب نوشی نے اندھا دھند مچا رکھی تھی۔ جسم تھر تھراتا اور آنکھیں سُرخ رہا کرتیں۔ دل ڈرتا۔ صلاح مشورہ سے بھی کام کرنے کی ہمت نہ تھی۔ اس حالت میں میری سہیلی نشاط افزا جو مجھ سے محبّت کیا کرتی تھی۔ اس کے دم سے کسی وقت میرا دل بہل جاتا تھا۔ اکثر وہ میرے حال پر متفکر ہو جاتی۔ اور اس صورتیں میرے متعلق سوچتی رہتی۔ کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے۔ میاں قمر الزماں کی حالت دن بدن ابتر ہوتی جاتی تھی۔ میاں بخت نصر صاحب کو دماغ کی بیماری تھی۔ انہوں نے دیوانہ پن میں روپیہ ضائع کرنا شروع کر دیا۔ ایک بیوپاری کو جو کوئلے کا بیوپار کرتا تھا۔ ایک لاکھ کی ہنڈی دیدی۔ وہ لیکر رفو چکر ہو گیا۔ گویا تباہ کن حالات شروع ہو گئے تھے۔

میاں بخت نصر صاحب کے ہاں تین لڑکیوں کی پیدائش کے بعد خدا نے ایک فرزند عطا کیا۔ جس کا اصلی نام محمّد سعید ہے۔ جس کی پیدائش پر سبکو بے انتہا خوشی ہوئی۔ مگر زمانہ کچھ ایسا آگیا تھا۔ کہ آمدن کی صورت بگڑ رہی تھی۔ میاں بخت نصر صاحب دماغی فتور میں مبتلا ہو گئے۔ وہ جو زمانہ بھر کے جہاں دیدہ اور عالم تھے۔ ان کا یہ حال ہو رہا تھا۔ اِدھر میاں قمر الزماں صاحب شراب نوشی سے پاگل ہو رہے تھے۔ کبھی نوکروں کو ناحق مارنا پیٹنا شروع کر دیتے۔ کبھی کسی پر خواہ مخواہ و بے وجہ فضول مہربانی کر کے روپیہ کپڑا اور گھر کا سامان تک اٹھا دیتے تھے۔ میں ان حرکات کو دیکھ کر پریشان ہوتی رہی۔

مجھے میرے کئی عزیز کہا کرتے تھے کہ اپنا ہاتھ سنبھال کر خرچ کرو۔ مگر اس بڑے پیمانہ کا انتظام عورتوں تک محدود نہ تھا۔ بہت سے منشی اور ملازم ہر کام کے منتظم تھے وہ ہاتھ رنگتے جاتے تھے۔ مگر میاں صاحب کی حالت روز بروز ابتر ہوتی رہی تھی۔ اس اثنا میں میرے والدین کو محسوس ہُوا۔ کہ جب سے بچہ پیدا ہُوا ہے۔ اس کی کوئی خوشی ان کے وطن میں نہیں ہوئی۔ اس نبا پر انہوں نے مجھے لکھا "کہ اب کی تقریب ہمارے پاس آکر کرو۔ تم سجادہ بیگم اور بچے کو لے کر آؤ۔ چند دن رہو اور عید کی خوشی ہمارے گھر میں مناؤ"۔ مجھے اس پیغام سے بے حد خوشی ہوئی۔ میاں قمرالزماں نے بسر وچشم میرے والدین کی خوشی کو منظور کر لیا۔ اور وعدہ کر لیا۔ کہ ہم عید سے ایک ہفتہ پیشتر آپ کے پاس آجائیں گے۔

چنانچہ ۱۹۱۲ء میں دیوالی اور عید الضحیٰ یہ دونوں تہوار قریب قریب تھے۔ میں نے بھی دل میں سوچا کہ میرے والدین کو خوشی ہو گی میرا بچہ سمجھکر وہ اس بچے کی خوشی کرنا چاہتے ہیں۔ بہتر ہو گا۔ کہ میں کچھ دن پیشتر ہی اُن کے پاس چلی جاؤں۔ لہذا میں نے سجادہ بیگم کو کہا۔ کہ میں نے کچھ ضروری کپڑے وغیرہ خرید کر سلوانے ہیں اس لئے بہتر ہے۔ کہ میں چند دن پہلے چلی جاؤں۔ تم میاں قمرالزماں کے ساتھ آنا۔

میں نے سجادہ بیگم سے یہ مشورہ کر کے اپنے کپڑے عید کے موقعہ پر پہننے کے لئے ساتھ رکھے۔ اور قمرالزماں صاحب سے اجازت چاہی تو انہوں نے کہا جس طرح چاہو کرو۔ عید پر میرے واسطے دو کوٹوں کا کپڑا خرید کر درزی کو

دے دینا۔ تاکہ میرے آنے تک تیار ہو جائیں۔

میں۔ بہت اچھا۔

قمر الزماں ۔ دیپ مالا کی منڈی جو امرت سر میں ہوا کرتی ہے ۔میں نے اس منڈی سے کچھ مال خریدنا ہے ۔ کچھ گھوڑے اور ہل چلانے والے بیل وغیرہ۔ اب کے شتر منڈی عید سے بیشتر ہو گی۔ یہاں سے جو مال فروخت کرنے والا ہو گا۔ اسکو تین چار یوم تک روانہ کر دیا جائے گا۔ اور میں اس مال کے پہنچنے پر جب منشی جی اطلاع دیں گے۔ تو یہاں سے چلوں گا۔ اور پھر عید سے چند یوم پہلے تمہارے پاس پہنچ جاؤنگا۔ موسم اچھا ہے۔ وہاں میاں افتخار کو ساتھ لیکر شکار کھیلنے جائیں گے۔

میں نے کہا۔ بہت بہتر۔ سجادہ اور بچے کو پہلے بھجدینا۔

قمر الزماں ۔ یہ تمہارا اختیار ہے۔ دل چاہے تو ابھی لے جاؤ۔

میں۔ نہیں۔ آپ کی خبر گیری کا بھی توخیال ہے۔ کیونکہ آپ جو گرتے پڑتے رہتے ہیں۔

میاں قمر الزماں ہنس کر۔ اگر کہو تو ایک جگہ ہی آرام کریں۔

میں۔ ہاں وہ آرام قدرے بہتر ہوتا ہے۔ یعنی حواس باختہ ہو کر پڑے رہنا۔

میاں قمر الزماں۔ پھر گرنے پڑنے کا تو خطرہ نہیں رہتا۔

میں۔ خدا کے واسطے اپنے ہوش بجا رکھنا۔ چند دن سے آپ کی طبیعت اچھی ہے۔ اسی لئے مجھے کچھ اطمینان سا ہو گیا ہے۔

میاں قمرالزماں ہاتھ میں ہاتھ لیکر بولے - اچھا خدا حافظ۔ جاؤ! میں اسٹیشن تک ساتھ چلوں؟

میں۔ نہیں ضرورت کیا ہے؟ آپ تکلیف نہ کیجئے!

چاروں طرف سبزدھانی رنگ چاولوں کی فصل کے سمندر لہرا رہے تھے۔ میاں قمرالزماں صاحب کندھے پر بندوق رکھے میری لینڈو گاڑی کے ساتھ ساتھ چلے آئے۔ میں اسٹیشن کو جا رہی تھی۔ وہ باتیں کرتے جاتے تھے۔ اور ساتھ ساتھ زمین دکھیت بھی دکھاتے جاتے۔ کہ دیکھو میں نے نہر کے پانی سے اپنی زمین کو سیراب کرکے فائدہ اُٹھایا ہے۔ اب کے سال کئی ہزار من چاولوں کی کاشت ہونے کی امید ہے۔

میں یہ سنکر خوش ہوئی۔ انہوں نے دوسرا راستہ اختیار کرتے وقت کہا۔ خدا حافظ اور میری طرف پیٹھ پھیر دی۔ مجھے کسی آواز نے کہا "اچھی طرح سے دیکھ لے"!

میں چند منٹ میں اسٹیشن پر پہنچ گئی۔ جو ہمارے گاؤں سے کوئی ڈیڑھ میل کے فاصلہ پر تھا۔ میرے ساتھ دو ملازم اور ایک ملازمہ تھی ٹکٹ لیا۔ سوار ہوگئے۔ اپنے وطن میں پہنچے۔ وہاں میرے والدین منتظر تھے۔ انہوں نے کھانے تیار کرکے رکھے ہوئے تھے۔ ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ والدین میری آمد پر بے حد خوش تھے۔ ان کا تقاضہ تھا۔ کہ جلدی سجادہ اور بچے کو بھی بلاؤ۔ میں نے دوسرے دن خط لکھا۔ کہ سجادہ اور بچے کو جلدی روانہ کردو۔ چنانچہ سجادہ نے جواب لکھا۔ کہ میاں صاحب تو آج پھر اسی دور

ہیں مبتلا ہیں۔ جب ذرا ہوش آئیگا۔ تو امرت سر روانہ ہوں گے اور مجھے بھی ساتھ لائیں گے۔ میں آپ کے پاس براہِ راست آجاؤں گی۔ اور یہ چند دن منڈی میں ٹھہریں گے۔ منڈی کی پختہ تیاری ہوگئی ہے۔ مال فروخت کرنے والا یہاں سے آج روانہ ہوجائیگا۔

ایک دن میں میری سہیلی نشاط افزا نے مجھے کہا کہ آج تھیٹر کا کھیل بہت اچھا ہے۔ اگر آپ بھی ساتھ چلیں۔ تو ہمیں بہت لطف آئیگا۔

میں۔ والدہ صاحبہ سے پوچھئے! میں اُن کے حکم کے بغیر نہیں جا سکتی۔ چنانچہ والدہ صاحبہ سے انہوں نے اجازت چاہی۔ تو انہوں نے کہا۔

والدہ صاحبہ۔ بیٹی نشاط افزا! ہماری آزادی کا لوگوں میں چرچا ہوجائے گا۔ اگر میاں قمرالزماں یہاں ہوتے۔ تو بیشک چلی جاتی۔

نشاط افزا۔ آپ تو پرانے خیال لئے جاتی ہیں۔ بہن صاحبہ نئی روشنی کی دلدادہ ہیں۔ آپ اجازت دیدیجئے۔ تو عنایت ہوگی۔

اتنے میں نشاط افزا کی دوسری سہیلی بھی آگئی۔ والدہ صاحبہ کو خوب منت وخوشامد سے خوش کیا۔ اس پر مجھے اجازت مل گئی۔

میں نے لباس تبدیل کیا۔ بسنتی رنگ کی گرم ساڑھی پہنی۔ اور اُسکے مطابق زیور پہنا۔ خوشبو لگائی۔ بال بنائے۔ بالکل تیار ہوکر بیٹھ گئی۔ اتنے میں نشاط افزا اور اسکی چند سہیلیاں لینڈو گاڑی میں سوار ہوکر کھٹ کھٹ کرتی آپہنچیں۔ سب عیش وخوشی میں مست ہورہی تھیں اور بہت اعلےٰ لباس میں ملبوس تھیں۔ مجھے دیکھ کر اور بھی خوش ہوگئیں۔ والدہ صاحبہ کو سلام

کر کے میرے پاس آگئیں کہنے لگیں۔ تمہاری موجودگی میں ایسی صحبتیں خوب لطف دیتی ہیں۔

میں اُن کی محبت کا شکریہ ادا کرتی ہوئی اٹھی۔ اور پان کی گلوریاں بنا کر پیش کیں۔ نشاط افزا نے گلوری منہ میں ڈال کر کہا۔ چلو بھئی اب دیر ہو رہی ہے۔

نشاط افزا مجھے دل کی گہرائیوں سے بالکل سچی محبت کیا کرتی تھی۔ اور مجھے بھی ناز تھا۔ کہ اس دنیا میں ایسی سہیلیاں کسی کی کم ہونگی۔ گویا وہ میری شیدائی اور پرستار تھی جس چیز پر میرا اشارہ ہوتا۔ بس وہ میری موروثی ہو جاتی۔ نشاط اور اسکی دوسری سہیلی مجھے بڑی محبت اور تپاک سے دروازہ تک گلے میں ہاتھ ڈالے ہوئے لے گئی۔ پھر ہم سب لینڈو گاڑی میں سوار ہو کر تھیٹر پہنچیں۔ نشاط افزا نے میری خاطر درجہ زنانہ میں صوفہ سٹ ریزرو کئے ہوئے تھے۔ ہم سب سہیلیاں وہاں بیٹھ گئیں۔ ایک دوسری سے پُرمذاق گفتگو ہوتی رہی۔ معلوم ہوتا تھا۔ کہ میں حُوروں کے ساتھ کھیل رہی ہوں۔ یا سنہری بادلوں میں اُڑ رہی ہوں۔ ایسی پُرسرور محفل تھی۔ کہ اس شب تار کی نورانی سحر ہونے تک میری روح تفویت بخش مسرت میں ایسی مسحور رہی جیسے میں نہیں سمجھتی تھی۔ کہ آیا یہ سرور نشاط افزا کی محبت کا تھا یا میری ذاتی امارت کا۔ خیر جو کچھ بھی تھا مگر وہ حسین سماں تھا جو میرے دل اور آنکھوں میں اب تک نقش ہے۔ اس پر دلآویز نغمے جو تھیٹر کی جان تھے۔ سُن سنکر طبیعت میں عجیب قسم کا کیف پیدا ہو گیا۔

مگر آہ! ان بشاش گھڑیوں میں بھی جبکہ میرا دل مسرت سے لبریز تھا۔ میری روح میں اضطراب کی لہریں دوڑ رہی تھیں۔ میاں قمرالزماں کا خیال آتے ہی رخصت کا منظر میری نگاہوں میں پھر جاتا۔ اس پریشان وسوسہ پر غور کرتے ہی میری خوشیاں کافور ہو جاتیں۔ خیر ہم خیبر سے اسی طرح خوش وخرم واپس آگئیں۔

ہر گھڑی مجھے خط کا انتظار تھا۔ دوسرے دن خط آیا۔ کہ میاں صاحب تو جسدن سے آپ گئی ہیں بے ہوش پڑے ہیں۔ جب ذرا ہوش آتا ہے۔ اور پی لیتے ہیں۔ بہتر ہوگا کہ آپ ایک تار دیں۔ شاید اس طرح ان کو ہوش آجائے۔ تار کی خبر پر غور کر کے اکثر ہوش میں آجایا کرتے ہیں۔ میں نے تار دیدیا۔ تو اس کا جواب آیا۔ کہ میں آرہا ہوں۔ میرا دل بے حد خوش تھا۔ میں نے کھانے کے لئے انکے حسب پسند چیزیں تیار کروائیں۔ صبح سے شام تک انتظار میں گزر گیا۔ عصر کی نماز سے فارغ ہو کر میں جانماز پر بیٹھی تھی۔ کہ میرے کان میں رونے کی صدائیں آئیں۔ میں اٹھی اور جلدی جلدی زینہ طے کرتے ہوئے ایک کھڑکی سے بازار کی طرف دیکھنے لگی۔ کیا دیکھتی ہوں کہ ایک عورت جس نے پھولکاری اوڑھی ہوئی ہے چند ہندو عورتیں اسکے ساتھ روتی پیٹتی جارہی ہیں۔ میں نے پڑوسن سے دریافت کیا۔ تو معلوم ہوا۔ کہ یہ ایک ہندو بیوہ ہے۔ اسکو اس کے والدین اپنے رواج کے مطابق گھر لے جارہے ہیں۔ یہ سب میکے کی عورتیں ساتھ روتی جاتی ہیں۔ یہ سنکر مجھ پر افسردگی سی چھا گئی۔ ایسا معلوم ہوا۔ کہ یہ صدمہ

میرے دل پر اثر کر رہا ہے ۔ مگر میں نے ایک فضول وسوسہ سمجھ کر دل کو اطمینان دیا ۔ تار کے حروف کو یاد کر کے کہ وہ تو مع بچہ اور بیگم کے میرے پاس آ رہے ہیں ۔ عیدیں ابھی تین دن باقی ہیں ۔ آج شب کو دس بجے کی ٹرین میں ضرور یہاں پہنچ جائیں گے ۔ اس خیال سے میں نے اوپر کی منزل میں پلنگ بچھایا ۔ اور میز پر ان کے ضروریات کی چیزیں رکھیں ۔ پھل اور مٹھائیاں سب کچھ منگوا چکی تھی ۔ اتنے میں زہرہ اور نشاط دونوں آ گئیں کہنے لگیں ۔ کیا کر رہی ہو؟ والدہ صاحبہ نے کہا آج خیر سے میاں قمر الزماں تشریف لائیں گے ۔ صبح تار آیا ہے اس لئے اوپر بستر وغیرہ درست کر رہی ہیں ۔ وہ اوپر آ گئیں ۔

نشاط :۔ واہ جی ! آج تو میاں کے انتظار میں خوب آراستہ ہوئی ہو ۔ (گلے سے پھولوں کا ہار اُتار کر) لو یہ پہن لو !

میں ۔ رہنے بھی دو ایسی مذاق بازی کو ۔

نشاط افزا ۔ اچھا کس ٹرین سے آدیں گے ؟

میں ۔ آج رات دس بجے والی ٹرین میں !

نشاط :۔ کیا سٹیشن پر چلو گی ؟

میں ۔ دل تو چاہتا ہے ۔ مگر ابا جی سے شرم آتی ہے ۔

نشاط افزا ۔ اگر صلاح ہو ۔ تو میں اپنی گاڑی بھیج دوں ؟

میں ۔ دیکھا جائیگا ۔ مناسب نہیں ۔ ملازم سٹیشن پر چلا جائے گا ۔

یہ باتیں کرتے کرتے کچھ وقت گزر گیا ۔ والد صاحب باہر سے

تشریف لائے۔ کہنے لگے۔ وزیر بیٹا تم کھانا کس وقت کھاؤ گی؟
ہیں۔ ابا جان میں اور آپ ابھی کھا لیتے ہیں۔ اُن کا ٹھیک پتہ
نہیں، رات کو کسی ٹرین میں آویں۔ یا صبح آئیں۔ کیونکہ چلتے چلتے بھی
رُک جایا کرتے ہیں۔
میں اور والد صاحب نے کھانا کھایا اور فارغ ہو کر انتظار کرنے
لگے۔ ذرا سی آہٹ ہوتی تو میں متوجہ ہو جاتی۔ اسی طرح انتظار کرتے
کرتے میں اپنے والدین کے کمرے ہی میں سو گئی۔ ایک بجے کا وقت ہوگا
یکایک میری آنکھیں ایسی کھلیں جیسے میں کبھی سوئی ہی نہ تھی۔ نومبر کا مہینہ
تھا۔ اس کے باوجود مجھے اس قدر سخت گرمی محسوس ہوئی۔ کہ میں نے
رضائی کو یک لخت اتار دیا۔ چاروں طرف دیکھا۔ سب سو رہے تھے۔
چند منٹ حراساں رہ کر پھر رضائی اوڑھ کر سو گئی۔

ساتواں باب

قمرالزماں کی موت

صبح حسب دستور پانچ بجے میری آنکھ کھلی۔ میں نماز کا ارادہ کرکے اوپر چلی گئی۔ نماز سے فارغ ہوکر نیچے اُتری۔ تو والدہ نے کہا۔ بیٹی مجھے ذرا مالش کردینا۔ میں نے کہا۔ اچھا۔ اسی دم میرے والد صاحب کا نام لیکر کسی نے آواز دی۔ میں نے والد صاحب سے کہا۔ ابّا جان! آپ کو کوئی پکارتا ہے۔ وہ اُٹھ کر باہر چلے گئے۔ دو منٹ تک خفیف آوازیں باتیں ہوتی رہیں اسکے بعد والد صاحب کمر پر ہاتھ رکھے افسردہ صورت آئے اور آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا کر مجھ سے کہنے لگے۔ میاں قمرالزماں کے دوست میاں افتخار کھڑے ہیں۔ ایک تار ہاتھ میں ہے،

کہہ رہے ہیں۔ کہ میاں قمرالزماں کا انتقال ہوگیا ہے۔ یہ سنتے ہی مجھے غش ہوگیا۔ اور پھر مجھے کچھ خبر نہ رہی۔ کہ اس خونچکاں حادثہ کے بعد میرے پاس کیا کیا ہوتا رہا۔ منہ پر پانی کے چھینٹے پڑنے سے جب مجھے ہوش آیا۔ تو کیا دیکھتی ہوں۔ میرے والد صاحب میرے سرہانے اضطراب کی حالت میں مجھے دلاسا دے رہے تھے۔ کہ بیٹی ہوش میں آؤ۔ ممکن ہے یہ خبر غلط ہو۔

میں سکتے کے عالم میں تھی۔ چاروں طرف جتنی عورتیں کھڑی تھیں کف افسوس مل کر ہیبت ناک صداؤں سے نوحہ کر رہی تھیں۔ میری والدہ صاحبہ ماہئی بے آب کی طرح تڑپتے ہوئے ادھر اُدھر گھر کے سامان کو بند کر رہی تھی۔ میری ملازمہ بیقراری کے عالم میں چیخ و پکار کرتی ہوئی مکان کے دروازوں میں قفل لگانے لگی۔

میاں افتخار صاحب قمرالزماں کے دلی خیرخواہ اور گہرے دوست تھے صحن میں بیٹھے مُنہ پر رومال لئے سخت بیقراری سے روتے ہوئے کہہ رہے تھے۔ جلدی کرو۔ ریل کا وقت بہت کم ہے۔ میں دیکھ رہی تھی۔ جیسے کوئی خواب دیکھتا ہے۔ نہ رونے کی تاب تھی نہ زبان سے کچھ کہنے کی ہمت۔ تمام جسم پتھرایا ہُوا معلوم ہو رہا تھا۔ ایک تاریک خاموشی چھائی تھی۔ میری یہ حالت دیکھ کر میرے والدین سب عورتوں کے سامنے دست بستہ ہوئے۔ اور آبدیدہ ہو کر کہا۔ آپ اس وقت اس کے سامنے نہ روئیں۔ جو کچھ ہُوا ہے ہمیں وہاں پہنچنے کی ہمت کرلینی چاہیئے۔ مگر لوگوں کے دلوں پر سخت

صدمہ تھا۔ چند منٹ ہی کا وقت ملا۔ اور مکان بند کر کے ہم سٹیشن پر پہنچے۔ عجیب بے بسی کا عالم تھا۔ ہم سب عورتیں ویٹنگ روم میں جا کر بیٹھ گئیں میاں افتخار بھی ہمارے ساتھ تھے۔ وہ میرے والد صاحب کو ہمراہ لئے ادھر اُدھر اپنی بیقراری کا وقت گزار رہے تھے۔ معلوم ہوا۔ کہ ریل تین گھنٹے لیٹ ہے۔ یہ بھی ہماری ایک اور شومئے قسمت تھی۔ کیونکہ اس وحشت ناک خبر نے مجھے دیوانہ کر دیا تھا۔ نہ مجھے موت کا یقین آتا۔ اور نہ ہی دل کو تسکین ہوتی تھی۔ غور تو بہت کرتی۔ مگر اس وقت سمجھ بیکار تھی۔ کبھی یک لخت ہذیں چیخ اُٹھتی۔ کبھی بے ہوش ہو جاتی۔ میری والدہ صاحبہ مجھے اپنی گود میں لئے بیٹھی تھیں۔ والد صاحب بار بار مجھے دیکھنے آتے۔ ان کی افسردگی ناقابلِ برداشت تھی۔ اس اثنا میں گاڑی آ گئی۔ اور ہم سب زخمی دل سوار ہوئے۔ مجھے چاروں طرف آگ کے شعلے دکھائی دیتے تھے۔ جس وقت ذرا ہوش درست ہوتے۔ تو یہ خیال آتا تھا۔ کہ وہ کیسا وقت تھا۔ جب ہم جدا ہوئے آہ یہ کیسی منحوس صبح ہے۔ جس نے مجھے یہ بدخبر سنائی۔ میرے وفادار محبوب! کیا تم مجھے اس غمکدہ میں چھوڑ گئے ہو؟ نہیں نہیں۔ یہ کسی نے تمہارے سننے کی بیہوشی میں موت کی خبر دیدی۔ تم تو زندہ ہو۔ ضرور زندہ ہو۔ میاں افتخار نے ایک اسٹیشن پر جو ہماری منزل کے قریب تھا میرے پاس آکر سمجھاتے ہوئے کہا۔ دیکھو بھولی بھالی بہن! تم صبر و تحمل رکھنا اور عقل سے کام لینا۔ اپنی خام خیالی کو دل سے نکال دو۔ سوچ اور سمجھ سے اس صدمہ کو برداشت کرو۔

میں لنکے الفاظ کی تائید تو کرتی تھی۔ مگر ایک بار اپنی دیوانگی کے عالم میں یہ بھی کہہ دیا۔ کہ بھائی جان "سادہو" کے سٹیشن پر اگر سب موجود ہونگے۔ تو تسلی ہو جائیگی۔ اگر سٹیشن کے لوگ نہ ہونگے تو پھر یقین کامل ہے۔ کہ میاں قمرالزماں کا انتقال ہو گیا ہے۔

میاں افتخار رہیں اسٹیشن سے معلوم کرونگا۔ آپ خود کو سنبھالیں۔ اتنے بڑے پیمانے کا گھر ہے۔ آپ کے سر پر پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ اتنا کہکر خاموش ہو گئے اور بات ٹالدی۔ کہ ہاں خدا پر بھروسہ رکھنا چاہیئے۔ عقل سے کام لیجئے۔

جب "سادھو" کا سٹیشن آگیا۔ تو میرے ہاتھ پاؤں لڑکھڑانے لگے میرا دل بیٹھا جاتا تھا۔ آہ میری امید دل پر ایک خزاں چھاگئی۔ میری معصوم آرزوؤں کا لہلہاتا ہوا باغ روندا گیا۔ میری تمناؤں کا قلعہ مسمار ہو گیا۔ تقدیر نے مجھ سے وہ بے بہا دولت چھین لی۔ جو کبھی لوٹ کر نہ آئے گی۔ میرے دل پر عجیب وحشت چھا رہی تھی۔ اور ایک نحوست سی میرے سر پر منڈلانے لگی۔ ہم سب ریل سے اترے۔ سٹیشن پر سنسان کا عالم تھا۔ سٹیشن ماسٹر عبدالحی صاحب اور قلی پورٹر جمعدار غرض سب ہمارے تابعدار تھے۔ موضع شیخوپورہ میں ان کی آمد و رفت کا سلسلہ ہر روز جاری رہا کرتا تھا۔ ہم سٹیشن والوں کو خوش رکھتے تھے۔ اور وقتاً فوقتاً عید پر انعام بھی تقسیم کیا کرتے تھے۔ چنانچہ وہ سب شیخوپورہ گئے ہوئے تھے۔ والد صاحب اور میاں افتخار نے مجھے اطمینان دلانے کی خاطر کہا۔ کہ سٹیشن ماسٹر یہاں ہے۔ میں نے بیتابی

سے پوچھا۔ کہ آپ شیخوپورہ کا حال دریافت کیوں نہیں کرتے ؟

" سا دہوکا" بہت چھوٹا سٹیشن تھا۔ لہذا ہم اسٹیشن ماسٹر کے کمرے میں جا کر بیٹھ گئے۔ میاں افتخار نے کانٹے والے کو بلایا اور پوچھا۔ کہ ہمارے لئے سواری کیوں نہیں آئی ؟

کانٹے والا۔ پہلی ٹرین سے اور سواریاں لیکر شیخوپورہ کو روانہ ہو گئی تھی۔ اب وہ سامنے لینڈو کی بتیاں جلتی دکھائی دیتی ہیں۔ آپ کیسے آ رہے ہیں؟

میاں افتخار۔ بتاؤ شیخوپورہ میں کیا گزری ؟

کانٹے والا۔ میاں کچھ نہ پوچھئے۔ میاں قمر الزماں وزیرزادہ مالک شیخوپورہ اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ ہم غریبوں کو اُن کا بڑا آسرا تھا۔ ہم سب سٹیشن کے لوگ صبح گئے تھے۔ جا کر دیکھا۔ تو ہمیں بڑی حیرانی ہوئی۔ کہ خدا کی قدرت اتنے بڑے امیر حاکم کی موت کس بیکسی میں ہوئی !

اس فقرہ پر قیامت بپا ہو گئی۔ ہم سب اور بھی کانٹے والے کی طرف متوجہ ہو گئے۔ میرے والد صاحب نے کہا" جلدی بتاؤ کیا ہوا تھا۔ اور کیا دیکھا تم نے ؟

کانٹے والا حضور ان کی دو بیبیاں تھیں۔ ایک تو چند دن ہوئے اپنے والدین کے ہاں عید کرنے گئی تھی۔ سننے میں آیا ہے کہ وہ بھی جانے کو تیار تھے کل دوپہر کو اُن کی دوسری بچے والی بی بی اپنے والدین کے چلی گئی۔

میاں افتخار۔ کل کس وقت ؟

جناب ایک بجے کی گاڑی میں بچّہ اور تین چار ملازم ساتھ تھے۔ سنا ہے رات کے ایک بجے بالکل تنہائی کے عالم میں انتقال ہوا۔ صرف ایک خدمتگار باہر برآمدے میں سوتا تھا۔ اور ایک بہرا جو ہر وقت ان کی خدمت میں حاضری دیتا تھا۔ فقط دو ہی آدمی تھے۔ منشی اور ملازم سبکو خود ہی کل انہوں نے اپنے اپنے کام پر بھیج دیا تھا۔ پلنگ کے سرہانے میز پر پھل رکھے ہوئے تھے۔ سر میں نیل لگا ہوا اور بال بکھرے ہوئے ایسا معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے کوئی مسافر سو رہا ہے۔ یہ دیکھ کر ہمیں بے حد رنج ہوا۔

اس جملہ پر ہم سب بے اختیار رو کر رو دئے۔ کانٹے والے کو کیا خبر تھی۔ کہ یہ کون ہیں؟ وہ بیچارہ اپنی تقریر کو ختم کر کے اُٹھ کھڑا ہوا۔ گاڑی سڑک پر آکر ٹھہر گئی۔ ہمارا کوچوان رام چند آیا۔ اور میری طرف دیکھ کر رونے لگا میرے پاؤں پر گر پڑا۔

میاں افتخار نے اس کو صبر کی تلقین کرتے ہوئے کہا۔ چلو بھائی اب ہاں بیٹھ کر رو لیں گے۔ تمام راستہ میاں افتخار رام چند کوچوان سے حال دریافت کرتے جا رہے تھے۔ اور میں بدبخت سن رہی تھی۔

رام چند۔ جی پہلے تو کل صبح ہی بڑی بیگم صاحبہ کو تار دیا۔ اور اس کے بعد چھوٹی بیگم صاحبہ کے پیچھے پڑ گئے۔ کہ تم بھی ریاسی اپنے والدین کے ہاں چلی جاؤ۔ میں حیران تھا۔ کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ بیگم صاحبہ نے کہا۔ کہ میں نہیں جاؤنگی۔ جب تک کہ بڑی بیگم صاحبہ تشریف نہ لاویں۔ وہ مجھے ناراض ہونگی اس پر خود غصّے میں آکر کہنے لگے "جاؤ ضرورت نہیں تمہاری"۔ ایسے سخت کلمے

کہنے لگے۔

میاں افتخار۔ کیا نشے کی حالت میں تھے؟

رام چند۔ حضور نشہ تو کسی وقت بھی نہیں چھوٹا۔

اتنے میں کوٹھی دکھائی دینے لگی۔ میرے دل پر چھریاں چل رہی تھیں۔ جب گاڑی پھاٹک پر آگئی۔ تو کیا دیکھتی ہوں۔ سامنے جو دیوار کے نیچے باغ کے درمیان چوک ہے وہاں قبر میں سوتے ہیں۔ میاں قمرالزماں کی قبر پر سفید چادر پڑی ہوئی تھی۔ اور سرہانے ایک چراغ جل رہا تھا۔ میں اس قبر کو دیکھ کر بدحواس ہوگئی۔ میرے والدین نے مجھے سنبھالے رکھا۔ آخر میں نے بھی اپنے ضعیف العمر والدین کی بے چینی سے متاثر ہو کر اپنے دل کو سنبھالا۔ اور اندر داخل ہوئی۔ کیا دیکھتی ہوں۔ کہ میرے ڈرائمینگ روم میں صفِ ماتم بچھی ہوئی ہے سب عزیز و اقارب عورتیں جمع ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ اور اس غضب سے ماتم شروع کیا۔ کہ خدا کی پناہ۔ میں ان سب کے درمیان کھڑی تھی۔ میرے چاروں طرف حلقہ محشر بپا تھا۔ ہر طرف سے چیخ و پکار آہ و فغاں کا شور تھا۔ آخر میں اس مجمع میں بے ہوش ہو کر گر پڑی۔ اس پر سب میری طرف متوجہ ہوگئیں اور مجھے ہوش میں لایا گیا۔

کسی نے بھرے مجمع میں مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "تم اپنے بہرے کو بلا کر اپنے سرتاج کے آخری وقت کا حال تو سُن لو۔ یہ رونا تو تمام عمر کے لئے ہے"۔

بہرے کو بلایا گیا۔ یہ ضعیف العمر برسوں سے ہمارے پاس ملازم تھا۔ اس کی جوانی کا وقت لاہور ہند و ہوٹل میں گزرا تھا۔ یہ نہایت ایمانداری سے

میاں عمرالزماں کی خدمت میں دن رات حاضر رہا کرتا تھا۔ میں اس سفید ریش سے پردہ نہیں کیا کرتی تھی۔ بہرے کا نام خوشحال تھا۔ میرے سامنے آیا۔ تو اس کے بشرے سے اسقدر رنج کے آثار نمودار تھے۔ کہ اسکا ضعیف و ناتواں چہرہ دیکھ کر میرے بھی آنسوؤں کی تار بندھ گئی۔ اور آواز گھٹ گئی۔ وہ میرے پاؤں پر گر پڑا۔ اور رو رو کر کہنے لگا۔ بیگم صاحبہ آپ کی مسرت خاک میں مل گئی۔ ع

چل بسے وہ نوجواں ہستی کے ساماں چھوڑ کر

میں نے بہرے کا سر اُٹھایا۔ اور کہا خوشحال مجھے سنا دو۔ کہ اپنے صاحب کو تم نے کیسے رخصت کیا؟

خوشحال نے بے حد آہ دفعاں کے بعد کہا۔ بیگم صاحبہ اب رات بہت گزر چکی ہے۔ اس مصیبت میں تمام گاؤں کوفت سے بے حال ہو رہا ہے میرے پاس صرف موت ہی کا حال نہیں۔ اور بھی حساب کتاب ہے۔ جو اس لاکھ پتی گھر کا میرے سپرد تھا۔ بیسیوں چیزیں اور سامان بھی آپ کو دکھانے والے ہیں۔ تمام حالات جو آپ کی غیر حاضری میں گزرے ہیں۔ سب کچھ عرض کر دونگا۔ اب اس وقت خدا کے لئے آرام کیجئے۔ یہ کہکر وہ اٹھ کھڑا ہُوا۔

میں نے اس ضعیف کو تنگ کرنا مناسب نہ سمجھا۔ جانے کی اجازت دے دی۔ اور بدحواسی کے عالم میں دل سے باتیں کرنے لگی۔ مگر میری سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا۔ اور حیران ہو رہی تھی۔ آہ جب میں نے گھر سے قدم اٹھایا تھا تو

مجھے کیا علم تھا۔ کہ میرے آنے تک یہ عشرت خانہ ماتم کدہ بن جائیگا۔ میرا دل فرطِ الم سے پھٹ رہا تھا۔ اور میں اپنی مصیبتوں کی ابتدا پر غور کر رہی تھی۔ میری مسرت کی فضاؤں پر تاریکی چھا گئی۔ میری عشرت گاہ جس میں طرح طرح کے آرام و آسائش مہیا تھے۔ اب ماتم کدہ بن گئی۔ آہ میری آرزوئیں موت کے بیدرد ہاتھوں پامال ہو گئیں۔ میرے دل کی راحت فنا ہو گئی۔ چاروں طرف ویرانی اور سنسان کا عالم تھا۔ تمام لوگ بستروں پر مزے کی نیند لے رہے تھے۔ میرا دل رنج و غم کا مسکن اور پریشان حالات پر گریہ کناں تھا۔ آہ کل کیا تھا اور آج کیا ہو گیا ؎

مٹ گیا زعمِ جوانی رہ گئیں چند حسرتیں
اڑ گیا اک آن میں رنگِ جمالِ زندگی

میرا دل غمخانہ بن گیا۔ میں وفورِ الم سے تلملا اٹھی۔ میری انجمن برباد ہو چکی تھی۔ جدھر نظر اٹھتی غم ہی غم دکھائی دیتا۔ تاہم دل میں خوشحال کی شکر گذار ہو رہی تھی۔ کہ اس نمک حلال ملازم نے آخری وقت نبھا دیا۔ منشی لوگ اور برابر کے بیٹھنے والوں سے نزع کے عالم میں کوئی بھی کام نہ آیا۔

خوشحال عقلمند آدمی تھا۔ جو ہر حالت میں میاں قمر الزماں کو سنبھالے رکھتا۔ سب چیزیں اس کے سپرد تھیں۔ وہ لمحوں میں یہ خونچکاں داستان کیسے بیان کر دیتا؟ اس کے پاس تو میری غیر حاضری میں پورے ایک ہفتہ کا حال تھا۔

رات کے دو بج چکے تھے۔ اندھیری رات نے میرے دل و دماغ کو اور بھی

تاریک کر رکھا تھا۔ میں سب کے درمیان لیٹ گئی۔ مگر اس خونچکاں وقت میں نیند کہاں تھی۔ دل ، دماغ شل ہو رہا تھا۔ بیہوشی سی طاری ہو گئی۔ کوئی تین گھنٹے اسی کوفت، سستی اور نقاہت میں بیٹھے ہوئے گزر گئے۔ پانچ بجے اٹھ بیٹھی۔ آج اس عشرت گاہ میں سب کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ مغموم صورت کوئی بستر سے اُٹھ رہا تھا۔ اور کوئی بستر میں بیٹھے ہی آہ وزاری میں مصروف تھا۔ میں اس دردانگیز منظر کو دیکھتی ہوئی اُٹھی۔ اور کوٹھی کی چھت پر چلی گئی۔ سامنے قبر دکھائی دیتی تھی۔ بالکل کوٹھی کی بیرونی دیوار کے قریب اسی چوک میں جہاں زندگی اور مسرت کے زمانے میں مجھے کہا تھا۔ کہ میں نے اس چوک میں اپنے اور تمہارے لئے قبروں کی جگہ انتخاب کی ہے۔ آہ شاید اُنہیں اس وقت فرشتۂ اجل نے یہ پیغام دیا ہو گا۔ آخر اُسی مقام پر قبر ہوئی۔

اب میں نے خوشحال کو بلایا۔ تاکہ اس سے اصلی واقعات سنوں۔

خوشحال نے آ کر سلام کیا۔ تو اس کے ہاتھ میں ایک کیش بکس اور بہت سے کاغذات کی ایک گٹھڑی سی بندھی ہوئی تھی۔

خوشحال۔ بیگم صاحبہ پہلے یہ رقم آپ مجھ سے لے لیجئے۔ میں کل سے اس بکس کی خاطر بندھا بیٹھا ہوں۔ یہ کہہ کر اس نے چابی میرے ہاتھ میں دیدی۔

خوشحال۔ کھولئے بیگم صاحبہ

میں۔ میں ہرگز نہیں کھولوں گی اور نہ چابی ہاتھ میں لونگی۔ یہ سب کچھ نابالغ بچے کی چیز ہے۔ جب تک اس میں میاں بخت نصر میرے ساتھ شامل نہ

ہوں۔ میں ہاتھ نہیں لگاؤں گی۔

خوشحال بیگم صاحبہ آپ اس گھر کی مالکہ ہیں۔ آپ کو چاہیئے۔ مجھ سے حساب لیں۔ اور پھر آپ کا اختیار ہے۔

اب میں نے کیش بکس کو کھولا۔ تو اس میں نقد روپیہ کی ایک معقول رقم تھی۔ اور کچھ کاغذات روپیہ کی وصولی اور حساب کے تھے۔ معاملہ کی رسیدیں تھیں۔ ہم گاؤں کے زمیندار مزارعان سے تیسرے حصہ کے ساتھ معاملہ وصول کیا کرتے تھے اور چند صندوقوں کی چابیاں جس میں کپڑے تھے۔ مجھے تمام چیزیں سونپ دینے کے بعد خوشحال نے کہنا شروع کیا۔

بیگم صاحبہ! آپ کے تشریف لے جاتے ہی میاں صاحب نشے میں پڑ گئے۔ اور حسب دستور بستر میں رہے۔ میں اُن کے پاس بیٹھا رہا کرتا تھا۔ جب ذرا ہوش آتی۔ تو کہتے شراب پلاؤ۔ آپ نے جیسے بتایا ہوا تھا میں کبھی عرقِ لیمن کبھی چائے کا رنگ اس میں ملا دیا کرتا۔ مگر جب کچھ ہوش میں آتے تو کہتے"۔ خوشحال تم شراب میں پانی ڈالتے ہو۔ اس سے اثر زایل ہو جاتا ہے" مگر جوں توں کر کے ٹال دیا کرتا۔ ایک دن جب ذرا ہوش آئی تو مال مویشی جو فروخت کرنے والے تھے۔ وہ سب کے سب "منڈی دیب مالا" میں امرت سر روانہ کر دئے۔ اور یہ رقم میرے سپرد کی۔ اصطبل کے بہت سے ملازم امرت سر روانہ ہو گئے۔ اور منشی جی کو حکم دیا۔ کہ ملازم مویشی لیکر پیدل جائیں گے اور تم ان کے پہنچنے پر امرت سر چلے جانا۔ خرید و فروخت کا حساب

رکھنا۔ میں بڑے منشی کو ساتھ لیکر آؤنگا۔ یہ انتظام کرکے آپ پھر نشے میں مدہوش ہو گئے۔ چھوٹی بیگم صاحبہ نے کہا۔ عید تو قریب ہے۔ میاں صاحب نہ خود جانے کا نام لیتے ہیں۔ اور نہ مجھے جانے کی اجازت دیتے ہیں۔ آپا جان کو ہمارا انتظار ہوگا۔ پھر شاید بیگم صاحبہ نے آپ کو خط لکھا۔ کہ میاں صاحب کو تار دیجیئے شاید ہوش میں آجائیں۔

میں۔ ہاں مجھے لکھا تھا۔ اچھا میرے تار آنے پر کیا کیا؟

خوشحال۔ ایک تار آپ کے تار سے پہلے امرت سر سے منشی جی کا بھی آیا تھا۔ کہ مال فروخت ہوگیا ہے۔ نیا مال مویشی گھوڑے۔ گائے بھینسیں اونٹ کی خرید تو اب آپ کی تشریف آوری پر منحصر ہے۔ آپ تشریف لے آیئے اور اپنے حسب پسند سودا کیجیئے۔ پھر جب آپ کا اور تار آگیا تو اس کے جواب میں لکھدیا۔ کہ میں آرہا ہوں۔ اس وقت کچھ ہوش تھی مجھے کہنے لگے۔ خوشحال! بیگم صاحبہ کو میرا انتظار ہوگا۔ اور میں امرتسر جارہا ہوں۔ وقت بہت کم ہے۔ ایسی باتیں کرتے کرتے یکایک چھوٹی بیگم صاحبہ کے پیچھے پڑ گئے "کہ تم چلی جاؤ۔ جلدی جاؤ" وہ کہنے لگی کہاں جاؤں؟ میاں صاحب جوش میں آکر بولے "ریاسی اپنے والدین کے ہاں چلی جاؤ"۔

چھوٹی بیگم صاحبہ حیران تھیں۔ اور میں بھی پھر بیگم صاحبہ نے پوچھا "ریاسی کیسے جاؤں ہ مجھے تو آپا جان کے پاس جانا ہے" اسپر غضبناک صورت بنا کر بولے "تم ریاسی ہی جاؤ۔ ورنہ میں بہت بری طرح پیش آؤنگا"۔ اصل میں اُنکی کی طبیعت آخری وقت درست نہ تھی۔ جو بھی کام کئے اپنے طریقہ اور دستور

کے مطابق کئے مگر میرے خیال میں حواس صحیح طور پر قائم نہ تھے غرضکہ چھوٹی بیگم صاحبہ نے پھر پوچھا۔ تو ویسے ہی کچھ الٹ پلٹ جواب دیکر مجھے حکم دیا۔ کہ یک صد روپیہ راستے کا خرچ میرے کیش بکس سے نکال دو۔ میں نے بیگم صاحبہ کو دیدیا۔ مگر بیگم صاحبہ بہت حیران تھیں۔ آخر اُنہوں نے اپنی ناتجربہ کاری کی بنا پر تیاری کر لی۔ چند ملازم ساتھ لئے۔ اور بچے کو ہمراہ لیکر روانہ ہو گئیں۔ اُن کے جانے کے ساتھ ہی گھر بالکل سنسان ہو گیا۔ کچھ ملازم امرت سر چلے گئے۔ کچھ آپ کے ساتھ اور کچھ چھوٹی بیگم صاحبہ کے ساتھ۔ بخدا شیر دل میاں صاحب نے پہلے ہی سب کو علیحدہ کر کے گھر میں ویرانی پیدا کر دی تھی۔ میں دل میں سوچتا تھا۔ کہ کبھی ایسا وقت نہیں آیا کہ کبھی کوٹھی میں اس قدر سنسنی خیز اداسی چھائی ہو۔ صرف ایک چوکی دار اور دوسرا خدمتگار میں تھا۔ اصطبل میں جو چند ملازم تھے۔ وہ کوٹھی میں نہیں آ سکتے تھے۔ اب مجھے حکم دیا۔ کہ جاؤ ایک بکرا ذبح کروا کر اس کا گوشت صاف کر کے رکھو۔ میں صبح بڑی بیگم کے پاس جاؤنگا۔ تو ہمراہ لے جاؤنگا۔ کچھ خانساماں کو دیدو۔ میرے واسطے "شب دیگ اور "سوپ" تیار کرے شب دیگ تو ہمراہ لے جاؤنگا۔ اور سوپ ابھی تیار کر دو۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔ اس کے بعد خود اُٹھکر گاؤں کی طرف گئے۔ چاولوں کے جو انبار لگے ہوئے تھے۔ ان پر "ٹھپّے" لگائے۔ کیونکہ بڑے منشی کو بھی امرت سر بھیجدیا تھا۔ لہذا یہ کام خود کیا۔ اور مجھے کہنے لگے "بہرا تم میرا بستر باہر لے آؤ۔ اندر کے کمرے تمام بند کر دو۔ کیونکہ چھوٹی بیگم بھی یہاں نہیں ہے"۔ میں نے بستر

باہر لگا دیا۔ جب خانساماں سوپ لیکر آیا۔ تو سوپ پیا۔ مگر بہت تھوڑا۔ اس پر خانساماں نے کہا۔ جناب اور بھی کچھ چاہیئے؟

میاں صاحب۔ اور کیا ہے؟

خانساماں۔ جناب صبح کے کھانے میں سے ماغوت اور مرغ کا روسٹ ہے۔ کیونکہ آپ نے صبح تو کھانا ہی نہیں کھایا تھا۔ کہنے لگے۔ اچھا لے آؤ۔ تھوڑا سا وہ بھی کھالیں گے۔ خانساماں بھاگا بھاگا لے آیا۔ کچھ تھوڑے سے لقمے سب چیزوں سے لئے اور کہا اُٹھا لو۔ پھر منہ میں سگار رکھ کر دیر تک آرام کرسی پر بیٹھے رہے۔ ذرا دیر بعد۔ کہنے لگے۔ خوشحال حقہ کہاں ہے؟ میں نے کہا۔ حضور یہاں ہی ہے۔ میں بھر کے لے آؤں؟ جواب دیا۔ نہیں رہنے دو۔ یہ کہہ کر غسل خانہ کی طرف گئے۔ واپس آکر پلنگ پر لیٹ گئے۔ میں نے بھی وہیں قالین پر بستر لگا لیا۔

عالمگیر (خدمتگار) مجھے پوچھنے لگا۔ بھائی تم کہاں سوؤ گے؟ میں نے کہا۔ اسی کمرے میں۔ عالمگیر نے کہا۔ بھائی میں تو میاں صاحب کے کمرے میں نہیں سوتا۔ برآمدے میں سو جاؤں گا۔ میں نے کہا۔ کہ اچھا سو جاؤ۔ ہم دونوں سو گئے۔ رات کے ایک بجے میاں ثمرالزماں نے مجھے پکارا۔ خوشحال! میں اُٹھ کھڑا ہوا۔

میں۔ حضور کیا حکم ہے؟

میاں صاحب۔ چلم بھر دو۔

میں نے جلدی سے حقہ بھرا۔ پلنگ کے ساتھ لگا کر رکھ دیا۔ میاں صاحب

نے حقے کا کش لگایا۔ اور مجھے کہا سو جاؤ بہرا!!

میں پھر بستر میں آگیا۔ ذرا دیر بعد پھر آواز دی۔ کہ خوشحال! ذرا عالمگیر کو بلاؤ۔ میں نے عالمگیر کو بلایا۔ وہ آگیا۔ میں نے کہا۔ عالمگیر حاضر ہے! تو کہا "میرے پاؤں دباؤ" وہ پاؤں دبانے لگا۔ اور آپ سو گئے۔ عالمگیر نے جب اندازہ کر لیا۔ کہ اب سو گئے ہیں۔ تو آہستہ سے اُٹھ کر اپنے بستر میں چلا گیا۔ اس وقت کلاک نے دو بجائے تھے۔ میں نے سونے کی کوشش کی۔ مگر مجھے نیند نہ آئی۔ ایک دفعہ پھر اُن کے بستر میں جنبش سی معلوم ہوئی۔ اور حقہ جو پلنگ کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ میں نے اس پر میاں صاحب کے ہاتھ لگنے کی آہٹ محسوس کی۔ مگر خاموش رہا۔ خیال کیا۔ کہ جب نیند میں بیخود ہو جائیں گے۔ تو اسے پلنگ سے ہٹا لونگا۔ میں میاں صاحب کے حالات پر غور کرتا رہا۔ یہاں تک کہ کلاک نے چار بجا دئے۔ میں آہستہ سے اُٹھا۔ اور حقے کو اٹھانے کی کوشش میں پلنگ کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ جرأت کر رہا تھا۔ کہ خاموشی کا باعث معلوم کرو۔ اس کشمکش میں اُن کے اور قریب ہو گیا۔ مگر جب مجھے سانس کی رفتار بالکل بند معلوم ہوئی۔ تو میں نے خوف زدہ ہو کر خدمتگار عالمگیر کو بیدار کیا۔ کہ اُٹھو ذرا میاں صاحب کو دیکھو!

وہ نوعمر لڑکا تھا۔ اس نے مجھے کہا بھلا میں کیا دیکھوں! میں اسکا ہاتھ پکڑ کر میاں صاحب کے پلنگ کے پاس لے آیا۔ تو وہ بھی کچھ حیران سا ہو گیا۔ مگر کمسن لڑکا تھا۔ پلنگ سے دور ہٹ کر کہنے لگا۔ بہرا! تم صبح ہمیں جوتیاں لگوا دو گے۔ خدا معلوم نشے میں بیہوشی کا عالم طاری ہے

مَیں نے کہا۔ نہیں۔ یہ بیہوشی تو میری سمجھ میں نہیں آتی۔ یہ کہہ کر مَیں نے چوکیدار کو جو گشت پر تھا۔ آواز دی اور کہا۔ کہ جلدی گاؤں میں جا کر مولوی شاہ محمدؐ صاحب کو بلا لاؤ۔ کہنا کہ میاں صاحب یاد فرما رہے ہیں۔ جلدی آجائیں۔ چنانچہ مولوی صاحب یہ حکم سنتے ہی آگئے۔ اور چوکی دار نے مجھے پکارا۔ میں نے مولوی صاحب سے برآمدے ہیں جا کر کہا۔ کہ میاں صاحب دو بجے سے بیہوش ہیں۔ آپ ذرا اُن کو دیکھئے۔ وہ کچھ خوفزدہ ہو کر آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتے ہوئے آگے بڑھے۔ اور پلنگ کے قریب آکر اُن کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ میاں قمرالزماں مخملی لحاف ہیں بالکل سیدھے پڑے تھے۔ کندھوں تک چہرا کھلا تھا۔ گردن اور سینے کا کچھ حصّہ بھی ظاہر ہو رہا تھا۔ ایک ہاتھ لحاف سے نکل کر جھکا ہُوا حقّے کی نَے پر لٹکا ہُوا تھا۔ اس ہاتھ کو بے رُخ پڑے ہوئے دیکھکر بدگمانی ہو رہی تھی۔ کہ یہ کیا اسرار ہے؟ آخر مولوی صاحب تعلیم یافتہ تھے۔ انہوں نے ہاتھ کو علیحدہ کیا۔ تو نبض میں کچھ بھی نہ پایا۔ پھر منہ پر ہاتھ رکھا۔ جو بالکل سرد ہو چکا تھا سینے پر ہاتھ رکھا تو دل کی حرکت بند تھی۔ مولوی صاحب نے آہ بھر کر کہا۔ میاں صاحب فوت ہو چکے ہیں۔ جلدی جلدی سب کو اطلاع دو۔

یہ دلفگار الفاظ بہرے کے منہ سے نکلتے ہی میری کیفیت تو جو کچھ بھی ہو رہی تھی وہ اظہارِ امکان سے باہر ہے تمام سننے والوں کی آنکھوں سے جھڑیاں لگ گئیں۔ چیخ و پکار کا شور بپا ہو گیا۔

بہرہ حضور! آپ صبر سے میری تمام بات سن لیجئے۔ رونا تو ہمیشہ کا ہوگیا۔ جب تک زندگی ہے۔ یہ سماں بھولنے والا نہیں۔ میں نے پھر خوشحال کی طرف متوجہ ہوکر سننا شروع کیا۔ اُس نے کہا۔ بیگم صاحبہ میں نے تو میاں صاحب کے جنازے کو ایک منٹ کے لئے بھی نہیں چھوڑا۔ کیونکہ کوٹھی کا تمام انتظام میرے ذمہ تھا۔ اور مولوی صاحب، عالم گیر اور گاؤں کا چوکیدار اسٹیشن پر گئے۔ سٹیشن ماسٹر عبدالحی سب کے ایڈریس سے واقف تھا۔ اس نے سب کو ڈبل تار دیدئے۔ کیونکہ اتوار کا دن تھا اور تاریخ ۱۷ نومبر ۱۹۱۲ء اُس کا حساب آپ نے دینا ہوگا۔ چھوٹی بیگم صاحبہ کو بھی موت کی تار گئی ہوئی ہے۔ شاید کل تک وہ بھی آجائیں۔ کیونکہ پہاڑی راستہ دو دن میں پیدل طے ہوتا ہے۔ پھر یہ حال سنا کر روتا ہوا باہر چلا گیا۔

گھر میں صفِ ماتم بچھی ہوئی تھی۔ تمام گاؤں اور گرد و نواح کے گاؤں کی عورتیں قطاریں باندھ کر نوحہ کرتی آئیں۔ اور میں اُن کے مقابلہ میں تنہا اس ستم آلودہ وقت کو نبھاتی تھی۔ تیسرے دن سجادہ بیگم بھی آگئی۔ شور محشر بپا ہُوا۔ میری مغموم تھکی ہوئی آواز گونج رہی تھی۔ میرے ساتھ سجادہ بیگم لپٹ کر چیخیں مارنے لگی۔ آخر سب نے ہمیں دلاسا دیکر علیحدہ کیا۔ اور ہم دونوں صفِ ماتم پر بیٹھی آہ و زاری کرتی رہیں۔ اب ہمارا خطاب "بیوہ" ہوگیا تھا۔ سوئم کی رسم ادا ہوئی۔ سب نے درجہ بدرجہ ہمیں رسم کے مطابق روپیہ دیا۔ میرے والدین نے نقد پانچ سو روپیہ دیا۔ اب نابالغ بچے کو دیکھ

سب کو رنج ہوتا تھا۔ تین سال کی عمر میں یتیم بچہ اپنے باپ کو خواب کی طرح یاد کرتا اور بار بار نوکروں سے پوچھتا تھا۔ کہ ابّا جان کہاں چلے گئے ہیں؟ ہمارے گھر میں لوگ کیوں آئے ہیں؟ اور اماں جان کیوں روتی ہیں" بچے کی بھولی بھالی دردناک باتیں دل کے ٹکڑے کئے دیتی تھیں۔ کئی دن تک برابر آمد و رفت کے سلسلے اور تانتے لگے رہے۔ مجھے ہوش نہ تھی۔ دن رات رونے میں غلطاں رہتی۔ ہم دونوں کے چہروں پر پژمردگی چھائی ہوئی تھی۔ کپڑے میلے تھے۔ آہ وہ دن خواب ہو گئے جب ہر چیز میں صفائی کا خیال رہتا تھا۔ اصطبل پہلے ہی خالی ہو گیا تھا مودی خانہ بھی خالی ہونے لگا۔ کچھ تو لوگ لوٹ مچاتے تھے اور کچھ بدانتظامی کے باعث گاؤں میں تباہ کاریاں ہونے لگیں۔ آہ! انقلاب زمانہ اسقدر جلدی برباد کر دیتا ہے۔ میں ہر وقت اس خیال میں کھوئی رہتی تھی۔ اور دیوانوں کی طرح باتیں کرتی رہتی۔ کہ میرے گھر کو کیا ہو گیا؟ کسی نے مجھے بد دعا دی ہے کہ تو برباد ہو جائے۔ اے خدا یہ وہی غنچے تھے۔ جن کی خوشبو سے میرا دماغ معطر ہوا کرتا تھا۔ اب یہ گل یہ غنچے یہ بہار میرے دماغ کو پریشان کرتے ہیں۔ آسمان پر شفق شام کی آمد جو مجھے مسرتوں کا پیغام دیا کرتی تھی آج اسمیں میری آرزوں کے خون کا سیلاب ہے۔ ہوا کے جھونکے اپنے دوش پر کرب و اضطراب لا رہے ہیں۔ میری متحیر نظریں اس صداقت کے پتلے اپنے عہد پر جان دینے والے میرے سرتاج کی تلاش میں کوشاں ہیں۔ میرا تخیل جس میں عیش و عشرت کی فراوانی تھی۔ اب اس کا ذرہ بھی نظر نہیں آتا۔ اب وہ خوشیاں اور مسرتیں کہاں؟

ایک خواب تھا۔ آہ وہ دن کس قدر جلد گزر گئے۔ وہ گھڑیاں کیسی راحت بدوش تھیں۔ مہربان شوہر! تم نے مجھے ستم ہائے روزگار کے حوالہ کر دیا۔ میرے مالک آخر تم نے مجھے دھوکا ہی دیا۔ میرے دلدادہ منصف مزاج شوہر آخری وقت میں اگر تمہارے پاس نہ تھی تو تم نے دوسری بیگم کو بھی پاس نہ رکھا۔ کہ شاید میں کوئی گلہ شکوہ نہ کر بیٹھوں۔ آہ! میرے انصاف پسند مزاج تم نے مجھے اپنی مرضی سے نہیں چھوڑا قضا و قدر نے مجھے مجھ سے علیحدہ کر دیا۔ اس وقت بےبسی کے عالم میں کس طرح جان تن سے جدا ہوئی ہو گی۔ بہتر تھا کہ میں پاس نہ تھی۔ قدرت نے مجھے بچا دیا۔ افسوس میرے ارمان میری تمنائیں سب خاک میں مل گئیں۔ اے مہربان تمہاری خاطر میں نے کیا کیا جد و جہد کی۔ دنیا میں اپنے کو انگشت نما کیا۔ کاش اگر مجھے خبر ہوتی کہ اتنی تھوڑی زندگی ہے تو جوان مرگ ہو جاؤ گے۔ تو میں کیوں سجادہ کو نکاح میں لاتی؟ پھر سوچتی کہ بچہ اب اُس مرحوم کی نشانی میرے پاس ہے۔ اس کا نام تو قائم رہے گا غنیمت! غنیمت!!

افسوس! سجادہ بیگم نے تو ذرا بھی آرام سے وقت نہ گزارا وہ تو مجھ سے بھی بدبخت نکلی اسے تو بہت جلدی دھوکا مل گیا۔ نہیں نہیں سجادہ خوش نصیب ہے۔ جس کے بطن سے ایک لعل پیدا ہوا۔ یہ اُس لعل کی خاطر آرام پائے گی۔ اور اب میں ان کا ساتھ دونگی۔

میں ہر وقت ان خیالات میں الجھی رہا کرتی تھی۔ جب لوگ تعزیت کے لئے میرے پاس آتے۔ تو کبھی کوٹھی پر نظر کرتے اور کبھی زمین پر جہاں جنگل میں

منگل نیا ہوا دکھائی دنیا تھا ۔ سوچتے کہ اب اِن بیوگان کا کیا حشر ہوگا؟ یہ کہاں رہیں گی؟ اور بچہ کیسے تعلیم پائے گا؟ اب گاؤں کا انتظام کون کرے گا دنیا والے حیران تھے ۔ مگر میں قدرت کے کرشمات پر غور کرکے خاموشی میں وقت نبھا رہی تھی ۔

میاں بخت نصر صاحب جو دماغی بیماری میں کئی برسوں سے گرفتار تھے بھائی کی موت کی خبر پہنچتے ہی اُنہیں پھر دورہ شروع ہوگیا ۔ اور وہ ایسے دیوانے ہوگئے تھے ۔ کہ دفن کے وقت اس قدر جلدی مچائی کہ لوگ مجبور ہوگئے ۔ کہنے لگے ۔ "میرے بھائی کو سورج سے پہلے دفن کردو" ۔ خدا معلوم ان کے دماغ میں کیا آرہا تھا ۔ اسی لئے میرے آنے سے پہلے قمر الزماں دفن کردئے گئے تھے ۔ سب کا خیال تھا کہ اگر میاں بخت نصر کا کہنا نہ کیا گیا ۔ تو پھر طبیعت زیادہ خراب ہونے کا اندیشہ ہے ۔ میاں بخت نصر صاحب نے سب کو بٹھا کر یہ فیصلہ کیا ۔ کہ میں اس مصیبت میں جوان مرگ بھائی کے صدمہ کی تاب نہیں لاسکتا ۔ میرے لئے یہ ناقابل برداشت ہے ۔ اور میرا دماغ اس قابل نہیں کہ میں بیوگان اور نابالغ کے لئے جائداد کی حفاظت کرسکوں ۔ آپ سب عہدہ دار اور قانون دان ہیں ۔ میاں قمر الزماں کا تو بچہ یتیم ہے اور میرے بچے کو بھی آج سے یتیم ہی سمجھو ۔ اور ان دونوں نابالغوں کا سامان خود ہی کرو جس طرح مناسب ہو ۔ چنانچہ انہوں نے اپنی کل جائداد کا مختارنامہ دیدیا ۔ ہماری بدبختی کہ عورتوں میں سے جہاں آرا بیگم احساس مند ، خدا پرست اور سب کی مصیبت پہ خون بہانے والی بی بی تھی ۔ وہ ہماری بربادی سے پہلے ہی دنیا سے رخصت

ہو گئیں ان کے بعد لائق۔ ہوشیار تعلیم یافتہ اور انتظام کے بانی مبانی میاں بخت نصر تھے۔ ان کی یہ کیفیت ہو گئی۔ کہ زندہ درگور۔ حیران تھی کہ اب اس صورت میں کیا ہو گا۔ ہم کنبہ والے لوگوں کے سپرد تھے جس طرح مناسب سمجھتے وہ ہمارے حق میں کرتے رہے۔ وہ ہمیں ہر صلاح مشورہ میں شریک کر لیتے تھے۔ اگرچہ ان سب کو ہمارے ساتھ دلی ہمدردی تھی۔ اور ہمارے لئے انصاف سے فیصلہ کرنے میں کوشاں تھے۔ مگر میاں بخت نصر صاحب کی غیر حاضری میں مشکل محسوس ہوتی۔ کوئی مجھے کسی چیز کے بارے میں دریافت کرتا کوئی کسی رائے اور دلیل کے متعلق مشورہ دیتا۔ میں سب کی باتیں سنتی اور غور کرتی۔ میرا کوئی خاص قریبی عزیز نہ تھا۔ سوائے دکھیا دل ضعیف العمر والدین کے۔ میں اُن سے بھی اپنے دل کی بیقراری کا پردہ رکھتی۔ جو کچھ کہ میری بے بسی میں ان کو تکلیف پہنچی۔ وہ میرے اختیار کی بات نہ تھی۔ گریہ میرے اختیار کی چیز تھی۔ میں ہر وقت دل سے باتیں کرتی رہتی تھی میں نے تدبیر تو کی۔ لیکن تقدیر کب کسی کی پیش جانے دیتی ہے۔ اب نہ بچے کی پڑھائی کا کوئی انتظام۔ نہ ہماری رہائش کا کوئی طریقہ تھا۔ غرض کہ سب اپنی اپنی دھن میں تھے۔ اگرچہ اس کنبہ کے یہ سب عزیز اور مہربان خدا کے فضل و کرم سے اپنی اپنی جگہ بڑے بڑے عہدہ دار تھے اور سب کو ہماری بہبودی کا دھیان تھا۔ ان کے خیالات بھی بہت وسیع تھے۔ مگر ہماری دولت یا جائداد کی تباہی سے بے پرواہ تھے۔ جو کچھ ہم دونوں کے واسطے سوچنا چاہیئے تھا۔ اس پر کسی کا دھیان نہ تھا۔ میری منشا یہ تھی۔ کہ میں اور سجادہ بیگم شیخوپورہ یا لاہور

میں سکونت اختیار کر کے بچے کی پرورش کر لیں۔ اور اس کی پڑھائی کا انتظام بھی خاطر خواہ ہو جائے۔ میرے والدین جنکو میں کسی صورت میں بھی چھوڑ نہیں سکتی تھی۔ وہ میرے پاس رہیں اور سجادہ بیگم کا جو بھی رشتہ دار چاہے اس کے پاس رہ سکے۔ میں اس طریقے سے گزر اوقات کرنا چاہتی تھی۔ مگر جوان عورت کی بیکسی میں جوانی دشمن ہوتی ہے۔ ہماری نسبت ان سب کے خیالات پراگندہ رہتے تھے۔ سجادہ بیگم اگرچہ نادان تھی۔ اور میں بھی اپنی سادگی کے باعث خود کو بدبخت تصور کرتی تھی۔ پھر بھی جو کچھ ہمارے متعلق مشورے ہوا کرتے تھے۔ میں انہیں سنکر کئی ارادے باندھتی۔ مگر آہ بدبختی میری پیش نہ جانے دیتی۔ انہی خیالات کا ہجوم میرے دماغ کو بیقرار کرتا رہتا۔ ادھر یہ تکلیف اور دوسری طرف یہ معلوم ہوا۔ کہ جن لوگوں کے حساب کتاب تھے۔ اور جہاں کہیں روپیہ کا لین دین تھا۔ انہوں نے قرض کے نوٹس بھیج دئے۔ ہم دونوں بیوگان اور نابالغ بچے کے نام دھڑا دھڑ لفافے آنے لگے۔ مگر یہ قرضے سراسر بے ایمانی اور دھوکے بازی کے تھے جس کا ایک روپیہ دینا تھا۔ وہ بیس روپے مانگتا تھا۔ غرضیکہ اندھا دھندمی ہوئی تھی۔ میاں بخت نصر صاحب کا حساب کتاب جن دوکانوں میں تھا۔ ان کی ہماری اور دماغ کی خرابی کی وجہ سے وہ بھی کچھ ایسی صورت میں بکھر گیا تھا۔ کہ اگر ان قرضوں کے متعلق کچھ دریافت کرنے کی کوشش کریں۔ تو بھی پتہ نہ چلتا تھا۔ کیونکہ تمام منشی لوگ بھی اُن لوگوں سے مل گئے تھے۔ وہ ان دوکانداروں کے ساتھ ہاں سے ہاں ملاتے جاتے۔ اب ایسا کون بے کار بیٹھا تھا جو حساب کتاب کی پڑتال

کرنا۔ رشتہ داروں کی یہ بھی مہربانی تھی۔ کہ اپنے ضروری کام کاج وغیرہ کرنے کے بعد ہماری جائداد میں ہمارے حساب کو سلجھانے کی کوشش کرتے تھے۔
ہر اتوار کو یہ چند ایک رشتہ دار جنکے صرف عہدے لکھتی ہوں۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس سیشن جج۔ آنریری مجسٹریٹ۔ بیرسٹر منصف گویا یہ سب قریب کے رشتہ دار تھے۔ باقی سر شفیع باغبانپورے والے۔ لفٹننٹ عمر حیات ٹوانہ۔ خواجہ غلام صادق صاحب رئیس امرتسر۔ راجہ عطا اللہ خاں۔ ملک ممتاز غرضیکہ یہ سب مرحوم کے دوست اور صلاح کار تھے۔ آخر یہ طے ہوا۔ کہ نقد روپیہ وزیر سلطان کے مہر میں دیکر شیخوپورہ رہن کرکے سب کا قرض ادا کر دیا جائے۔ میں نے اس مشورہ اور امر مجبوری کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک شخص سے جو میرے ہمدرد تھے رائے ظاہر کی۔ تو انہوں نے مشورہ دیا۔ کہ بہتر ہے اپنے مہر کا روپیہ وصول کر لو۔ کیونکہ شیخوپورہ رہن ہو جائے گا بچے دونوں نابالغ ہیں۔ میاں بخت نصر صاحب کی زندگی کا بھروسہ نہیں۔ ان کی حالت دن بدن کمزور ہو رہی ہے۔ اگر اسی وقت مہر کی وصولی نہ ہوئی۔ تو پھر اس جائداد کے حوصلہ پر بیٹھنا جو وارثوں کی موجودگی میں لُٹ گئی جیسے لوگوں نے ہاتھ رنگ لئے۔ تو خدا معلوم اسکا کیا انجام ہو۔ بہتر ہے مہر وصول کرکے بنک میں رکھدو۔ میرے والدین نے بھی یہ مشورہ پسند کیا۔ میں نے اس معاملہ میں زور دیا۔ کہ میرا مہر مل جانا چاہیئے۔ میرے زیور اور بہت سی اشیا جو والدین کے گھر سے مجھے شیخوپورہ میں آباد ہونے وقت ملی تھیں وہ سب وہاں ان تباہ کن ایام میں برباد ہو گئیں۔ کسی قسم کے لوگ نوکر تھے۔ جس کا جو جی چاہا۔ کیا۔ گویا وہی مثل صادق آگئی۔ کہ اندھیر نگری چوپٹ راجہ"

اس صورت میں ایک بے علم عورت جسکو نہ آزادی نہ تعلیم کس طرح انتظام کر سکتی تھی۔ دوسرے ایسی اندھیری میں جو وسیع پیمانہ کے گھر ہوں عورتوں کے ہاتھ سے کب انتظام پا سکتے ہیں۔ نہ کسی ملازم کو دھمکانے کی جرأت۔ نہ کسی سے حساب لینے کی ہمت۔ مردوں کی موجودگی میں شرم اور پردے کی مصلحت ہر کام میں حارج رہی۔ اگرچہ میں ہوشیار تو کافی تھی۔ مگر یہاں میری ہوشیاری بالکل بیکار تھی۔ اندرونی دائرے میں سے جو کچھ ہو سکا کیا۔ مگر وہ بھی کس کام کا ؟ نہ کسی قانون کی خبر نہ کسی پختہ بات پر اعتماد۔ اس جہالت میں سب سے زیادہ بربادی میری ذات پر حادی ہو رہی تھی۔ میں سوائے افسوس کے کیا کر سکتی تھی۔ خاصکر اپنی لاعلمی پر کاش کہ میں تعلیم یافتہ ہوتی۔ کسی وقت اس خیال سے مطمئن بھی ہو جایا کرتی تھی کہ اور کون سی اس کنبہ کی ایم۔ اے۔ بی۔ اے ہیں جو میں خواہ مخواہ مر رہی ہوں۔ سب کا حال میرے ہی جیسا تھا۔ مگر میں تو شوق بہت رکھتی تھی۔ ان کو شوق بھی نہ تھا۔ باوجود اس کے مجھے میرے عزیز کم عقل تصور نہ کرتے تھے۔ جس قدر کہ میں خود اپنے کو جاہل سمجھتی تھی۔ خاصکر اپنی مصیبت کے وقت میں مجھے اپنی علمی لیاقت کے کم ہونیکا بہت افسوس تھا ؎

قسمت کی بدنصیبی پر حسیا دکیا کرے

سر پہ گرا پہاڑ تو فرہاد کیا کرے

آخر شیخوپورہ نصف لاکھ میں رہن رکھا گیا۔ ہم دونوں لاہور آنے کیلئے تیار ہو گئیں۔ شیخوپورہ سے علیحدہ ہونے کا وقت اس قدر المناک تھا۔ کہ میں پورے طور پر بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ ابھی چند ماہ رہن والوں کا قبضہ ہونے میں باقی

تھے۔ ضروریات کا کچھ سامان ہمارے ساتھ تھا۔ اور کچھ لوگوں نے ادھر ادھر چُرا چھپا لیا۔ کئی چیزیں ٹوٹ پھوٹ گئیں۔ یوں تو میاں قمرالزماں کی زندگی ہی میں یہ بربادی شروع ہوگئی تھی۔ مجھے ہر وقت ان کا ساتھ دینا پڑتا تھا۔ جب کسی چیز کی چھان بین شروع کرتی۔ تو نوکر لوگ صاف مکر جاتے۔ کچھ بڑی بڑی چیزیں میں نے ایک کمرہ میں بند کردیں۔ اور فراغت پاکر مسافروں کی طرح اس صحن میں سب گاؤں کی عورتوں کو مخاطب کرکے کہا۔ کہ بہنوں! میں نے اگر تمہارا کوئی قصور کیا ہو۔ یا تم لوگوں پر کوئی سختی کی ہو اس عرصہ میں جبکہ میں تم پر حکمراں تھی۔ تو للہ مجھے معاف کر دیجئے۔ اس کلمہ پر تمام عورتوں نے میرے آگے سر جھکا دئے۔ اور اس قدر چلا کر روئیں۔ کہ پناہِ خدا۔

پھر میں نے کہا کہ میں اب آزردہ اور مایوس ہوکر تم سے جدا ہوتی ہوں۔ خدا معلوم پھر تم سے ملاقات ہو یا نہ ہو۔ اگر کوئی میرے پاس آنا چاہے۔ تو بسر و چشم ورنہ اب میں تو کسی کو بھی ساتھ لے جانے کی طاقت نہیں رکھتی۔ پھر بہت عورتوں نے مجھے کہا۔ کہ جہاں آپ ہونگی۔ ہم آپ کے پاس پہنچیں گے۔ اور آپ کی خدمت کے لئے حاضری دیا کریں گے۔ ہمیں بدستور اپنا تابعدار سمجھیئے گا۔

پھر میں اُن سب گاؤں کی عورتوں کو ساتھ لیکر اپنے مزاج کی قبر پر گئی۔ سینکڑوں عورتوں کی تعداد میرے ساتھ آنسو بہائے جا رہی تھیں۔ کوٹھی سے باہر آکر میں نے حسرت کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے کہا ؎

ہر گردشِ فلک بہ سرِ انتقام ہے
ہر شام عیشِ صبحِ الم کا پیام ہے

فانی ہر ایک چیز یہاں لا کلام ہے
کہتے ہیں جسکو باقی وہ اللہ کا نام ہے

اے میرے دلدادہ شوہر! تمہاری یاد ستا رہی ہے۔ دل پر غم کی گھٹائیں چھا گئیں۔ میری آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب جاری ہے۔ آہ دائمی جدائی۔ اے میرے سرتاج! بستر خاک پر سونے والے میرا آخری سلام قبول ہو ؎

آہ اب رخصت کی طالب ہے تمہاری بیقرار!
لیجئے بیتاب پنہاں کا سلام اشکبار

اے مہربان! مجھے اب آپ کی قبر سے بھی جدا کیا جاتا ہے۔ مجھے اس قدر بھی سہارا نہ رہا۔ کہ آپ کی قبر کو بھی دیکھ سکوں۔ آپ تو خدائی حکم سے جدا ہو گئے۔ مگر مجھے بندوں کا حکم اور قانون آپ کی قبر سے تمام عمر کے لئے علیحدہ کر رہا ہے ؎

کیا خبر تھی یوں اجڑ جائیگی میری کائنات
اتنی فرصت بھی نہ دیوے گی تجھے تیری حیات

آہ! اس جنگل میں منگل فقط تیرے دم سے تھا۔ مجھے اس انقلاب کی خبر نہ تھی۔ اب میں اس جنگل میں جو اب ویسے ہی جنگل ہو جائے گا۔ آپ کو خدا کے حوالے کرتی ہوں۔ الوداع اے میرے سرتاج! آپ کی قبر بھی اب غیروں کے سپرد ہے۔ اس سرزمین نے بھی آپ سے وفا نہ کی۔ آہ! میرے پاس آپ کی کوئی نشانی نہیں ہے۔ میری زندگی اور راحت آپکی

زندگی تک محدود تھی۔ آپ نے مجھ سے ہمیشہ کیلئے منہ موڑ لیا۔ میں نے آپ کی یادگار قائم رکھنے کی خاطر بڑے صدمے اُٹھائے۔ میری خوشیاں آپ پر قربان تھیں۔ میری مسرتیں آپ پر نثار تھیں۔ میرے خدا کو یہی منظور ہوگا کہ میرا کوئی سہارا نہ رہے۔ آہ دنیا ناپائیدار ہے۔ میں جو ہر وقت ہنستی اور شوخیاں کیا کرتی تھی آج خونچکاں ہوں۔ میرا تمام وقت دکھ میں گزرتا ہے۔ میری آنکھوں سے وہ نقشہ کسی وقت بھی اوجھل نہیں ہوتا۔ جب آپ نے یہاں قبر بنانے کی تجویز بتائی تھی۔ ہاں مجھے یاد ہے کہ آپ نے پہلے اپنا نام لیا تھا۔ کہ "میری اور تمہاری قبر یہاں چوک میں ہوگی۔"

میں آپ سے ناراض بھی ہو جایا کرتی تھی۔ مگر آپ نے میری خطاؤں پر بھی کبھی کسی بہن بھائی کے پاس شکایت نہ کی تھی۔ میرے آقا! اس قدر خاموشی کیوں ہے؟ واللہ میری کسی بات کا جواب تو دو۔ اچھا تمہارا خدا حافظ و ناصر ہے۔ اے لوگو! یہاں کسی کسی وقت فاتحہ کہا کرنا۔ میں قبر پہ دونوں ہاتھ رکھ کر آنکھوں سے خون کے آنسو بہاتی ہوئی اٹھی۔ سب عورتوں نے مجھے گلے مل مل کر خدا حافظ کہا۔ سجادہ بیگم اور بچہ میرے ساتھ تھے۔ جب ہم سب کوٹھی کے پھاٹک سے باہر آ گئیں۔ تو سینکڑوں کی تعداد میں تمام گاؤں کے لوگ بلکہ گرد و نواح کے بھی مرد عورتیں شیخوپورہ میں آئے ہوئے تھے کیونکہ جہلم سے چند دن پہلے میں نے ختم دلوا کر ان لوگوں میں کھانا تقسیم کیا تھا۔ اور جہاں جہاں گرد و نواح کے گاؤں میں واقفیت اور آمد و رفت کا سلسلہ جاری تھا۔ ان لوگوں کو بھی دعوت دی تھی۔ نیز ہمارے

شیخوپورہ سے روانہ ہونے کی تاریخ مقرر تھی۔ اس لئے سب لوگ آ گئے۔ میری مصیبت اور اس انقلاب پر آنسو بہاتے تھے۔ عورتوں کے درمیان سجادہ بیگم بچہ اور بیں آزردہ صورت پریشان حال بنائے سر جھکائے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی چلی آ رہی تھیں۔

آخری پھاٹک پر جو باغ کی سڑک پر ختم ہوتا تھا۔ وہاں میں نے ٹھہرنے کا اشارہ کیا۔ سب عورتیں تھم گئیں۔ میں نے دیکھا تو قبر کے گرد اگرد جو درخت تھے۔ ہنوز وہ نظر آ رہے تھے۔ میں نے فاتحہ پڑھی اور پھر چل پڑی۔ مگر وہ آخری وقت قیامت خیز تھا۔ میری نگاہیں بار بار پچھلی طرف میاں قمر الزماں کی قبر دیکھنا چاہتی تھیں۔

پھاٹک کے بیرونی حصہ میں میدان تھا۔ اس میں سینکڑوں کی تعداد میں مرد کھڑے تھے۔ تمام شیخوپورہ کے زمیندار کے علاوہ گرد و نواح کے لوگ بھی موجود تھے۔ ایک شخص جو شیخوپورہ کا باشندہ راجپوت بہت بڑی عمر کا ضعیف العمر آدمی تھا اُس نے ان سب مرد عورتوں کی طرف سے کچھ الوداعی الفاظ کہے۔ جن کا ایک ایک لفظ اپنی جگہ مجسمہ مایوسی تھا۔ اس نے کہا۔ بیگم صاحبان! میں نے اپنی عمر کے ستر برس اس زمین میں گزارے ہیں۔ میرے سامنے آپ کے بزرگوں نے یہ گاؤں خریدا اور ان کا یہاں انتظام رہا۔ مگر اب جو دس برس ہمارے یہاں آپ کی موجودگی میں گزرے یہ ایک نظارہ تھا۔ میاں قمر الزماں صاحب جنہوں نے میرے جیسے غریبوں کا ادب کیا۔ جنہوں نے خوردوں کے ساتھ شفقت کی۔ ہمارے

یہ چند برس اس خوشی سے گذرے ۔ جو مجھے تا زندگی نصیب نہ ہوئی تھی ۔ اس نوجوان کی ہم کس کس بات کو روئیں ۔ اور کس کس خوبی کا نوحہ کریں ۔ باوجود مے پرست ہونے کے اُس نے ہماری بہو بیٹیوں کو نیک نگاہوں سے دیکھا ۔ ہم اپنے غریب نواز میاں قمرالزماں کی مہربانیوں اور ہمدردیوں کو کبھی بھول نہیں سکتے ۔ انہوں نے ہم لوگوں پر اس طرح حکومت کی جیسے کوئی ماں باپ اپنے بچوں کو پالتے ہیں چونکہ اس ایک سو چھتیس مربع میں میرا حصہ پچاس گھماؤں کا تھا لہٰذا میاں قمرالزماں مجھے اپنے ساتھ بٹھاتے ۔ جب کبھی کوئی موقعہ ہوتا ۔ تو سب سے زیادہ میری عزت کرتے ۔ غور فرمائیے کہ اتنی بڑی ہستی سے میرے جیسے ناچیز کا کیا مقابلہ تھا ہ کجا وہ ۔ کجا ہیں ؛ افسوس صد افسوس کہ شیخوپورہ باقبضہ رہن نہ ہوتا ۔ تو ہم لوگ آپ کو ہرگز ہرگز اس جگہ سے قدم اُٹھانے نہ دیتے ۔ آپ کی تربیت ہماری لڑکیوں کے واسطے بے حد مفید ثابت ہوئی ۔ بیگم ! آپ کا قیام چند دن کی چاندنی تھی ۔ ہائے مجھے اس بڑھاپے کے وقت یہ صدمہ بھی دیکھنا تھا ۔ کاش کہ میں اس جانکاہ موت اور بربادی کو نہ دیکھتا ۔ کاش کہ میں میاں قمرالزماں پر قربان کیا جاسکتا اور وہ زندہ سلامت رہتے ۔ الہٰی مجھ میں نوجوان بیواؤں کی آہ وزاری اور تین برس کے یتیم بچے کے نالے سننے کی تاب نہیں ۔ اے خدا یہ دونوں میاں بی بی ہم لوگوں کی زندگی کا چراغ تھے ۔ اور ہمیں ان کی آبادی سے یہ شیخوپورہ ایک بڑا شہر معلوم ہوتا تھا ۔ یہی ہمارے ڈاکٹر تھے ۔ حکیم تھے ۔ مفلسوں کی پرورش کرنے والے تھے ۔ اے خدا ان کا یہ حال ناگفتہ بہ مجھ سے دیکھا نہیں جاتا ۔ میں بے بس ہوں مجھے کوئی اس مہربان کے ساتھ زندہ درگور کر دے تو میں اپنی موت کو شہادت

سمجھوں گا"۔ اُس ضعیف بڈھے کے آنسوؤں سے اس کی سفید ریش تر ہو رہی تھی
آخر روتے روتے بیہوش ہو گیا۔ لوگوں نے اُسے ہوش دلائی۔ اور کہا وقت بہت
تھوڑا ہے۔ صبر کرو۔ آخر صبر ہی بہترین چیز ہے۔ چند عورتیں جو میری خدمتگار
تھیں۔ انہوں نے کہا کہ ہم ضرور ساتھ جائیں گی۔ اور چند مرد بھی ہمارے ساتھ
ہو گئے۔ آخر ہم سواری میں بیٹھ گئیں۔ سب نے چیخ و پکار کرتے ہوئے وداعی
سلام کیا۔ سواری چل پڑی۔ ناد و ساد ہو کے سٹیشن کا راستہ لیا۔ اب نہ وہ گھر۔
نہ وہ لوگ۔ نہ وہ حکومت۔ ہم مسافروں سے بدتر تھیں۔ ہیں جو عیش پرست اور زوش
نصیب تھی۔ اسوقت مجھ سا دنیا میں کوئی بدبخت معلوم نہ ہوتا تھا۔ ہم مظلوموں
کی صورت ریل میں سوار ہونے کے لئے کھڑے تھے۔ کہ سٹیشن ماسٹر اور قلی
سب ہمارے پاس اظہار افسوس کو آئے اور کہا۔ کہ ہمیں آپ لوگوں
کی آبادی سے جو فرحت اور مسرت تھی۔ بخدا اس رنج نے ختم کر دی ہے
اتنے میں ریل آگئی۔ ہم تینوں مصیبت زدہ زخمی دل سوار ہو کر لاہور پہنچے میں
اس کیفیت کو بھی پورے طور پر تو کیا چند الفاظ میں بھی نہیں لکھ سکتی۔ کہ ہم نے
کس بیکسی میں ڈانواں ڈول طریق پر گزر اوقات کی۔ میاں قمر الزماں کے
اظہارِ افسوس کے لئے لاہور کی عورتیں آتی جاتی رہیں۔ میاں بخت نصر صاحب
ایک کمرے میں دن رات ایسے خاموش پڑے رہتے۔ معلوم ہوتا تھا جو ان
مرگ بھائی کی موت کا صدمہ ناقابلِ برداشت ہو کر پھر بیماری نے آغاز کر دیا
ہے۔ یہ رہائشی کوٹھی لاہور میں مال روڈ پر تھی۔ اور بڑی وسیع کوٹھی تھی۔
۲۵ کمرے ایک باغیچہ اور بہت لمبا چوڑا احاطہ تھا۔ ہم دونوں بچہ۔ سر سے

والدین اور سجادہ کی والدہ سب میاں بخت نصر کے ہاں ہی رہنے لگے۔ اور ہر اتوار کو کنبہ کے معززین ہمارے متعلق مشورے کیا کرتے تھے خدا کی قدرت میاں بخت نصر صاحب کو ڈاکٹر نے کہا کہ اس بیماری میں لاہور کا پانی ناموافق ہے۔ بہتر ہوگا۔ کہ ان کو امرت سر لے جائیں۔ چنانچہ یہ لوگ یعنی میاں بخت نصر صاحب کے اہل وعیال آصف جہاں بیگم سب یکدم تیار ہوکر امرت سر چلے گئے۔ اور سجادہ بیگم کی والدہ بھی اپنے قصبہ ریاسی میں چلی گئی۔ زاہدہ بیگم نے مجھے کہا کہ سجادہ کو تم اگر کچھ دن میرے پاس سیالکوٹ بھیجدو۔ تو وہاں جو ماسٹر میرے بچوں کو پڑھانے آیا کرتا ہے۔ یہ بچہ بھی ان کے ساتھ تعلیم پائے گا۔ میں نے پہلے تو جواب دینا چاہا۔ آخر مصلحت کو مدنظر رکھتے ہوئے اجازت دیدی۔ چنانچہ سجادہ سیالکوٹ چلی گئی۔ اب ہم دونوں ماں بیٹی اور میرے قبلہ والدصاحب اور چند ملازم اس اتنی بڑی کوٹھی میں رہا کرتے تھے۔ میرے والدین کے علاوہ میرا اپنا کچھ تھوڑا بہت زیور میرے پاس تھا۔ اسکو میں نے اپنی تنہائی کے لحاظ سے اسے بنک میں محفوظ کردیا۔ اس کوٹھی میں نہ کوئی چوکیدار۔ نہ باغبان۔ ہم رات کو لمبے چوڑے کمرے دیکھ کر اکثر خوفزدہ ہوجاتے تھے۔ ایک دفعہ زہرا بیگم کے شوہر دانیال صاحب جو میرے پھوپھی زاد بھائی تھے۔ میرے پاس آئے۔ تو میں نے اس تنہائی کی تکلیف کا اظہار کیا۔ انہوں نے کہا کہ بہتر یہ ہے۔ تم اور کوئی چھوٹا سا مکان اپنی رہائش کے واسطے کرایہ پر لے لو۔ اور یہ کوٹھی چھوڑ دو۔ اس کوٹھی کا ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار کرایہ ہے۔ اگر دو ماہ بھی یہاں رہیں۔ تو تین صد روپیہ تمہارے سر ہوجائیگا۔ میں نے اور میرے والدین نے اس مشورہ پر عمل

کرکے مکان کی تلاش کی۔ تو ایک مکان مزنگ روڈ پر مبلغ تیس روپیہ ماہوار کرایہ پر مل گیا۔ ہمارے رشتہ دار بھی اکثر میرے پاس آتے جاتے تھے۔ اس طریقے پر زندگی بسر کرتے ہوئے میں اکثر سوچا کرتی۔ کہ یہ دنیا کیا ہے؟ اس کا جال انسان کو کس طرح پھنسا لیتا ہے۔ دنیا کے اس عارضی سرور میں انسان کتنی ٹھوکریں کھاتا پھرتا ہے۔ اور چند روزہ زندگی میں کتنی امیدیں باندھ لیتا ہے۔ کہ میں یہ کرونگا۔ وہ کرونگا۔ اے دغاباز دنیا! تجھے کیا کہوں۔ اے بربادکن ستمگار دنیا جو کوئی تیرے جال میں آیا۔ بس تو ہی تو اسکو نظر آتی ہے۔ تیری بے وفائیاں۔ تیری سفاکیاں کس کس نے نہیں دیکھیں۔ حضرت آدم کے ساتھ کیا ہوا۔ اس کے پیارے بیٹے ایک دوسرے کے قاتل بنے۔ حضرت امام حسین ع کو کربلا میں دھوکا دے کر شہید کیا۔ حضرت مریم کو تازندگی چین نہ لینے دیا۔ حضرت یوسف کو کوئیں میں ڈالا۔ ایسے ایسے گوہر نایاب تیری جھپیٹ میں آگئے۔ تو میں کیا چیز ہوں؟ میری ہستی کیا ہے؟ ایک ذرہ خاکی کی حقیقت کیا ہے؟

حتیٰ کہ میں حدیث کے مطالعہ میں اپنا وقت گذارنے لگی۔ کیونکہ اب مجھے اپنی زندگی بالکل بے کار معلوم ہوتی تھی۔ میرے والد صاحب مجھے اچھی اچھی کتابیں۔ معتبر حدیث اور مسئلے سنا سنا کر دنیا کی طرف سے دل کو اطمینان دلایا کرتے۔ مگر کسی وقت میرے دل میں ایک ایسا جوش سا پیدا ہو جاتا تھا کہ میں خود بخود اپنے آپ سے باتیں کرنے لگتی۔ اے قمر کے نور!! اے سورج کی کرنو! کیا تمہیں بھی شکست ہوتی ہے؟ پھر خود ہی کہہ دیتی ہاں ضرور سب

کو انقلاب ہے۔ ہاں ہاں ضرور ضرور۔ کچھ میرے ساتھ تو انوکھی بات نہیں ہوئی۔ جب ہر چیز کو فنا ہے۔ تو مجھے بھی ایک دن فنا ہونا تھا۔ میرے والد صاحب نے جب یہ کلمہ فنا کا ایک دن میری زبان سے سنا۔ تو مجھے فرمانے لگے۔ بیٹی فنا کا وجود بقا ہے۔ میں نے وجہ تسمیہ دریافت کی۔ تو انہوں نے ایک شعر پڑھا ؂

فنا فی اللہ جب ہم ہو چکے تو بس ہمیں ہم ہیں
کبھی بندے بنے اپنے کبھی اپنے خدا ٹھہرے

صوفیائے کرام ہمیشہ اپنی موت کو زندگی پر ترجیح دیا کرتے ہیں۔ اور موت کو ہی زندگی سمجھتے ہیں۔ ایک معتبر حدیث میں علی بن سہل اصفہانی فرماتے ہیں۔ تصوف یہ ہے۔ کہ خدا کے سوا تمام دنیا کی اشیا سے تعلق نہ رکھے۔ اور ذات کے لحاظ سے واحد ہو کر نہ کوئی اس کی طرف توجہ کرے نہ وہ کسی طرف متوجہ ہو۔ تصوف وہ ہے جس سے ہر شے میں باری تعالے کا جلوہ نظر آئے۔

میں نے پوچھا۔ ابا جان جبکہ سب کو چھوڑ کر انسان خدا کے سوا کسی کو کچھ حقیقت نہ سمجھے تو پھر ہر ایک میں خدا کا جلوہ کیسے تصور کیا جا سکتا ہے؟

کہنے لگے بیٹی! ہر ایک چیز میں خدا کا جلوہ یوں سمجھنا چاہیئے۔ کہ ہر ایک چیز کی لطافت میں ہے۔ اپنے دل میں ہر ایک چیز کی محبت کو دخل نہ دینا چاہیئے۔ سوائے خدا کے، اور اُسی خدا کو پوجو جسے اجل نہ آئے۔ تصوف اور صوفیت کی باتیں عام فہم نہیں ہوتیں۔ ان کی باریک اور دقیق مثال یہ ہے۔ ان کے ہاں فقیر کا مرتبہ بادشاہ کے برابر ہے

ان دونوں کی ہستی پر غور کیا جائے۔ تو وہ دنیا کا بادشاہ۔ جو خزانوں کا مالک لاکھوں انسانوں پر حاکم۔ مگر فقیر کو تو دھواں اور گودڑی کے سوائے مصلےٰ اور تسبیح کی بھی ضرورت نہیں۔ سب کچھ نیست و نابود۔ اس صورت میں اپنی جان اور تن خدا کے سپرد کر بیٹھا ہوتا ہے۔ فقیر کو نہ خوشی سے راحت نہ رنج سے پریشانی۔ وہ ہر وقت اپنے حال میں مست رہا کرتا ہے ؎

بعد فنا قبول نہیں ذکر نیک و بد
مٹ جائے پہلے نام و نشاں مزار سے
عبث اس زندگی پر غافلوں کا فخر کرنا ہے
یہ جینا کوئی جینا ہے کہ جس کے ساتھ مرنا ہے

میرے والد صاحب قبلہ مجھے اکثر نصیحت آمیز باتوں سے مطمئن کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ میرا دل بھی ان کی گفتگو سے کچھ کچھ متاثر ہونے لگا۔ مگر دماغ کی جو کیفیت تھی۔ وہ ہر حال میں بدستور پریشان کن تھی اپنی تقدیر پر غور کرتی۔ تو یہ شعر حسب حال تھا ؎

ہم کو بہار میں بھی سیر گلستاں نہ تھا
یعنی خزاں سے پہلے ہی دل شادماں نہ تھا

آٹھواں باب

جائداد اور مہر کا فیصلہ

شیخوپورہ تو رہن ہو ہی چکا تھا۔ مگر روپیہ وصول ہونے کا وقت مقرر تھا۔ روپیہ وصول ہونے اور مہر ادا کرنے سے پیشتر کئی مشورے اور تجاویز ہماری جائداد میرے اور سجادہ بیگم کے متعلق ہوتی رہیں۔ آخر ان لوگوں نے آپس میں یہ فیصلہ کر لیا۔ کہ بہتر ہو سجادہ بیگم اور بچے کو وزیر سلطان سے علیحدہ کر کے میاں فرخ سیر سے سجادہ بیگم کا نکاح کر دیا جائے۔ کیونکہ سجادہ بیگم بالکل کمسن اور سیدھی سادی ہے۔ میاں فرخ سیر کا گھر آباد کرنا بھی ضروری ہے۔ نہ اب وہ زمانہ رہا کہ جب لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپیہ خرچ کر کے میاں بخت نصر اور میاں قمر الزماں کی شادیاں کی گئی تھیں۔ سب لوگ میاں فرخ سیر کی بدبختی پر افسوس کرتے تھے۔ کہ شروع سے بدبختی قدم بقدم رہی

میاں فرخ سیر ابھی شیر خوار ہی تھے۔ کہ والدہ گذر گئی۔ سات برس کے ہوئے تو والد صاحب رخصت ہوئے۔ جب تعلیم سے فراغت پائی تو بڑے بھائی بخت نصر صاحب دماغی بیماری میں ایسے گرفتار ہوئے۔ کہ برسوں گذر گئے مگر افاقہ نہ ہوا۔ کنبے کا کوئی آدمی میاں بخت نصر کے بغیر قدم نہ اٹھا سکتا تھا۔ مگر اب سب کے سب اپنے بیگانے ان کی حالت دیوانگی اور جائداد کی بربادی پر پریشان تھے۔ اس صورت میں شادی کی وہ شاہانہ شان و شوکت کیسے ہو سکتی تھی؟ انتظار رہی انتظار میں یہانتک نوبت پہنچی کہ سجادہ بیگم سے منسوب کرنے کا فیصلہ ہو گیا۔ ابھی یہ صلاح مشورے بالا بالا ہو رہے تھے۔ کہ مجھے بھی کسی مہربان نے یہ بتا دیا۔ میں اس خبر سے بہت پریشان ہوئی۔ مگر کسی پر ظاہر نہ ہونے دیا۔ میری ایک مہربان دوست عیسائی عورت تھی۔ جس کا ان سب میرے رشتہ داروں سے میل ملاپ تھا۔ وہ نہایت عقلمند تھی۔ جہاں آرا بیگم مرحومہ کی بھی وہ بہت سہیلی تھی۔ میرے پاس آئی۔ حال دریافت کرنے کے بعد میں نے اس سے کہا آپ نے بھی کچھ سنا ہے مس گھوش؟؟

مس گھوش۔ کیا!

میں۔ مجھ سے سجادہ بیگم اور بچہ کو علیحدہ کرکے میاں فرخ سیر سے نکاح کی تجویز ہو رہی ہے۔

مس گھوش۔ "یہ تو میں نے بھی سنا ہے اور تمہارے متعلق بھی تو کچھ مشورہ ہے!"

میں۔ میرے متعلق کیا سنا ہے؟

مس گھوش - جب سجادہ بیگم کے نکاح کا ذکر ہو رہا تھا - تو ذوالفقار خاں صاحب آپ کے متعلق بھی یہ کہا تھا - کہ اگر سجادہ کمسن ہے - تو وزیر سلطان بھی بڑی عمر کی نہیں - دوسرے سوائے والدین کے اور کوئی حقیقی بھائی ہے نہ بہن - لہذا اس صورت میں ایک جوان عورت اپنے عمر رسیدہ والدین کے زیر سایہ چند برس گزارنے کے بعد باندہ زندگی کس طرح گزار سکتی ہے ؟ تو اس پر سب نے خاموشی اختیار کر لی - اور کہا یہ تو وزیر سلطان کی مرضی پر منحصر ہے - ہم اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتے - اس پر ذوالفقار خاں صاحب نے میاں قمرالزماں کی دونوں ہمشیرہ زاہدہ بیگم اور زہرا بیگم کی طرف متوجہ ہو کر کہا کہ کیا آپ اس تجویز پر رضامند ہو جائینگی کہ وزیر سلطان مجھے شریک حیات بنا لے ؟ گو اُن کو اس لفظ پر رنج تو ہوا - مگر ذوالفقار خاں صاحب کی خاطر اظہار خوشنودی کر دیا - کیونکہ ذوالفقار خاں صاحب ایک معزز اور قریبی رشتہ دار تھے - با اخلاق خوبصورت رنگین مزاج - بارُعب فراخ دل شخص - پسندیدہ اطوار اور بڑے طبقہ کے عہدے میں سشن جج تھے - اُن کے سامنے تو کسی نے پس وپیش نہ کی - مگر اب بہت باتیں ہو رہی ہیں "

میں اس خبر سے کچھ گھبرا سی گئی - مس گھوش نے کہا - دیکھئے بہن ! ! حوصلہ سے کام لیجئے - کیونکہ اس وقت غصہ میں آنے سے کسی کا کچھ نہیں بگڑیگا - سجادہ بیگم کو تو بچے کی وجہ سے خدا نے مالک بنا دیا ہے - آپ جو چہیتی ہونے کے علاوہ کنبے والے لوگوں میں عزیز و مقرب تھیں - اور اپنی تابعداری کے باعث سب کو گرویدہ کیا ہوا تھا - مگر صرف بے اولاد ہونے کی وجہ سے

یوں مایوس ہو رہی ہیں۔ یہ سب تقدیر کے کرشمے ہیں ۔

میں۔ مجھے معلوم نہ تھا۔ کہ انقلاب اس قدر جلدی ہمیں درہم برہم کر دے گا۔ آہ افسوس! ۔ دنیا میں مصیبت تو ہر ایک کے واسطے ہے ۔ زندگی کا تمام حصہ تو خوشی سے کسی انسان کا بھی نہیں گزرتا۔ مگر ابتدا میں مصیبت کو برداشت کرنا ہی بہت مشکل معلوم ہوتا ہے ۔ اس کلمے پر میرے آنسو گر پڑے ۔ اور مس گھوش بھی آب دیدہ ہو گئیں ۔

ہر لحظہ دیکھتی ہوں زمانے کی شان اور
گویا زمین اور ہے اور آسمان اور

آہ! یہ دنیا حسرت کدہ ہے۔ اب مجھ میں تو دنیا داری کی طاقت ہے نہ دینداری کی چاہت ۔ امید گئی تو یاس آباد ہے۔ الحمد للہ!

مس گھوش نے کہا۔ تم عقلمند کہلاتی ہو۔ دیکھو ان باتوں کو دل میں رکھنا کسی پر ظاہر نہ کرنا۔ تاوقتیکہ تمہارا فیصلہ نہ ہو جائے۔ کیونکہ یہ جائداد نابالغ کی ہے ۔ اس میں لوگ حجت کر دیں گے ۔ کہ جب نابالغ خود مالک ہوں گے ۔ تو اُس وقت مہر جائداد سے وصول ہو سکتا ہے ۔ اس لئے خاموش رہنا ہی بہتر ہے ۔

میں ۔مس گھوش میری دلی تمنا اِن لوگوں سے قطعاً علیحدہ ہونے کی نہیں ہے ۔ تاہم دیکھتی ہوں اور سوچتی ہوں ۔ کہ جب سجادہ اور بچہ کو مجھ سے علیحدہ ہو جائینگے ۔ تو میرا اُن سے کیا تعلق باقی رہیگا؟ میں نے اس بچے کی خاطر جدوجہد کی ۔ اور دوسری بیوی کو چھاتی پر رکھا کیا اِس دن کے لئے کہ یہ مجھ سے علیحدہ

کر دئے جائیں؟

مس گھوش۔ دیکھو گھبراؤ مت! ابھی خدا معلوم کیا کیا تجویزیں پیش ہونگی آخر تمہاری بھی تو منشا پوچھی جائے گی؟؟

میں۔ خیر۔ میری منشا کا کیا ہے! میاں فرخ سیر کی شادی ہم اور جگہ نہیں کر سکتے۔ اگر نکاح ہو جائے تو شریعت کے لحاظ سے بہتر ہے۔ مگر میری زندگی البتہ ڈانواں ڈول ہو جائے گی۔ مجھے تو کسی کا سہارا نہ رہیگا۔ میں تو زندہ درگور ہو جاؤں گی۔

مس گھوش۔ کوئی فکر نہ کرو۔ جو ہو گا۔ دیکھنے جاؤ۔

میں۔ دیکھتی تو ہوں۔ مگر انجام خدا جانے کیا ہو گا؟

انہی باتوں میں بہت وقت گزر چکا تھا۔ اس لئے مس صاحبہ رخصت ہو گئیں۔ میرا وقت والدین کی خدمت میں گزرتا اور اکثر کوئی نہ کوئی میرے پاس رشتہ دار بھی آتے رہتے تھے۔ میرے لئے یہ مکان جس کے چاروں طرف خدا جانے کون تھے۔ نہ جان نہ پہچان۔ بالکل مسافرانہ زندگی پیش کر رہا تھا۔ میں اپنی بدقسمتی پر آنسو بہایا کرتی تھی اگر کوئی میری سہیلی بھی میرے پاس آتی۔ تو مجھے کچھ لطف نہ آیا کرتا۔ ایک سہیلی صدیقہ بیگم جو نہایت پاکیزہ خیال اور فرشتہ خصلت خاتون تھی۔ وہ اکثر میرے پاس آجاتی۔ اور میری حالت پر آنسو بہایا کرتی۔ فیشن پرست بہنوں نے مجھے چھوڑ دیا تھا۔ کیونکہ مجھ دکھیا کے پاس اب دل نہ تھا۔ مگر ؎

رنج کا خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج   مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

نواں باب

ذوالفقار خاں کی جدوجہد

میرے جتنے مہربان مجھے خوش نصیب اور زندہ دل سمجھتے تھے۔ وہ سب اس صورت میں مجھے غم زدہ تصور کر کے کوئی خوشی کی بات بھی نہ کرتے تھے۔ ایک دن سجادہ بیگم اچانک آ گئی۔ اور کہنے لگی کہ میں آپ سے ایک بات پوچھنے آئی ہوں!

میں نے کہا۔ کیا؟

سجادہ۔ آپ سے میرے متعلق کوئی مشورہ ہُوا تھا؟

میں۔ نہیں!

سجادہ۔ آپ کو کچھ معلوم ہُوا۔ کہ ان لوگوں کا خیال میری نسبت کیا ہے؟

یہ کہہ کر اس نے تمام حالات سے آگاہ کیا۔

مَیں۔ تمہیں کس نے زیادہ کہا۔ اور کس نے زور دیا تھا؟

سجادہ۔ مجھے شیخ صاحب کے پاس لے گئے۔ کہ وہ تمہیں کچھ سمجھانا چاہتے ہیں۔ مَیں وہاں گئی تو شیخ صاحب نے کہا۔ کہ بیٹی! تمہاری عمر بہت چھوٹی ہے ہم تمہیں کہیں علیحدہ نہیں رہنے دیں گے!

مَیں۔ تم نے اس کا کیا جواب دیا؟

سجادہ بیگم۔ میں نے کہا۔ کہ آپا صاحبہ میرے ساتھ ہونگی۔ اس پر شیخ صاحب نے کہا۔ کہ تمہیں کیا ضرورت ہے کہ اب تم وزیر سلطان اور اس کے والدین کی خدمت کرو۔ بہتر ہے کہ جس طرح تمہیں یہ لوگ کہتے ہیں۔ اس پر رضامند ہو جاؤ۔ تاکہ تمہاری زندگی آرام سے گزرے۔ وزیر سلطان کے والدین جس طرح مناسب سمجھیں کریں۔ ہم وزیر سلطان کے متعلق کچھ بات چیت نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ہم سے زیادہ اس کے والدین کو اپنی بیٹی کی بہتری کا خیال ہے۔ دوسرے وہ خود عقلمند اور ہوشیار ہے مگر تم بالکل بے سمجھ ہو۔

میں۔ تو تمہاری اپنی منشا کیا ہے؟

سجادہ بیگم۔ میں تو ان لوگوں سے بچ کر اپنے والدین کے ہاں چلی جاؤنگی۔

میں۔ کیا یہ لوگ وہاں رہنے دیں گے؟

سجادہ۔ میں تو چلی جاؤں گی۔ ٹھہروں گی نہیں!

میں۔ ابھی تم مت جاؤ۔ میرا فیصلہ تو ہونے دو۔ ہمارے جو قرضدار ہیں اُن سے وصولی تو ہو جائے۔ پھر تمہیں اختیار ہے۔

سجادہ بیگم۔ بہت بہتر۔

دوسرے روز وہ پھر اپنی نند زہرہ کے پاس چلی گئی۔ میں نے دل میں سوچا۔ کہ اس کے چلے جانے میں ضرور کچھ مصلحت ہو گی۔ اس کے بعد ہم دونوں کے نکاح کا مشورہ ہونے لگا۔

ذوالفقار خاں صاحب چار ماہ کی رخصت لیکر لاہور تشریف لے آئے نسبت روڈ پر عمر حیات صاحب ٹوانہ بھی لفٹننٹ صاحب کے ہاں تھے۔ یہ دونو ہم پیالہ ہم نوالہ اپنی اپنی تجویزیں سوچا کرتے تھے۔ مجھے بھی اطلاع ہوتی رہتی۔ ذوالفقار صاحب میرے رشتہ دار بھی تھے اس لئے وہ کھلے بندوں میرے گھر آجاتے تھے۔ اور بعض وقت کھانا بھی میرے ہی دسترخوان پر کھا لیتے۔ لہذا لوگوں کی نظروں میں یہ بات میرے متعلق پختہ ہوتی جاتی تھی۔

ذوالفقار خاں صاحب ابتدا ہی سے ہمارے ساتھ مہربانی اور شفقت سے پیش آیا کرتے تھے۔ اور میرے والدین کا بھی شروع سے ادب اور عزت کرتے آئے تھے۔ اس لئے بلحاظ رشتہ اور مہربانی جہاں تک ممکن تھا۔ میرے والدین بھی اُن کے ساتھ شفقت کرتے تھے۔ مگر مجھے ان کی اس عادت سے نفرت تھی۔ کہ وہ بھی وسکی کے عادی تھے۔ اور صحت بھی کچھ خراب ہو رہی تھی۔ مجھے ان کی حالت کا اندازہ تھا۔ اور مے پرستی سے مجھے دلی نفرت بلکہ خوف آتا تھا۔ میرا دل شراب کا نام سنتے ہی بے چین ہو جایا کرتا تھا۔ کیونکہ اسی کمبخت کے استعمال نے میری دنیا برباد کی۔ میرے سرتاج کو سپرد خاک کیا۔ تو اب اگر کوئی ہاتھ بھی لگاتا۔ تو مجھے اس کی

جان خطرے میں ہونے کا اندیشہ ہو جاتا تھا۔ جب کسی وقت ذوالفقار خاں صاحب میرے غریب خانہ پر تشریف رکھتے تو میں نہایت ادب سے انکی خدمت کرتی تھی۔ وہ بلحاظ رشتہ بڑے بھائی بھی تھے۔ مگر جب کبھی ان کو مے نوشی کی حالت میں دیکھتی۔ تو میرا دل سخت متنفر ہو جاتا۔ میں چھپ جایا کرتی تھی۔ ایک دن شام کا وقت تھا۔ ذوالفقار خاں صاحب غریب خانہ پر تشریف لائے۔ میرے والد صاحب قبلہ بھی ایک آرام کرسی پر حقہ لگائے بیٹھے تھے۔ ذوالفقار صاحب نے سلام کیا۔ اور والد صاحب کے پاس ادب سے بیٹھ گئے۔ میری نسبت دریافت کیا۔ کہ وزیر کہاں ہے؟

والد صاحب۔ کہیں اندر ہو گی۔ اس کے سر میں درد تھا۔

ذوالفقار خانصاحب (میری ملازمہ سے) نوشابہ! وزیر کی طبیعت کیسی ہے؟

مَیں نے اپنی ملازمہ سے کہدیا۔ کہ کہدو میرے سر میں درد ہے۔ اور میری طبیعت اس وقت درست نہیں۔ میں ملنا نہیں چاہتی۔ مجھے اپنا پریشان کن زمانہ یاد آتا ہے۔

نوشابہ بہت بہتر کہہ کر چلی گئی۔ مگر ذوالفقار خاں صاحب نے نوشابہ سے پھر پوچھا۔ "کہ کیا وزیر کو بہت تکلیف ہے"؟

نوشابہ۔ جی ہاں تکلیف تو بے حد تھی۔ اب ذرا آنکھ لگی ہے۔ سو رہی ہیں

ذوالفقار صاحب یہ سنکر بیقراری میں اُٹھے۔ اور اِدھر اُدھر چکر لگانے لگے۔ کبھی کمرہ میں۔ کبھی برآمدہ میں۔ آخر میرے والد صاحب نے آواز دی۔ ذوالفقار کھانا کھالو!

ذوالفقار خاں - بہت اچھا۔

نوشابہ ہاتھ دھلانے کو تولیہ کندھے پر رکھے ہاتھ میں آفتابہ لئے انتظار کر رہی تھی۔ دونو صاحب دسترخوان پر ہاتھ دھوکر بیٹھ گئے۔ ذوالفقار صاحب میرے والدین کے گھر کے کھانے ابتدا ہی سے پسند کرتے اور شوق سے کھانا کھاتے تھے۔ کھانے سے فارغ ہوکر ہاتھ دہوتے وقت ذوالفقار صاحب نے نوشابہ سے کہا۔ دیکھو وزیر سلطان بیدار ہوئی ہیں یا نہیں۔ اُن سے کہو میں جا رہا ہوں۔

نوشابہ بہت اچھا کہہ کر اندر کمرے میں آئی۔ جہاں میں ایک رسالہ دیکھتی تھی۔

نوشابہ۔ بیگم صاحبہ آپ کو ذوالفقار صاحب یاد فرماتے ہیں اور کہتے ہیں کہ میں جا رہا ہوں!

میں۔ تم کہہ دو۔ کہ ابھی سو رہی ہیں!

نوشابہ نے ذوالفقار صاحب سے جاکر کہہ دیا۔ کہ وہ ابھی سو رہی ہیں۔

ذوالفقار کچھ کچھ سمجھ گئے۔ اور ان کو یہ خیال ہوا۔ کہ شاید ناراض ہوگئی ہیں آخر وہ والد صاحب کو سلام کرکے چلے گئے۔ تو میں باہر آکر اپنے کام میں مصروف ہوگئی۔ اُنہوں نے گھر میں پہنچکر اپنے ایک دوست سے اپنی بیقراری کا اظہار کرتے ہوئے کہا

ذوالفقار صاحب۔ "آج میری طبیعت بہت اُداس ہو رہی ہے"

دوست۔ کیوں کیا وجہ ہے؟

ذوالفقار۔ حالات میں کچھ اُلجھن پیدا ہوگئی؟؟

دوست - وہ کیا ؟

ذوالفقار - میں چاہتا تھا - کہ بیوہ قمرالزماں صاحب سے میرا نکاح ہو جائے اس لحاظ سے کہ اس کی طبیعت حرکات و سکنات مجھے بہت پسند ہیں - علاوہ ازیں میرے بچے اور دیگر رشتہ دار بھی سب اسے پسند کرتے ہیں - اور وزیر سلطان کو سب ہی اچھا سمجھتے ہیں - کیونکہ وہ ہر دلعزیز ہے - مگر میں صاف طور پر اس مرحلہ کو ابھی موجودہ صورت میں طے نہیں کر سکتا - اور نہ اظہار محبت کر سکتا ہوں - کیونکہ میری نظروں میں وزیر سلطان کی جو عزت و توقیر ہے اُسے میں ہی جانتا ہوں - مبادا کوئی دشمن میری طرف سے وزیر سلطان کو بدگمان نہ کر دے میں نے دیکھا ہے - کہ وہ آج میرے سامنے تک نہیں آئیں - اور بہانہ کر کے اندر ہی بیٹھی رہیں - میں اس کا سبب بھی نہیں دریافت کر سکتا - اس لئے طبیعت پریشان ہے -

دوست - بہتر تو یہ ہے کہ اس معاملہ میں کسی کو درمیان میں لے آؤ - جو آپ کا خیر خواہ ہو - وہ اُن پر آپ کی خواہش کا اظہار کر دے - پھر معلوم ہو سکتا ہے - کہ اُن کا کیا ارادہ ہے ؟

ذوالفقار صاحب - بیشک - ویسے تو رشتہ کے لحاظ سے آمد و رفت اور اکثر بات چیت ہوا کرتی ہے - مگر ان کو یہ معلوم نہیں - کہ اب میری کیا منشا ہے اور میں کس قدر اس رشتہ کو موزوں سمجھتا ہوں - اپنی ذات کے لئے - ورنہ جب سے میری بیگم کا انتقال ہوا - میں اور کئی جگہ نکاح کر سکتا تھا - مگر جب پسند ہی نہ ہو - تو خواہ کوئی کتنی اچھی لائق ہوشیار تعلیم یافتہ شریف زادی کیوں نہ ہو کسی

کام نہیں۔ بیوی ہمیشہ دل پسند ہونی چاہیئے۔

دوست۔ کیا بیگم قمر الزماں تعلیم یافتہ ہیں؟

ذوالفقار خانصاحب۔ تعلیم یافتہ سے بھی زیادہ لیاقت رکھتی ہیں۔ خانہ داری میں ماہر ہے۔ ہر ایک کام کو سنبھال سکتی ہے۔ اس قدر بڑے پیمانے پر گاؤں میں انتظام کیا ہوا تھا۔ کہ دیکھنے والے حیران تھے۔ بڑی ہوشیار اور لائق ہے۔

دوست۔ تو پھر آپ ان کی منشا کیوں معلوم نہیں کرتے؟

ذوالفقار صاحب۔ اب یہ سلسلہ تو کرنا ہی پڑے گا۔ ورنہ میری طبیعت آجکل بیقرار سی رہنے لگی ہے۔ نہ جانے کیوں۔ اگر ذرّہ بھر بھی ان کی طرف سے بے اعتنائی دیکھ لوں تو دل بے قابو ہو جاتا ہے۔

غرضکہ ایک معتبر ذرائع سے مجھے بھی اُن کی اس گفتگو اور ارادے کا مکمل علم ہو گیا کہ میرے سر درد کے بہلنے سے ذوالفقار صاحب کو تکلیف ہوئی تھی۔ اِس واقع کے کچھ دنوں بعد ایک دن بہن ظہور خانم نے مجھ کو بلایا۔ کہ میں نے ایک دو ضروری باتیں آپ سے کرنی ہیں۔

میں والدین سے اجازت لیکر بہن ظہور خانم صاحبہ کے ہاں چلی گئی۔ انہوں نے رسمی مزاج پرسی کے بعد کہا۔

ظہور خانم۔ وزیر سلطان! تمہاری بدنصیبی پر اگر خون کے آنسو بہائیں تو کم ہیں۔ مگر دنیا کے حادثات خواہ کیسے ہی ناقابل برداشت کیوں نہ ہوں آخر صبر و تحمل سے ہی کام لینا پڑتا ہے۔ دیکھیئے آپ اس قدر خود مختارانہ حکومت

کے بعد آج ایک کرائے کے مکان میں مسافرانہ زندگی بسر کر رہی ہیں۔ یہ ہمتِ مردانہ ہے ورنہ کوئی کم حوصلہ عورت ہوتی تو فوراً گھبرا جاتی اور اپنے عزیز و اقربا کو بھی حیران کر دیا ہوتا۔ آفرین ہے۔ آپ کے حوصلہ پر ناگوار حالات نے بچہ بھی آپ سے علیحدہ کیا۔ دوسری بیگم بھی علیحدہ ہوئی۔ مگر آپ نے اُف تک نہ کی۔ اس افتاد اور ناشدنی کی کسے خبر تھی۔ کہ آپ پر ایسا دن بھی آئے گا!

میں۔ بہن ظہور! میں تو ابتدا ہی سے دکھیا ہوں۔ پہلے میں اکلوتی تھی۔ پھر والدین کی جدائی میرے لئے مصیبت بنی۔ اس کے بعد جب اپنے گھر میں خود مختاری کا زمانہ آیا۔ تو ساتھ ہی بے اولادی کا فکر دامنگیر ہو گیا۔ اسی عالمِ پریشانی میں اپنی جوانی اور تمناؤں کو خاک میں ملا کر دل پر صبر کا پتھر رکھا۔ تو خدا نے میری جدوجہد کو پھل لگایا۔ گھر میں بچوں کا منہ دیکھا۔ آخر اس خوشی کو بھی موت نے برباد کر دیا۔ اب ہم مردہ بدست زندہ ہیں۔ جو کسی کا جی چاہے کہہ دے ؎

باغباں نے آگ دی جب آشیانہ میں مرے
جن پہ تکیہ تھا وہی پتّے ہوا دینے لگے

ظہور خانم خدا نہ کرے کہ آپ کی ایسی حالت ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ کے ہمدرد اور رشتہ داروں کا یہ خیال ہے۔ کہ اس بیکسی میں والدین کی زندگی تک آپ کو بے فکری ہوگی۔ اور ان بزرگوں کے بعد آپ کس کا سہارا لیں گی؟؟

میں - بہن ظہور! یہ اور وہ دونوں وقت خدا کے اختیار میں ہیں۔ میری طاقت نہیں۔ کہ میں کچھ چوں چرا کر سکوں۔ جو اللہ کو بہتر منظور ہوگا۔ وہی ہو جائے گا۔ میری تشویش سے کچھ نہیں بن سکتا۔

ظہور خانم۔ دنیا با امید قائم۔ اسی امید پر انسان کیا کیا نہیں کرتا۔ حالانکہ سمجھتا ہے کہ یہ دنیا ناپائیدار ہے مگر پھر بھی کچھ نہ کچھ سوچتا ہے آپ کو کچھ سوچنا چاہیئے۔

میں۔ اس صورت میں کیا سوچ سکتی ہوں۔ میری سوچ سمجھ تو اسوقت بے کار ہے۔ میری زندگی کا روشن ستارا غروب ہو گیا۔ اب یہ دنیا تاریک ہے۔ میرے دل میں نہ کوئی خواہش ہے۔ اور نہ کوئی تمنا۔ یہ انقلاب میری خواہشوں کو ختم کر چکا۔ ان تاریک فضاؤں میں مجھے کچھ بھی نظر نہیں آتا۔

ظہور خانم میری اس مایوسی پر مغموم ہو کر خاموش ہو گئیں اور جو کچھ اُن کے دل میں تھا۔ وہ بیان کرنے کی جرأت نہ کر سکیں۔ میں نے پھر کہا۔

" بہن ظہور! آپ کو بخوبی معلوم ہے کہ اپنے زمانہ میں چند روز کے لئے میں بھی عروج یافتہ تھی۔ شوہر کی حرمت اور عزت کا مجھے فخر حاصل تھا۔ کنبہ کے خورد و کلاں میری ہر ایک بات کو پسند کرتے اور میں سب کی نظروں میں مقبول تھی۔ خانہ داری کے کاروبار مجھ سے انجام پا چکے تھے۔ والدین کی نازپروردہ اور نورِ نظر تھی۔ غرضیکہ دنیا کی کوئی بہار اور قدرت کا کوئی کرشمہ ایسا نہ تھا جس کا میں نے لطف نہ اٹھایا ہو۔ آہ افسوس!

اِن ایام مسرت میں بھی تفکرات سے مجھے نجات نہ ملی۔ تو اب اس عجیب و غریب انقلاب اور نیرنگیٔ بخت پر میں اپنا کیا انتظام کروں؟

ظہور خانم متوجہ ہو کر میری باتیں سنتی رہی۔ اُن کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ جس قدر خلوص اور ہمدردی سے انہوں نے میری درد بھری خونچکاں گفتگو کو سُنا مجھے اب تک یاد ہے۔ خدا مغفرت کرے۔ مصیبت اور بیوگی کا زمانہ اُن پر بھی گزر چکا تھا۔ نہایت عقلمند اور سمجھدار خاتون تھیں۔ دوسرے خاوند کے ساتھ اُن کی زندگی اس زمانہ میں بڑی شان سے گذر رہی تھی۔ اسی گفتگو کے دوران میں ہم نے چائے پی۔ آخر میں ظہور خانم صاحبہ نے مجھے دعا دی۔ کہ اچھا جس طرح تم خوش رہو۔ ہمیں بھی اسی میں راحت ہے۔ اور کہا۔ میں نے سنا ہے۔ کہ آپ کے والد صاحب حج کی تیاریاں کر رہے ہیں؟

میں۔ جی! اُن کا تو کئی برسوں سے خیال ہے۔ مگر میں ہی والد صاحب کی جدائی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اب تو انشاء اللہ اُن کے ہمرکاب رہونگی۔ آپ بھی دعا فرماتی رہیں۔ ظہور خانم آمین! کہتے ہوئے دروازہ تک مجھے رخصت کرنے آئیں۔

میں جب گھر واپس آگئی۔ تو ذوالفقار صاحب ظہور خانم کے پاس تشریف لے گئے۔ اور اُن سے میرے متعلق سب حال معلوم کیا۔ جس کا انجام مایوس کن تھا۔ اور حج کے متعلق بھی انہیں وہیں سے معلوم ہو گیا۔ دوسرے روز حسب دستور ذوالفقار صاحب تشریف

لائے تو میں اتفاق سے کمروں کی صفائی کروا رہی تھی۔ چنانچہ مجھے اپنی مصروفیت میں معلوم نہ ہوا۔ کہ وہ مجھے دیکھ رہے ہیں۔ جب میں نے دوسری طرف دیکھا۔ تو مجھ سے ذوالفقار صاحب نے کہا۔ حاجن جی سلام علیکم! میں کچھ شرمسار سی ہو گئی۔ جلدی سے اپنا دوپٹہ سنبھال ادب سے ذوالفقار صاحب کو بیٹھنے کے لئے آرام کرسی پیش کی۔ اور دل میں سمجھ گئی کہ بہن ظہور خانم صاحبہ سے سنکر آئے ہیں۔ اتنے میں والد صاحب بھی اندر تشریف لے آئے۔ ذوالفقار صاحب والد صاحب سے گفتگو کرنے میں مصروف ہو گئے۔ اور اس طرح انہیں پھر مزید گفتگو کا موقعہ ملا۔

اِنہی ایام میں میری سہیلی نشاط افزا کبھی کبھی میرے پاس آیا کرتی تھیں ایک دن انہوں نے بھی ایک ایسا ہی معاملہ پیش کیا میں نشاط افزا کی خاطر عزیز اور ہمدردی سے بھی واقف تھی۔ کیونکہ ان کا ہر عمل اخلاص و محبت میں ڈوبا ہوتا تھا۔ جسے صرف میں ہی جانتی تھی۔ مگر اب میرے حالات نے ایسے نازک پہلو اختیار کر رکھے تھے۔ کہ میں زمین پر بھی پھونک پھونک کر پاؤں رکھتی تھی۔ مجھے ہر وقت یہی فکر دامنگیر تھا۔ کہ مجھے کوئی بُرا نہ کہدے یا مجھپر کوئی عیب نہ لگا دے۔ کیونکہ لاوارثی کا زمانہ تھا۔ ادھر میرے والد صاحب کے دلمیں حج کا ایسا خیال سمایا ہوا تھا۔ کہ دن رات یہی باتیں کیئے جاتے۔ اور اس انتظار میں تھے۔ کہ میرے مہر کا فیصلہ ہو جائے تو پھر مکمل انتظام کیا جائے۔ ادھر میرے دل میں سجادہ بیگم اور بچے کے علیحدہ ہونے کا رنج تھا۔ اسی عالمِ مایوسی میں اکثر سوچا کرتی تھی۔ کہ

اگر میں اس وقت بھی کوئی تعلیم حاصل کر لوں تو بہتر ہو گا۔ میری زندگی آسودہ ہو جائے گی۔ میرے خیالات تعلیم میں لگ جائیں گے۔ اور پریشانی سکون میں تبدیل ہو جائے گی۔ وقت کی پابندی سے میرا دل قابو میں رہے گا۔ ہر وقت کی گریہ وزاری سے کہیں طبیعت خود رفتہ نہ ہو جائے۔ میں ایسی کئی صورتیں دل میں سوچتی۔ بقول شخصے ؎

ارادے باندھتی تھی، سوچتی تھی، توڑ دیتی تھی
کہیں ایسا نہ ہو جائے کہیں ایسا نہ ہو جائے

ایک دن میں بے حد پریشان حال اپنے ماضی اور مستقبل پر غور کر رہی تھی۔ کہ یکا یک مس گھوش آ گئیں۔ میں نے انہیں دیکھتے ہی کہا۔ اچھا ہوا۔ کہ آپ آ گئیں۔ میں بے حد اداس تھی۔

مس گھوش:۔ آپ نے کل بلایا تھا۔ مگر مجھے اس وقت فرصت نہ تھی۔

میں:۔ آپ کی ممنون ہوں۔ کہ آپ اپنا قیمتی وقت ضائع کر کے میرے پاس تشریف لاتی ہیں۔

مس گھوش:۔ میں نے تو آج ایک اور بات سنی ہے۔

میں:۔ وہ کیا؟

ایک اور جگہ بھی آپ کے متعلق مشورہ ہو رہا ہے۔

میں:۔ مجھے ایسے مشوروں کی پرواہ نہیں۔ وہ میرے اپنے اختیار کی باتیں ہیں۔ مجھے نشاط افزا نے ایک شخص کے متعلق بتایا تھا۔ مگر میں

اُن کو سوائے خاموشی کے اور کوئی جواب نہ دونگی۔ رفتہ رفتہ اُن کو خود ہی میرے استقلال سے اطمینان ہو جائے گا۔ مجھے تو سجادہ اور بچے کے علیٰحدہ ہونے کا اس قدر رنج ہے جسکا اظہار نہیں کرسکتی۔ میری زندگی اُن کی ذات سے وابستہ تھی۔ اب میرا دل شکستہ ہو چکا ہے۔ میں اپنے متعلق دن رات خدا جانے کیا کیا سوچتی ہوں۔ اور رہ رہ کر مجھے یہ خیال پریشان کرتا ہے۔ کہ اُنہوں نے میرے ساتھ کیا کیا؟

مس گھوش۔ بیشک آپ کو ناقابلِ برداشت صدمہ ہے۔ مگر جہاں تک میں سمجھتی ہوں۔ وہ بھی آپ کو محض محبت کی خاطر کینے سے علیٰحدہ کرنا نہیں چاہتے۔ ان کی اصل منشا یہ ہے کہ آپ ذوالفقار خاں صاحب کے گھر میں آباد ہو جائیں۔ اور ان کے سامنے رہیں۔ آپ ہیں کہ صرف ایک ہی خیال کو لے بیٹھی ہیں۔ ان کو اسبات کا بھی رنج ہے۔

میں۔ اس رنج کو میں خود ہی محسوس کرتی ہوں۔ مگر اُن کا رنج میرا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا۔ کوئی میرے حسب منشا بھی ہو؟ یہاں تو وہی مثل ہے۔ کہ "گڑھے سے نکل کر کوئیں میں گرے" وہی سب مصیبتیں جو بارہ برس تک برداشت کرتی رہی ہوں۔

مس گھوش۔ میرے خیال میں تو بہتر ہے کہ آپ صبر کریں۔

میں۔ مگر مجھے نواب اپنی بیکار زندگی کا خیال ہے کہ کس طرح میرا وقت گذرے گا۔ نہ تعلیم نہ تربیت۔ سوائے کھانے اور دن رات گریہ آہ وزاری کرنے کے اور کوئی کام ہی نہیں۔ جن کی خاطر میں نے اپنے دل پر

جبر تشدد کئے تھے۔ کہ میں آباد رہوں۔ جب وہ نہیں تو اب میرا کیا ہے؟ کیا یہ لوگ کسی اور طریق سے مجھے اپنے پاس نہیں رکھ سکتے تھے؟ اگر میں نے مہر وصول کر لیا تھا۔ تو وہ لیکر میں کہیں بھاگ تھوڑا ہی جاتی۔

مس گھوش۔ دیکھو بی بی تم اپنے دل کو مطمئن رکھو۔ میں نے ایک انگلش کی کتاب میں پڑھا تھا۔ کہ دنیا میں کوئی ایسا دل، دماغ نہ ہوگا جس پر خوشی کی حکومت اور رنج و غم کی دست درازی نہ ہوئی ہو۔ خود ہمارا تجربہ بھی یہی ہے۔ کہ عمر میں کئی بار ہمارے دل و دماغ پر خوشی کا پھریرا لہرایا گیا۔ اور کتنی دفعہ غم نے ملیا میٹ کر کے اپنی یورشیں دکھائیں۔ جب دنیا کا یہ حال ہے۔ تو ہمیں سوچنا چاہیئے۔ کہ زندگی کے ناہموار دن گزارنے کے لئے کوئی سبیل بھی ہے؟ تو اس حالت میں صرف عقلِ سلیم ہی رہبری کر سکتی ہے۔ رنج اور خوشی کو ہم مستولی اور غالب نہ سمجھیں کیونکہ یہ دونوں حالتیں غیر مستقیم اور زوال پذیر ہیں۔ حالت ہمیشہ یکساں نہ رہیگی۔ یہ خیال آتے ہی اضطرابی حالت خود بخود کم ہوکر صبر و سکون اور استقامت کے سامان پیدا ہونے لگیں گے۔ مگر ساتھ ہی یہ بات بھی ذہن نشین کر لینی چاہیئے۔ کہ خوشی کے موقعہ پر گھمنڈ نہ کرنا چاہیئے مبادا یہ خوشی مصیبت کا پیش خیمہ ہو جائے۔ اور جب غم کا سامنا ہو تو مردہ دل ہوکر خدا کی رحمت اور لطف و کرم سے ناامید نہ ہونا چاہیئے۔ گو طبعاً خوشی و غم دونوں ہمارے رگ و ریشہ پر غالب ہوکر ہمیں مغلوب و مضطرب کر دیتے ہیں۔ مگر پھر بھی خدا کی ذات پر بھروسہ رکھنا چاہیئے۔ اور سوچنا چاہیئے۔ کہ کوئی کام اُس رب العلمین کا حکمت اور راز سے خالی نہیں ہوتا۔ جب ہمارے

معاملات میں اس مہربان کا کرم شامل ہے۔ تو نہ زیادہ اضطراب کی ضرورت ہے۔ اور نہ بے حد انبساط کی۔ ہم لوگ خوشی کے موقعہ پر وارفتہ ہو جاتے ہیں۔ اور غم کے حادثہ پر دل گرفتہ ہوکر اپنے پیدا کرنے والے کا ارشاد بھول جاتے ہیں۔ ہر حال میں اپنے حواس پر غالب رہنا چاہیئے۔ دنیا کا نقشہ کبھی ایک حالت پر قائم نہیں رہتا۔ ؎

فلک دیتا ہے جنکو عیش انکو غم بھی ہوتے ہیں
جہاں بجتے ہیں نقارے وہاں ماتم بھی ہوتے ہیں

میں مس گھوش کی یہ باتیں خاموشی اور توجہ کے ساتھ سنتی رہی۔ اس کے الفاظ مجھے متاثر کر رہے تھے۔ آخر میں میں نے مس گھوش کا شکریہ ادا کیا۔ عقل مند دوست بھی دردِ دل کی دوا ہوتا ہے۔ میری طبیعت کچھ امن پذیر ہوگئی۔ سب سے زیادہ مجھے اپنی تنہائی اور بیکسی کا خیال تھا۔ والدین کے سوا ان دنوں میرا کوئی حقیقی ہمدرد نہ تھا۔ مگر وہ بھی ضعیف اور کمزور دل تھے۔ جن کو میری زندگی اور راحت کی تمنا تھی۔ لہذا میں پورے طور پر کوئی حال بھی اُن سے بیان نہ کرتی۔ دل کی جو کیفیت تھی اسکا خدا ہی مالک تھا۔ ایک دن نشاط افزا میرے پاس آئیں۔ کہ تمہارے مہر کا فیصلہ کب ہوگا؟ مجھے بے حد تشویش رہتی ہے۔ ایسا نہ ہو درمیان میں ہی لٹکتی رہو۔

میں۔ نہیں ایسا نہیں ہوسکتا۔

نشاط۔ تم ان لوگوں پر یقین کیے بیٹھی ہو۔ ہمیں تو یقین نہیں۔ بہتر تو یہ ہے کہ تم اپنے والدین کے گھر جاکر آرام سے بیٹھو۔ یہاں کب تک کرائے بھرتی رہو گی؟

میں۔ تا وقتیکہ مہر کا فیصلہ نہ ہو۔
نشاط۔ مہر کا فیصلہ تو اس قدر جلدی ہوتا نظر نہیں آتا۔
میں۔ نہیں۔ یہ آپ کا خیال ہے۔ جلدی ہو جائے گا۔
نشاط۔ تمہاری بھولی بھالی باتیں تمہیں ضرور تکلیف دیں گی۔
میں۔ بتاؤ۔ اب میں اس صورت میں جب وہ وعدہ کرتے ہیں۔ کس طرح اُن سے فرار ہو کر یکدم علیحدہ ہو جاؤں۔ یہ کونسی عقلمندی ہے۔
نشاط۔ مجھے یقین نہیں کہ تمہارے ساتھ انہیں کوئی دلی اُنس ہو!
میں۔ بلا سے اُنس ہو یا نہ ہو۔
نشاط۔ تو پھر تم اُن پر مر کیوں رہی ہو۔ "بندہ پرور یہ محبت ہیں حکومت کیسی"
میں۔ آخر وہ میرے عزیز ہیں۔ مجھے اُن پر یقین رکھنا ہی چاہیئے۔
نشاط۔ اچھا! جو جی چاہے کرو۔ مجھے کیا!
میں۔ مانا کہ آپ کو میرے ساتھ دلی اُنس ہے۔ مگر اس نازک وقت میں آپ کا مجھے تنگ کرنا مناسب نہیں۔ خیال تو کرو۔ خواہ مخواہ کیوں ان لوگوں سے فساد کروں۔

یہ سنکر نشاط افزا غصّے میں آگ بگولا ہو کر چلی گئی۔ میں نے اس کے جانے کے بعد دلمیں سوچا کہ آخر اس کے بگڑنے کی کیا وجہ تھی؟ مگر میری سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ نشاط افزا نے اسقدر جنگ جُو۔ خشک اور ردکھی پھیکی باتیں کر کے میرا دل کیوں دُکھایا۔ اور خود بھی رنجیدہ ہو گئی۔ مجھے رہ رہ کر افسوس آ رہا تھا۔ کہ

برسوں کی محبّت فضول خیالات کی بنا پر منقطع ہوگئی۔ اس خیال سے میری طبیعت بہت بےچین ہورہی تھی۔ میری والدہ صاحبہ نے کہا بیٹی دل کو رنج نہ دو مصیبت کے وقت دوست بھی دشمن ہوجایا کرتے ہیں۔ وہ تند مزاج لڑکی ہے تم ذرا دانائی سے کام لو۔ یہ سنکر میں خاموش ہورہی۔

میری طبیعت کی کمزوری سے مجھے اکثر خمیازے بھگتنے پڑتے تھے انسان کی دلی کمزوری بھی بعض وقت خراب کردیتی ہے۔ مجھے تو ہر وقت اپنی کم مائگی کا رونا تھا۔ مرحوم کو گزرے ایک برس ہوگیا تھا۔ ادھر ذوالفقار خاں صاحب کی تگ و دَو سے مہر کا فیصلہ بھی ہوگیا۔ سب قرضخواہوں کو روپیہ ادا کرکے مجھے میاں فرخ سیر بلانے آئے کہ کل ۱۱ بجے ہم گوجرانوالہ کمشنر صاحب کی کوٹھی پر جائیں گے۔ ذوالفقار صاحب نے تمہارا مہر وصول کرنے کا وہاں انتظام کیا ہے۔ کمشنر صاحب ذوالفقار کے دوست ہیں۔ ان کو ذوالفقار خاں صاحب نے کہا ہے۔ کہ ہم بیوگان کو کچہری نہیں لے جاسکتے۔ اس لئے گھر میں ہی فیصلہ ہوجانا چاہیئے۔ چنانچہ انہوں نے منظور کرلیا ہے کل ۱۱ بجے ہم سب کھانا بھی ذوالفقار خاں صاحب کی کوٹھی پر ہی کھائیں گے۔ اور وہاں سے گوجرانوالہ چلیں گے۔

دوسرے دن صبح ہی ایک ملازم رقعہ لیکر آیا۔ جس میں لکھا تھا:۔

عزیز بہن وزیر سلطان! تم ۱۱ بجے سے پہلے یہاں آجاؤ۔ کھانا بھی یہاں آکر کھانا۔ میں انتظار کروں گا فقط

تمہارا خیر خواہ بھائی
"ذوالفقار"

میں اور سجادہ بیگم نے ملازم کو کہہ دیا۔ کہ بعد سلام کے عرض کر دینا۔ کہ بہت اچھا۔ ہم حاضر ہو جائیں گی۔

دوسرے دن ہم ذوالفقار خاں صاحب کی کوٹھی پر پہنچے۔ تو خود ذوالفقار صاحب اور اُن کا صاحبزادہ انتظار میں تھے۔ ہم سب کو دیکھ خوش ہوئے۔ سلام کیا اور آگے بڑھے۔ چنانچہ ذوالفقار صاحب ہمارے ساتھ قدم قدم چلتے گئے۔ پہلے ڈرائنگ روم میں بیٹھے۔ اسکے بعد دوسرے کمرے میں جاکر کھانا کھایا۔ بہت سے اچھے اچھے کھانے اور پھل وغیرہ دسترخوان پر تھے۔ کھانا کھانے کے بعد پھر ہم سٹیشن کی طرف روانہ ہوئے۔ ریل میں ابھی کچھ وقت تھا۔ ذوالفقار خاں صاحب پلیٹ فارم پر ٹہلتے پھرتے تھے۔ اتنے میں مالی نے کچھ پھول ذوالفقار صاحب کو پیش کئے۔ انہوں نے ایک گلاب اُٹھا کر میرے ہاتھ میں دیدیا۔ میں نے سر جھکا کر شکریہ ادا کیا۔ میاں فرخ اور سجادہ بیگم میری طرف دیکھ کر خفیف سی مسکراہٹ میں کہنے لگے۔ شکریہ ادا کرنا بھی کمال ہی ہے۔

سجادہ بیگم۔ اسی لئے تو پھول پیش کیا گیا تھا۔ کہ شکریہ کی ادا ہی دیکھیں گے۔

میں نے سنجیدگی سے کہا۔ کہ آپ کو خوب مذاق کرنے کا موقع مل گیا۔ میرے بڑے بھائی ہیں۔ اگر شکریہ ادا کر دیا تو کیا ہو گیا۔

میاں فرخ سیر۔ نہیں نہیں بھابی جان! آپ ناراض نہ ہو جیئے گا۔ ہم نے تو محض آپ کی طرزِ ادا کی تعریف کی ہے۔ معاف کیجئے۔ بھلا ہم آپ کی

شان میں گستاخی کر سکتا ہوں؟؟

بیں۔ تم نے بھی ادا دیکھنے کا اندازہ لگانا اس وقت مناسب سمجھا!

میاں فرخ۔ واللہ بھابی جان معاف کیجئے!

اتنے میں ذوالفقار صاحب تشریف لے آئے اور کہا چلو۔ ہم سب پلیٹ فارم پر آکر ریل میں سوار ہو گئے۔

گوجرانوالہ پہنچے تو کمشنر صاحب کی لینڈو ہمارے واسطے آئی ہوئی تھی۔ ہم دونو ایک طرف بیٹھیں۔ اور ذوالفقار خاں اور میاں فرخ دوسری طرف بیٹھ گئے۔ میرے دل میں عجیب خیالات پیدا ہو رہے تھے۔ ادھر ذوالفقار صاحب فیصلہ مہر کے بعد اپنی اظہار محبت اور اسکے انجام کے متعلق سوچ رہے تھے۔ فرخ سیر اپنے خیال میں مست تھے۔ کہ اب مجھے بھی کچھ اظہار کرنے کا وقت مل جائے گا۔ غرضیکہ ہم چاروں اپنے اپنے خیالات اور ارادوں میں محو تھے۔ کہ یکایک کمشنر صاحب کی کوٹھی آگئی۔ ہم سب اُترے۔ برآمدے کے قریب ایک طرف کمشنر صاحب کھڑے تھے ذوالفقار صاحب سے ہاتھ ملا کر ایک کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ وہاں ایک بہرا چلمن اُٹھائے کھڑا تھا۔ ہم کمرے کے اندر چلی گئیں۔ اور ایک صوفہ پر دونو بیٹھ گئیں۔ کمرہ نہایت اعلےٰ طریق سے آراستہ تھا۔ اتنے میں ایک ادھیڑ عمر کی عورت سُرخ رنگ کا سوٹ پہنے ہوئے ہمارے پاس آئی اور کہنے لگی۔ آپ کا تین بجے سے انتظار تھا۔ مگر آپ دیر سے تشریف لائیں!

میں نے کہا۔ جی گاڑی دو گھنٹے لیٹ تھی۔

انہوں نے کہا درست ہے!

بعد میں معلوم ہوا کہ وہ کمشنر صاحب کی بیگم صاحبہ تھیں۔ ایک ملازمہ نے کچھ پھل وغیرہ ہمارے سامنے لا کر رکھ دئے۔ ہم نے محض ان کی خاطر تھوڑا بہت کھا لیا۔ مگر میری طبیعت بہت خراب ہو رہی تھی۔ کچھ دیر بعد ذوالفقار خاں صاحب تشریف لائے۔ کہ برقعہ پہن کر دوسرے کمرے میں آؤ۔ ہم دونوں وہاں گئیں۔ تو کمشنر صاحب کھڑے تھے۔ اور ایک آدمی ان کے قریب ہی کاغذات لئے ہوئے تھا۔ کمشنر صاحب نے میرے اور سجادہ بیگم کے "نشان انگوٹھہ" لگوائے۔ جس وقت مجھے نشان انگوٹھا لگانے کیلئے کہا۔ بخدا میرے دل کے ٹکڑے ٹکڑے ہو رہے تھے۔ سجادہ بیگم ابھی کمسن اور نادان تھی۔ اس کو اس قدر رنج نہ تھا مگر جو کچھ میری کیفیت ہو رہی تھی۔ اُسے خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ آخر کمشنر صاحب نے میرا نام لیکر کہا۔ کہ وزیر سلطان تمہیں مہر کی رقم وصول ہو گئی؟ تم نے اپنی خوشی سے وصول کی ہے؟

رونے کی وجہ سے میری آواز اسقدر بھاری ہو گئی تھی۔ کہ میں ہاں ہوں تک نہ کر سکی۔ آخر ذوالفقار صاحب میری خاموشی پر گھبرا گئے۔ اسپر میں نے کہدیا۔ کہ ہاں وصول ہو گئی ہے۔

انہوں نے پھر سوال کیا۔ کہ کس کی معرفت؟

میں نے کہا۔ نواب ذوالفقار خاں صاحب کی معرفت۔

بس اسی طرح چند سوال سجادہ بیگم سے کئے۔ اس کے بعد ہم وہاں سے رخصت ہوئے۔

کمشنر صاحب اور ذوالفقار خاں صاحب آپس میں کچھ دیر انگلش میں ہمارے متعلق باتیں کرتے رہے۔ پھر ہم اسی لینڈو میں سوار ہو کر سٹیشن پر آئے اور ریل میں سوار ہو گئے۔ میں ایک طرف کھڑکی کے پاس بیٹھ گئی۔ دوسری طرف میاں فرخ سیر اور ذوالفقار صاحب بیٹھے میری طرف دیکھ دیکھ کر انگلش میں کچھ باتیں کرتے رہے۔

آخر ذوالفقار صاحب نے میری طرف متوجہ ہو کر کہا۔ وزیر سلطان! تم کیوں رنجیدہ ہو رہی ہو۔ خدا کا شکر ادا کرنا چاہیئے۔ کہ فیصلہ ہو گیا۔ اگرچہ مہر کی رقم ایک ایسی چیز ہے۔ جو ہر طرح سے وصول ہو سکتی ہے۔ مگر نابالغوں کے سوال سے اگر کچھ دیر ہو جاتی۔ تو پھر مشکل امر تھا۔ ہم کچھ بھی نہ کر سکتے تھے۔ اچھا اللہ پاک کو اسی طرح منظور تھا!

یہ سنکر میرے آنسو گرنے لگے۔ اور میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ اتنے میں لاہور کا سٹیشن آگیا۔ میرا ملازم آیا ہوا تھا۔ سجادہ بیگم اور میں نے اپنے گھر کا راستہ لیا۔ میاں فرخ سیر نے کہا کہ بھائی صاحب ذوالفقار خاں کے پاس آپ کے مہر کا چیک ہے۔ اس کے متعلق بنک سے بات کرنی ہے۔ وہاں سے واپسی پر آپ کی طرف آویں گے۔

میں نے کہا اچھا میں انتظار کرونگی۔ میاں فرخ سیر "بہتر" کہتے ہوئے دوسری طرف روانہ ہو گئے۔

ہم دونو والدہ صاحبہ کے پاس جا کر بیٹھ گئیں۔ انہوں نے مغموم صورت سے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔ بس فیصلہ ہو گیا؟ کیا ہم نے اسی وقت کیلئے مہر لکھوایا تھا۔ کاش کہ تمہارے اولاد ہوتی۔ کاش! میاں بخت نصر صاحب بیمار نہ ہوتے۔ تو پھر بھی یہ گھر تمہارا گھر تھا۔ برسوں کی آبادی اور امیدیں سب خاک میں مل گئیں۔ اور تم فقط مہر کی رقم لے کر علیحدہ ہو گئیں۔ یہ سنکر میری اور سجادہ بیگم کی روتے روتے ہچکی بندھ گئی۔ والد صاحب بزرگوار کمرے سے باہر آئے اور ہمیں اطمینان دلایا۔ کہ بیٹی یہ تمہاری زندگی بسر کرنے کے لئے تمہارے گزر اوقات کی خاطر ہے۔ میری زندگی کے بعد تمہیں یہ رقم سہارا دیگی۔ ورنہ ہمیں کیا ضرورت تھی؟ اگر تمہارا کوئی بھائی ہوتا تو تمہیں اس رقم کی کیا حاجت تھی۔ مگر اس بیکسی و بے بسی میں کبھی بھی تمہیں کسی کے آگے دست دراز نہ کرنا پڑے گا۔ اب حوصلہ کرو۔ رونے سے کیا فائدہ؟ یہ بھی غنیمت ہے۔ جو ہوا بہتر ہوا۔ (والدہ صاحبہ کی طرف متوجہ ہو کر) واہ! اچھا حوصلہ دیا۔ خواہ مخواہ بچی کو بیقرار کر دیا"۔ صبر کرو۔ بہت بہتری کے سامان ہو گئے۔ اب ہم حج کو جائیں گے۔ خدا جلدی سامان سفر نصیب کردے میرے سر پر والد صاحب نے دستِ شفقت رکھا۔ اور دلاسا دیا۔ کہ شریف زادیوں کے واسطے صبر شکر بہتر ہے حوصلہ کرو۔ اتنے میں ذوالفقار صاحب اور میاں فرخ بھی تشریف لے آئے۔

میرے والدین نے ذوالفقار صاحب کا شکریہ ادا کیا۔ کہ بیٹیا یہ آپ کی تگ و دو سے جلدی فیصلہ ہو کر اس بدنصیب بچی کی روزی کا سامان

مہیا ہو گیا۔ ورنہ خدا معلوم کب تک یہ سلسلہ جاری رہتا۔ یہ سب تمہاری مہربانی ہے۔

ذوالفقار صاحب۔ بھلا یہ کون سی بڑی بات تھی؟ میرا اپنا فرض تھا۔ کہ آپ کی ضعیف العمری کے وقت اپنی مصیبت زدہ بہن کی تکلیف میں ساتھ دینا۔ یہ لیجئے مہر کا چیک ہے۔ اسکو سردار گرمکھ سنگھ سے وصول کرنے کے بعد جس طرح آپ حکم دیں گے بینک میں رکھوا دیا جائے گا۔

والدہ صاحب۔ جس طرح تم مناسب سمجھو۔ بینک کے سوا اور کونسی جگہ محفوظ ہو سکتی ہے؟

ذوالفقار خاں۔ جی ہاں بالکل درست ہے۔

کھانے کا وقت تھا۔ دسترخوان لگا دیا گیا۔ ذوالفقار صاحب میاں فرخ۔ میرے والد صاحب۔ سجادہ بیگم اور میں نے ملکر کھانا کھایا۔ اس کے بعد میاں فرخ اور ذوالفقار صاحب تو نسبت روڈ کی طرف روانہ ہوئے۔ میں اور سجادہ بیگم نے والدہ صاحبہ کو مہر وصول کرنے کی کہانیاں سنائیں۔

دوسرے دن میاں فرخ آئے کہ اب ہمیں اجازت دیجئے۔ میری غیر حاضری سے میاں بخت نصر صاحب کی طبیعت زیادہ پریشان ہو گئی ہوگی۔

میں نے کہا۔ سجادہ بیگم اور بچے کو رہنے دو۔

میاں فرخ۔ اچھا یہ رہیں۔ اتنا کہکر وہ رخصت ہو گئے۔ اور جاتے جاتے پھر ذوالفقار صاحب کی طرف گئے۔ اور انسے اپنی خواہش کا بھی ذکر کر کے تم نسر

روانہ ہو گئے۔

ذوالفقار صاحب نسبت روڈ والی کوٹھی میں رہا کرتے تھے۔ میری طرف سے ان کی مایوسی بڑھتی جاتی تھی۔ ایک دن وہ بہت مایوس بیٹھے تھے۔ کہ اُن کے ایک عزیز دوست لفٹنٹ صاحب صاحب آ گئے۔

ذوالفقار صاحب۔ آیئے آیئے۔ (دلگیر ہو کر) بہت اچھا ہُوا۔ آپ آ گئے۔

لفٹنٹ۔ میں نے تو اس تھوڑے سے وقت میں بہت سے کام کرنے تھے۔ مگر آپ سے ملنا بھی ضروری تھا۔ اس لئے سیدھا اسی طرف چلا آیا۔

ذوالفقار۔ مہربانی!

لفٹنٹ۔ بھائی گرمی شدت سے پڑ رہی ہے۔ آپ نے کہیں پہاڑ پر جانے کا انتظام نہیں کیا؟

ذوالفقار صاحب۔ قمر الزماں مرحوم کی جائداد کی تقسیم میں لگ رہا تھا۔ بمشکل اب فیصلہ ہُوا ہے۔ قرضخواہوں کا بھی ادا ہو گیا ہے۔

لفٹنٹ۔ اُن کا گاؤں موضع شیخوپورہ بیداد جو تھا کیا وہ رہن رکھا گیا ہے؟؟

ذوالفقار جی ہاں! اس قدر روپیہ کہاں سے وصول ہو سکتا تھا؟ ہیں۔ جائداد کے انتظام کرنے والوں میں سے ایک دماغی بیماری سے پاگل۔ دوسرا مے نوشی سے دن رات پاگلوں سے بدتر تھا۔ اس صورت میں لوگوں نے ایک روپیہ کے حساب میں ۲۰ روپیہ وصول کئے۔ اندھیر مچا ہُوا

تھا۔ ایک برس میں سب حساب پاک ہوئے۔

لفٹنٹ۔ آپ کا کیا فیصلہ ہوا؟

ذوالفقار صاحب۔ کیا کہوں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا؟

لفٹنٹ۔ سمجھ کو کیا ہوگیا ہے؟

ذوالفقار صاحب۔ کچھ وارفتہ ہوگئی ہے۔

لفٹنٹ۔ بجائے اطمینان کے وارفتہ کیوں ہوگئے ہو؟

ذوالفقار صاحب۔ بھائی ابھی معاملہ کچھ اور مشکل میں ہے!

لفٹنٹ۔ کیسی مشکلات؟ ظاہرا صورت میں صرف مہر کا فیصلہ ہی تھا۔ کیا اس سے وہ لوگ مطمئن نہیں ہوئے؟

ذوالفقار صاحب۔ مطمئن تو ہوگئے ہیں۔ مگر اب ان کے والدین حج کو تیار ہیں۔

لفٹنٹ۔ تو تم بھی جاؤ۔ حاجی بنو! (اسپر دونوں نے قہقہہ لگایا)

لفٹنٹ۔ کیا آپ وہاں جایا کرتے ہیں؟

ذوالفقار صاحب۔ ہاں دوسرے تیسرے دن جایا کرتا ہوں۔

لفٹنٹ۔ تو بیگم صاحبہ کے خیالات تمہارے متعلق کیسے ہیں؟

ذوالفقار صاحب۔ دیکھتا ہوں کہ میرا ادب لحاظ جیسا کہ ابتدائی دستور تھا۔ اور جس طرح کنبے کی لڑکیاں اپنے بزرگوں کا ادب کیا کرتی ہیں۔ کرتی ہیں۔ خوش مزاج، شریف الطبع اور با اخلاق تو ہے ہی۔ مگر والدین کی بے حد تابعدار ہیں۔

لفٹنٹ - والدین کے خیالات آپ کے متعلق کیسے ہیں؟

ذوالفقار - بہت اچھے ہیں - دستور کے مطابق - انکی مہربانی نئی نہیں میں بھی ابتدا سے اُن کا ادب کرتا ہوں -

لفٹنٹ - تو پھر آپ کیوں اس امر کو ناممکن سمجھتے ہیں؟

ذوالفقار خان - ہے ہی مشکل - تم ہی کوئی طریقہ بتاؤ ؟

لفٹنٹ - میں نے تو یہ سمجھا تھا - کہ معاملہ طے ہوگیا ہے - بہتر تو یہ تھا - کہ میں - سر شفیع اور احمد حسن آپ کی طرف سے میاں غلام احمد صاحب کی خدمت میں عرض کریں - کہ وہ آپ کو فرزندی میں قبول کرلیں -

ذوالفقار صاحب - ابھی ٹھہریئے - اگر انہوں نے جواب دے دیا تو میری حالت ناگفتہ بہ ہوجائے گی -

لفٹنٹ - بھائی صاحب ! آپ اسقدر بیدل کیوں ہو رہے ہیں - واہ اتنی کمزوری - ایک بہادر باپ کے بیٹے اور خود بہادر ہو کر بھی اتنی کمزوری دکھا رہے ہو ؟

ذوالفقار صاحب اپنی بے بسی پر آب دیدہ ہو گئے -

لفٹنٹ - واہ سبحان اللہ ! آپ بھی کمال ہی کرتے ہیں -

ذوالفقار صاحب - واقعی مجھ میں یہ فطری کمزوری ہے - کیونکہ مجھے جو باتیں پسند ہیں - وہ سب اس میں ہیں - میرا دل جن چیزوں کا متلاشی تھا - وہ سب کی سب اس میں پا رہا ہوں -

لفٹنٹ - ایک بات کہوں ؟

ذوالفقار۔ ان کی طرف دیکھ کر۔ کہو!

لفٹنٹ۔ مسکراتے ہوئے۔ جس قدر آپ کی توجہ ہے اسکی اس سے آدھی بھی نہ ہوگی شاید۔

ذوالفقار خاں۔ ممکن ہے۔ مگر اب تو وہ لوگ حج کو جا رہے ہیں۔

لفٹنٹ۔ آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں۔ وہاں درخواست کے وقت آپ بھی اپنے حج کا پروگرام پیش کردیں۔

ذوالفقار خاں۔ نہیں نہیں۔ یوں ٹھیک نہیں

لفٹنٹ۔ کیا اگر ان کی خاطر حج کرلیا جائے تو بہتر نہیں ہوگا؟

ذوالفقار خاں۔ ہم جیسے گناہگاروں کو کیسے حج نصیب ہوسکتا ہے؟

لفٹنٹ۔ چلو دینی نہ سہی دنیاوی حج ہی ہوجائے گا۔

اس جملہ کے بعد اُنھوں نے گفتگو کا رخ بدل دیا۔ اور کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کرکے رخصت ہوگئے۔ شام سے پہلے پہل یہ مکمل مکالمہ مجھ تک حرف بحرف پہنچ گیا۔ دوسرے دن ذوالفقار خاں آصف جہاں کے پاس عرضِ حال کے ارادے سے گئے۔ اُن کو معلوم تھا۔ کہ آصف جہاں کو اس معاملہ میں دلچسپی ہے۔ اور وہ وزیر سلطان کی ہمدرد ہونے کے علاوہ رشتہ دار سہیلی بھی ہے۔ ذوالفقار صاحب نے آصف جہاں سے میرے متعلق ذکر کیا۔ تو اُنہوں نے کہا۔ کہ میں مفصل عرض کرتی ہوں۔

ذوالفقار خاں۔ بیشک۔ مفصل اور خوب تفصیل کے ساتھ۔

آصف جہاں۔ میں نے وزیر بہن سے کہا تھا۔ کہ میں جو کچھ بھی کہونگی سچے دل سے کہونگی۔ تمہیں یقین کرنا چاہیئے۔ جب وزیر نے کچھ جواب نہ دیا۔ تو پھر میں نے خود ہی سلسلہ گفتگو شروع کیا اور کہا۔ ذوالفقار صاحب کے خیالات تمہارے متعلق بہت بہترین ہیں۔ اس پر وزیر سلطان نے کہا۔ کہ میں نے انکو کب بُرا کہا ہے۔ میں نے کہا۔ بُرائی کی بابت خیال نہیں۔ البتہ اکثر عزیز و قرابت والوں میں تمہاری بہتری کی باتیں ہوتی ہیں تاہم تمہاری زندگی کے نشیب و فراز پر کوئی بھی اچھی طرح غور نہیں کرسکتا۔ مگر باغدا ذوالفقار خاں کو تمہارے ساتھ دلی محبت معلوم ہوتی ہے۔ اُس نے جواب دیا کہ اس میں کیا شک ہے۔ وہ ابتدا سے نہایت شفقت، ہمدردی اور محبت سے پیش آرہے ہیں۔ میں نے موقعہ پاکر کہدیا۔ کہ پھر ایسے انسان کے متعلق آپ کے خیالات کیسے ہیں؟ تو اُس نے کہا۔ بہت اچھے۔ میں نے کہا یعنی کس قسم کے؟۔ اُس نے کہا۔ جنکو میں ابتدا سے مہربان سمجھتی ہوں اُن کے خیالات میری نسبت کیوں بُرے ہونگے۔ میں نے کہا۔ تو پھر تمہیں ان کی خوشی کو مدِنظر رکھنا چاہیئے۔ اِس کلمہ پر اُس نے سر جھکا کر کہا۔ کہ اصل مقصد تو یہ ہے کہ میں اب کسی کو بھی خوش کرنے کے قابل نہیں ہوں۔ میں نے کہا۔ کہ وہ تو خوش ہی رہیں گے۔ مگر ان کو خوش کرنا صرف تمہارے اختیار میں ہے۔ یہ سنکر اُس نے کہا کہ سوائے اپنے ضعیف العمر والدین کے میں اسوقت کسی کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ میری طبیعت پر مُردگی چھاگئی ہے اس صورت میں دعا کرو۔ کہ میرے والدین کا سایہ عند اسلامت رکھے۔

اب میری زندگی کا بقایا حصہ والدین کی خدمت اور اُن کے زیر سائے گزر جائے۔
میں نے کہا۔ خدا تمہارے والدین کو بہت دیر تک سلامت رکھے۔ اور
با برکت رہیں۔

اُس نے کہا میرے والدین جس وقت مجھے صبر شکر کی حدیثیں سنایا
کرتے ہیں۔ اور اپنی بزرگ عورتوں کے حالات بتاتے ہیں۔ تو میری طبیعت
میں سکون پیدا ہو جاتا ہے۔ اُنہوں نے ایک بار کہا تھا۔ کہ ہماری ایک بزرگ
خاتون جس کے خاوند شادی کے ایک ہفتہ بعد اپنی ملازمت پر کسی ملک
میں چلے گئے تھے۔ اور جب وہاں سے ان کے لڑائی میں مارے جانے کی
خبر آئی۔ تو اُس بی بی نے اس طرح صبر شکر سے تمام عمر نبھا دی۔ کہ
اس مقدس خاتون کی یادگار اب تک قائم ہے لہذا اب میں اُن کی خاطر
ایسے طریق اختیار کر دوں جس سے میرے ضعیف العمر والدین کو شرمسار ہونے
کا موقعہ ملے۔ یہ کوئی عقلمندی نہیں۔ میں نے پھر کہا۔ بیشک یہ تمہاری
شرافت ہے۔ تم قابل تعریف ہو۔ اور جو کچھ تمہارے والدین کے خیالات
ہیں۔ وہ بھی صداقت سے پُر ہیں۔ مگر پیاری بہن وہ زمانہ کچھ اور تھا۔ اب
وہ زمانہ نہیں ہے۔ آئندہ تم خود مختار ہو۔

اُس نے کہا۔ میری طبیعت بے حد پریشان ہے۔ معافی کی خواستگار
ہوں۔ آپ کیوں اس قدر زور دیتی ہیں۔ اور یہ کہکر وہ خاموش ہو گئی۔
میں نے چند منٹ سکوت کے بعد پھر کہا۔ کیا تم مجھ سے ناراض ہو گئی
ہو۔ خدا ایسا وقت نہ لاتا۔ اُس نے سر کو جنبش دے کر کہا۔ خدا کے

لئے مجھے تنگ نہ کرو۔ میں تمہاری مشکور ہوں۔ مجھے ذوالفقار صاحب کی مہربانی و کرم فرمائی کا اندازہ ہے۔ بخوبی سمجھتی ہوں۔ اور یہ بھی یقین ہے کہ سچے دل سے ذوالفقار صاحب میری قدر کرتے ہیں۔ مگر میں اپنی طبیعت سے مجبور ہوں۔ اسوقت میرا دماغ بے حد پریشان ہے۔

میں نے کہا۔ جہاں تک ممکن تھا میں نے تمہیں نیک و بد سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ آئیندہ جو خدا کو منظور ہوگا ہو جائیگا۔ ذوالفقار خاں کو نہ تو تمہیں تمہارے والدین سے جدا کرنے کی تمنا تھی اور نہ تمہیں کسی قسم کی تکلیف دینے کی۔ کوئی بدگمانی نہ کرنا۔ خدا جانے اُنہیں تم سے کیوں اس قدر لگاؤ ہے۔

میری اس بات کا اس نے جواب نہ دیا۔ تو میں نے کہا۔ خدا کے لئے معاف کرنا۔ میری طرف سے رنجیدہ خاطر نہ ہو جانا۔ میں ہر طرح تمہاری ہمدرد ہوں۔ یہ سنکر کہنے لگیں۔ کہ سجادہ بیگم اور بچے کے جدا کرنے میں بھی تو ذوالفقار صاحب ہی شامل تھے۔

میں نے کہا۔ ذوالفقار خان پر الزام نہ دو۔ ان کے سامنے تو سب نے یہ تجویز پیش کی تھی۔ چنانچہ اُنہوں نے یہ جواب دیا تھا کہ وزیر بھی تو ابھی کم عمر ہے۔ اس کے متعلق بھی سوچنا چاہیئے۔ صرف اِس لفظ سے وہ گنہگار ہو گئے" بس اتنی ہی باتیں ہوئی تھیں۔ آصف جہاں نے یہ تمام داستان ذوالفقار خاں سے کہی۔ تو انہوں نے کہا۔ بہن آصف اس کمبخت کو سجادہ اور بچے کے جدا ہونے کا اتنا رنج ہے؟

آصف جہاں۔ بیشک بہت محسوس کرتی ہیں۔ اور اس وجہ سے وہ زیادہ شکستہ دل بھی ہو گئی ہیں۔ وزیر نے اس معاملہ میں بڑی جد وجہد کی تھی۔ مگر "تدبیر کند بندہ۔ تقدیر کند خندہ"۔ وزیر کو کیا خبر تھی۔ کہ سب کچھ خاک میں مل جائے گا۔

ذوالفقار خاں۔ اب تو والدین کے ساتھ حج کی تیاری کر رہی ہیں۔

آصف جہاں۔ بھائی جان صبر کیجئے ذرا حاجن بن لینے دیں۔

ذوالفقار خاں۔ حاجن بنکر زیادہ سخت ہو جائے گی۔ اس کلمہ پر آصف جہاں اور ذوالفقار صاحب ہنسے۔ اور ذوالفقار کہنے لگے میں جاتا ہوں ۔

دسواں باب

وطن میں والدین کیساتھ جانیکی تیاری

حسب معمول ذوالفقار خاں صاحب میرے غریب خانہ پر آتے رہا کرتے تھے۔ اور میں بھی حسب دستور اُن کی خاطر تواضع کرتی رہی۔ وہ ایک بے پرواہ ذرا خدل اور متواضع طبیعت کے انسان تھے۔ میری لاوارثی نے نہ جانے کیوں اُنہیں میری طرف مائل کردیا تھا۔ علاوہ ازیں اور بھی کئی لوگ میری نسبت منصوبے باندھتے تھے۔ مہر کا فیصلہ ہوجانے کے بعد جب میرے والدین نے واپس اپنے وطن جانے کا ارادہ کرلیا۔ تو میں نے خیال کیا۔ کہ وطن جانے سے پہلے ایک بار پھر قبر پر فاتحہ کہہ آؤں۔ لہذا

والدہ صاحبہ اور میں شیخو پورہ روانہ ہوگئیں۔ گاؤں کی عورتوں کا ہجوم میرے گرد جمع ہوگیا اور دیر تک روتی رہیں۔ میں نے قبر پر آخری بار فاتحہ پڑھی اور قبر کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ مجھ بدنصیب بدقسمت کے شوہر میاں اب قابلِ رحم ہوں۔ میری زندگی دوبھر ہو رہی ہے۔ ہر کوئی مجھ پر حملہ آور ہے۔ نہ میری وہ عزت ہے اور نہ توقیر۔ میری خوش بختی کا غطاب منحوس ہو چکا ہے۔ زندہ دلی اور سب دنیا کی چیزوں کا لطف آپ کے دم سے تھا۔ گو زندہ ہوں۔ تندرست و توانا ہوں۔ کھانے کو بھی میرے پاس موجود ہے۔ لباس بھی ہیں اچھے سے اچھا پہن سکتی ہوں۔ لوگ بھی میرے گرویدہ ہیں اور جوانی بھی برقرار ہے۔ مگر ایک آپ کی مہربانی نہیں تو بس سب خار ہیں۔ آہ افسوس! جو میری روح میں تازگی تھی وہ ختم ہو چکی ہے۔ اے میری کشتیٔ حیات کے ناخدا! اب میری کشتیٔ حیات طوفانِ دنیا کے تھپیڑے کھاتی پھرتی ہے ؎

نہ کوئی میرا مونس ہے نہ یاور ہے نہ محرم ہے
مگر ہر دم غمِ ہجراں تمہارا زخم مرہم ہے

ترانہ بلبلِ خاطر کا اب فریاد و شیون ہے
بشانِ سنبلِ ژولیدہ ہر دم دل کو الجھن ہے
میں اس وقت برگشتہ قسمت ہوں گویا ؎
کبابِ سیخ ہوں میں اور ہر پہلو سے جلتی ہوں جو جل اٹھتا ہے یہ پہلو تو وہ پہلو بدلتی ہوں

میرا دل گریہ وزاری سے نڈھال ہو رہا تھا۔ میں اُٹھی اور اس گھر کی طرف آئی جہاں چند برس حکومت اور عیش و عشرت میں گزارے تھے۔ اس اُجڑے گھر کی اُسی عمارت پر حسرت و یاس کی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں اصطبل کی دیواریں گر چکی تھیں۔ جگہ جگہ مٹی کے ڈھیر پڑے تھے۔ باغ کا گراؤنڈ جس میں سبز مخملی گھاس کا فرش رہا کرتا تھا۔ وہاں بگولے خاک اُڑا رہے تھے وہ بالاخانے جو دُور سے خوبصورت دکھائی دیتے تھے۔ اُن کی چھتوں میں ابابیل بسیرا کر رہے تھے۔ پھولوں کے پودوں کا نام و نشان باقی نہ تھا۔ ٹوٹے پھوٹے گملے ڈھیروں پڑے تھے۔ سنسان اور اداسی کا عالم تھا۔ لوگوں کی اشکبار آنکھیں، افسردہ چہرے دیکھ کر میرا دل بیٹھا جاتا تھا۔ چند گھنٹے وہاں گزارے۔ قبر پر پھر فاتحہ اور درود شریف پڑھکر بخشا۔ اور ہمیشہ کے لئے اشکباری و آہ وزاری کرتی ہوئی رخصت ہوئی مگر اس سرزمین کے اندر سونے والے نے کوئی آواز نہ دی ؎

جن پہ حسرت نوحہ گر اور بیکسی ہے اشکبار
خستہ حالانِ محبّت کے ہیں یہ ٹوٹے مزار
اِن غریبوں کا نہ مونس اور نہ کوئی غمگسار
کہہ رہے ہیں وہ زبانِ حال سے باحالِ زار
برمزارِ ما غریباں نے چراغ نے گُلے
نے پرِ پروانہ سوزد نے صدائے بُلبلے

میرے ضمیر نے آواز دی صبر کر۔ خدا کے خوف سے ڈر۔ کہ وہ قہار بھی ہے اور

جبّار بھی ہے - یہ گھر نہیں تھا - کارواں سرائے تھی لہٰذا دل پر صبر کا پتھر رکھ کر واپسی پر آمادہ ہوئی - میرے دل کی کیفیت خدا پر خوب روشن ہے - میں بالکل مایوس ہو رہی تھی - گذشتہ زمانہ آنکھوں کے سامنے پھر رہا تھا - مجھے یقین تھا کہ اب میں کبھی اس عزیز ترین ہستی کی قبر آسانی سے نہ دیکھ سکوں گی - کیونکہ میں اس سرزمین کو چھوڑ کر جا رہی تھی - گھر پہنچ کر ابھی میں اپنے اجڑنے اور برباد ہونے کا تصوّر کرتے ہوئے تڑپ رہی تھی - کہ والدہ صاحبہ نے کہا بیٹی! اپنا اسباب درست کر کے رکھو - مجھ میں تو ہمت نہیں میں نے وہ تمام اثاثہ اور اسباب ضروریات باندھ کر سٹیشن پر روانہ کر دیا -

اتنے میں ذوالفقار خاں صاحب بھی تشریف لے آئے - انہوں نے کہا - اگر کوئی فالتو اسباب یا کوئی اور زیادہ کام ہو - تو میرے ملازم حاضر ہو جائیں گے -

میں نے کہا - کہ آپ کی مہربانی ہے شیخوپورہ سے بھی چند آدمی میرے ساتھ آئے تھے - محض اسی کام کی خاطر وہ وطن تک ساتھ جائیں گے -

ذوالفقار صاحب میرے اس کلمہ پر بڑبڑاتی ہوئی آواز میں کچھ کہہ گئے جسے میں تو نہ سن سکی - البتہ نوشابہ میری ملازمہ نے سن لیا - کہنے لگے "شیخوپورہ کی ملکہ جو تھی کیوں نہ آتے وہاں کے لوگ؟ میں نے کہا

اگر تکلیف نہ ہو تو آپ اپنا ایک ملازم بھیج دیجئے مہربانی ہو گی۔

ذوالفقار صاحب۔ (اسی لہجہ میں) میری مہربانی کی کیا ضرورت ہے تمہاری مہربانی چاہیئے۔ پھر بڑی سنجیدگی سے کہا "خط ضرور لکھتے رہنا۔

میں نے کہا۔ بہت اچھا چلتے وقت کہنے لگے میں وقت مقررہ پر سٹیشن پر آجاؤنگا۔ ذوالفقار صاحب کی آنکھوں اور چہرے کے اُتار چڑھاؤ سے ان کی دلی کیفیت کا اظہار ہو رہا تھا۔ وہ بڑے ضبط سے کام لے رہے تھے۔ میرا چلے جانا اُنہیں صدمہ پہنچا رہا تھا۔ وہ کبھی غصے میں بد دعائیں دیتے اور کبھی کوسنے تھے کبھی اُن کا چہرا تمتما جاتا۔ کبھی خاموشی سے جذبات کو ضبط کرتے معلوم ہوتے تھے۔ میرے لئے یہ وقت قیامت خیز تھا۔ کہ جس شہر میں اس شان و شوکت سے قدم قدم پر خوشیاں مناتے آئی تھی۔ اب اسی شہر سے لاوارث ہو کر جا رہی ہوں۔

لاہور کے ریلوے سٹیشن پر پہنچ کر دل میں دھڑکن سی پیدا ہو رہی تھی۔ دل و دماغ میں ایک حشر برپا تھا۔ میری والدہ صاحبہ کی ایک پُرانی ملازمہ جس نے میری شادی کا وقت اور اس سٹیشن پر ہزاروں خوشیوں کے ساتھ استقبال ہونیکا وابتدائی زمانہ دیکھا تھا۔ اب اُجڑنے و برباد ہونے کا خستہ حال دیکھ کر زار و قطار رونے لگی۔ میری والدہ نے اُسے خاموشی کا اشارہ کیا۔ کہ لڑکی تو خود ہی بے قرار ہو رہی ہے۔ تمہیں دیکھ کر اور تڑپ جائیگی۔

ذوالفقار صاحب اور اُن کے ملازم سٹیشن پر اسباب کا انتظام کرتے اور ٹکٹ کرواتے ہوئے اِدھر اُدھر پھرتے دکھائی دیتے تھے۔ جونہی ریل آئی

ہم فوراً سوار ہو گئے۔ ذوالفقار صاحب نے میرے والدین کو مودبانہ سلام کر کے کہا۔ اپنی خیریت سے مطلع فرماتے رہیگا۔ والدہ صاحبہ نے شفقت سے رخصت دی۔ میں نے بھی سلام کیا۔ تو انہوں نے افسردگی سے سلام کا جواب دیا۔ اور آزردگی و بے بسی کے عالم میں کمرے سے باہر نکل کر قریب کی کھڑکی کے پاس کھڑے ہو گئے وہ حسرت و یاس سے ہمیں دیکھتے رہے ریل سیٹی دیکر آہستہ رفتار سے چلنے لگی۔ پھر میری طرف نمناک آنکھوں سے دیکھ کر فی امان اللہ کہا اور پیٹھ پھیر لی۔

چند گھنٹوں کا سفر طے کر کے ہیں والدین کیساتھ گھر میں آپہنچی۔ وطن پہنچتے ہی شہر کے مرد و عورتیں میاں قمرالزماں کے افسوس اور فاتحہ کو آنے لگے۔ جو کوئی سنتا۔ چلا آتا۔ اور میری حالت پر آنسو بہاتا۔ یہ سلسلہ کچھ عرصہ تک جاری رہا۔ آخر رفتہ رفتہ میرے دل کو بھی صبر آنے لگا۔ صبح سے شام تک والد صاحب کا لباس تبدیل کروانا۔ منہ ہاتھ دھلوانا۔ بستر صاف کرنا۔ چائے اور ناشتہ اُن کے حسب منشا تیار کرنا۔ غسل کا سامان خود والد صاحب کے لئے تیار رکھنا میرے روزانہ مشاغل میں داخل تھا۔ میری اس خدمت سے میرے والد صاحب بے حد خوش رہتے تھے اور مجھے ہزاروں دعائیں دے کر فرمایا کرتے۔ کہ بچی کا وہی زمانہ واپس آگیا۔ شادی سے پہلے بھی تم میری ایسی ہی خدمت کیا کرتی تھیں۔

آہ میری بچی آبادبھی ہو چکی اور برباد بھی ہوگئی۔ اس قلیل عرصہ میں سب کچھ ہو چکا۔ مگر والد صاحب کو دن رات حج کی دھن لگی ہوئی تھی۔ ہر چیز یکہ

شریف کے شوق میں خرید نے تھے۔ مطالعہ کے دلدادہ تھے۔ الحجاج کے سفرنامے پڑھنے کا بیحد شوق تھا۔ ان کا تمام وقت اکثر کتب بینی میں گزرتا تھا۔ مسافرت کے متعلق مجھے سمجھایا کرتے۔ کہ راستے میں ہم اس طریقہ سے سفر کریں گے۔ ایسے آرام سے سفر طے ہوگا۔ یہ کریں گے۔ وہ کریں گے۔ جو کوئی ملنے آتا۔ اس کو بھی اسی ذکر سے متاثر کرتے۔ شہر کے بہت سے لوگ ہمارے ساتھ جانے کو تیار ہو گئے۔ آخر رجب کے مہینے میں پختہ تیاری ہو گئی۔ سامان تیار تھا۔ چیزیں بند کر رکھی تھیں۔ والد صاحب ہر وقت اچھے اچھے خوش الحان نعت خوان بلا کر نعت رسولِ کریم سنتے رہتے اسکے اس شغل میں میرے بھی پریشان دلکو کچھ تسکین ہوتی تھی۔ مگر دل کی تہ میں جو غم سما چکا تھا۔ وہ تو کم ہونے والا نہ تھا۔ تاہم والد ماجد کی مہربانی اور شفقت میرے لئے سکون کا باعث تھی۔ اور ان کی خدمت سے مجھے اس قدر مسرت تھی۔ کہ ہم دونو باپ بیٹی ایک منٹ کی جدائی بھی برداشت نہ کر سکتے تھے۔ میری سہیلیاں اور تمام فیشن پرست خواتین مجھے چھوڑ چکی تھیں۔ اگر کوئی آبھی جاتی۔ تو میرے والد صاحب مجھے بار بار بلا لیا کرتے تھے والدہ صاحبہ کسی وقت ناراضگی سے فرمایا کرتیں۔ کہ کسی وقت لڑکی کو اپنی سہیلیوں کے پاس بھی بیٹھنے دیا کرو۔ ہر وقت باہر مردانے میں بلا لیتے ہو۔ یہ آخر لڑکی ہے۔ کوئی لڑکا نہیں۔ جو دن رات آپ کے ساتھ باہر رہا کرے؟

والد صاحب پریشان ہو کر کہہ دیتے۔ میں کیا کروں۔ اگر ذرہ بھر کیلئے

بھی میری آنکھوں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔ تو دل پریشان ہونے لگتا ہے۔ میرے لئے تو یہ بیٹا ہے۔ بیٹی نہیں۔ اور میرے پاس کیا ہے؟ اکثر میری والدہ صاحبہ کو ہدایت بھی کیا کرتے تھے۔ کہ اس بچی نے اس قدر حکومت اور امارت دیکھنے کے بعد بھی میری خدمت کو اپنا شعارِ زندگی سمجھا۔ اور سب کچھ چھوڑ کر کے میری شرم رکھی۔ میری بچی میرے سر آنکھوں پر بیٹھے تو میں ٹھاؤنگا دیکھو بچی کو خوش رکھا کرو۔ یہ ہماری عزت لئے بیٹھی ہے خدا اسے محفوظ رکھے۔ غرضیکہ مجھ پر والد صاحب قبلہ کی لا انتہا شفقت تھی۔ ہم رات دن ماہ رجب کا انتظار کرتے تھے بلکہ شہر کے بہت سے اور لوگ بھی ہمارے ساتھ گھڑیاں گنتے تھے۔ اکثر عورتیں آتی جاتی رہتیں۔ انہیں حج کی خوشی اسقدر تھی۔ جس کا اظہار ناممکن ہے۔ میں اکثر نعتیں خوش الحانی سے اپنے والد صاحب کو سنایا کرتی۔ مندرجہ ذیل نعت میرے والد صاحب کو بے حد پسند تھی۔

دکھا دے یا خدا کیسا مدینہ کا وہ گلشن ہے
گلِ باغ مدینہ کا جہاں پر نور مدفن ہے
مدینہ کی زمیں وہ ہمسرِ فردوس اعلیٰ ہے
کہ رشک افزائے جنت ہی وہاں ہر ایک کوچہ ہے
نہیں جاروب کش ہم بھی یہی دل کی تمنا ہے
زہے بخت رسا آنکھوں سے جس نے اسکو دیکھا ہے

میرے والد صاحب اس نعت پر بیخود ہو کر خفیف حرکت سے جھومنے

ایسا معلوم ہوتا کہ سچا عشقِ رسولؐ دل میں سمایا ہوا ہے۔ خدا خدا کر کے جب رجب کا چاند نظر آیا تو میں نے والد صاحب کو سلام کیا۔ سب نے خوشیاں منائیں۔ صبح ہوئی تو والد صاحب نے کہا۔ کہ سب کو بلا کر یہ فیصلہ کریں۔ کہ کراچی کے راستہ چلیں گے یا بمبئی سے؟ میں نے اپنے ہم سفر لوگوں کو دریافت کرنے کے لئے بلایا۔ روانگی کا دن ۲۰ ماہ رجب مقرر ہوا۔ خیال تھا۔ کہ رمضان شریف بھی وہاں گزارا جائے۔ والد صاحب ہر وقت یہ تاکید کیا کرتے تھے کہ مدینہ شریف میں ایک ایک پیسہ کی خیرات ہزاروں کی خیرات کے برابر ہے یہاں کوئی فضول اخراجات نہ کیا کرو۔ تاوقتیکہ ہم حج کا خرچ پورا کر لیں یا والد صاحب نے اپنی زمین فروخت کر کے ایک خاص رقم حج کیواسطے علیحدہ رکھی ہوئی تھی۔

مردانہ میں والد صاحب قبلہ کے پاس اُن کے معزز دوست سید صاحب سب سے زیادہ آکر بیٹھا کرتے تھے اور والد صاحب سے ہر وقت بیت اللہ کے متعلق ذکر کرتے رہتے ان لوگوں میں سے کئی لوگ ایسے تھے جو تمام کنبے کے لوگوں کو حج کروا چکے تھے۔ والد صاحب کو اُن سے حج کی بابت باتیں کرنے اور معلومات حاصل کرنے کا شوق تھا۔ کتاب الحجاج میں جو کچھ پڑھتے ان کو سناتے۔ غرضیکہ یہی ذکرِ خیر ہوتے رہتے تھے۔

ایک دن صبح ۱۱ بجے کے قریب والد صاحب کا ملازم دوڑتا ہوا آیا۔ کہ بی بی صاحبہ جلدی آؤ۔ میاں صاحب بُلاتے ہیں۔ میں ملازم کی آواز سے پریشان ہو کر باہر مردانے میں گئی۔ تو والد صاحب پلنگ پر سیدھے

لیٹے ہوئے تھے۔ اور مجھے اشارہ سے اپنے قریب بلایا۔ میں گھبرائی ہوئی حالت میں والد صاحب کی چھاتی پر منہ کے بل جھک گئی۔ والد صاحب نے فرمایا۔ بیٹی! میں اچھا خاصہ باہر سے اندر آیا۔ کمرے میں قدم رکھتے ہی ایسا معلوم ہوا۔ جیسے کسی چیز نے مجھے دھکا دیا۔ جس سے میں سر کے بل زمین پر گرا۔ دیر تک پڑا رہا۔ ملازم نے مجھے آکر اُٹھایا۔ تو میں نے کہا۔ وزیر کو جلدی بلاؤ۔ میرا دل بیٹھا جاتا ہے۔ والد صاحب کے چہرے پر کمزوری کے آثار نمودار تھے۔ میں حیرانی میں تھی اتنے میں والدہ صاحبہ باہر سے تشریف لے آئیں۔ والد صاحب کی طرف دیکھ کر اُن کا دل بھی گھبرا گیا۔ مگر اُن میں افغانی خون تھا۔ طبیعت پر جبر کرنے کی طاقت تھی۔ لہذا مجھے فرمانے لگیں اپنے والد صاحب کو اندر لے چلو۔ یہاں ٹھیک نہیں۔ بار بار مردانہ میں ہم کیسے آئیں گی؟

میں نے والد صاحب کو صندل کا شربت پلایا۔ جب ذرا طبیعت مطمئن ہو گئی۔ تو میں نے والد صاحب کو سہارا دے کر اندر لے جا کر پلنگ پر لٹا دیا۔ اسوقت والد صاحب کو خفیف سا بخار بھی ہو گیا۔ میں نے والدہ صاحبہ کو مشورہ دیا۔ کہ ڈاکٹر کو بلا کر والد صاحب کو دکھانا چاہیئے۔ ملازم فوراً ایک ڈاکٹر کو بلا لایا۔ ڈاکٹر صاحب نے بغور معائنہ کیا۔

والدہ صاحبہ نے ڈاکٹر سے پوچھا کہ یہ کیا مرض ہے۔ مگر ڈاکٹر صاحب خاموشی سے والد صاحب کی چھاتی کا معائنہ کرتے رہے۔ اور ہاتھ سے اشارہ کیا۔ کہ ٹھہر جائیے۔ تھوڑی دیر کے بعد ڈاکٹر صاحب نے کہا۔

میاں صاحب کی عمر تو بہت بڑی نہیں۔ مگر کمزور بے حد ہو رہے ہیں۔
کل میں نے ایک اسّی برس کے بوڑھے کو دیکھا۔ وہ اِن سے بہتر اور توانا
تھا۔ میاں صاحب تو بے حد کمزور ہو رہے ہیں۔

والدہ صاحبہ۔ بیٹا ان کو بچی کی مصیبت نے حیران کر رکھا ہے۔
والدہ صاحبہ اور ڈاکٹر صاحب کی آپس میں اس قسم کی باتیں ہوتی رہیں۔ کیونکہ ڈاکٹر
حالات سے واقف اور پھر ہموطن تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے نسخہ لکھدیا اور
کہا کھانے کا پرہیز کچھ نہیں۔ جو جی چاہے کھائیں۔ میں شام کو آکر پھر
دیکھونگا۔

والدہ صاحبہ۔ ضرور آئے گا؟

ڈاکٹر صاحب چلے گئے۔ میں والد صاحب کی خدمت میں پھر مصروف
ہو گئی۔ ساگو دانہ تیار کیا۔ جو آش تیار کر کے رکھا۔ پھلوں کا پانی کچھ تھوڑا
سا پلایا۔ میرے والد صاحب کی عمر ستّر برس سے کچھ کم تھی۔ مگر ان کو
کبھی کوئی ایسی سخت بیماری نہیں آئی تھی۔ انہوں کے ضرور عادی تھے۔ اور
نزلہ کی اکثر شکایت رہا کرتی تھی۔ ویسے تندرست تھے۔ غذا باقاعدہ تھی۔
مگر نہایت نفیس غذا کے پابند تھے۔ ہم دونوں ماں بیٹی حیران تھیں۔ کہ
یکایک کیا تکلیف ہو گئی ہے؟ جو اس قدر کمزوری محسوس کرتے ہیں۔
میں بار بار کبھی پاؤں دباتی۔ کبھی سر کو ہاتھوں میں لیتی۔ اور دل ہی دل میں
دعائیں مانگ رہی تھی۔ کہ یا الہٰی میرے والد صاحب کو بہت دیر تک میرے
سر پر سلامت رکھنا۔ میں نے خیرات کے طور پر کچھ روپیہ اپنے والد صاحب

کے سر پر سے قربان کر کے محتاجوں کو دئے۔ والد صاحب کو بخار زیادہ ہوتا گیا اور تیسرے پہر ۴ بجے کے قریب تو جسم بالکل ٹھنڈا اور کمزور ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب آئے اور حالت دیکھ کر خاموش ہو گئے۔

میں دروازے کی آڑ سے ٹکٹکی لگائے دیکھتی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے ایک پرچہ لکھ کر ملازم کو دیا۔ کہ میرے دواخانہ سے جا کر یہ چیز لے آؤ۔ چنانچہ ملازم ایک بکس لایا۔ جس میں بجلی تھی۔ وہ والد صاحب کے سب اعضاؤں پر لگائی گئی۔ اِس تدبیر سے والد صاحب کچھ ہوش میں آ گئے اور ڈاکٹر صاحب چلتے وقت والدہ صاحبہ کے بلانے پر دروازے کے قریب رک گئے۔ تو والدہ صاحبہ نے پوچھا۔ کہ میاں صاحب کی کیا کیفیت ہے؟ ڈاکٹر صاحب نے کہا۔ بیگم صاحبہ آپ اں بیٹیاں دونوں تنہائی اور بیکسی میں ان کے دم کے سہارے وقت گزار رہی تھیں۔ اس لئے میرا آپ کو آگاہ کر دینا بہتر ہوگا۔ آپ حوصلہ کیجئے۔ میاں صاحب کا جگر بالکل سکڑ کر بے حس ہو چکا ہے۔ ایک دن یا ایک رات بمشکل زندہ رہ سکتے ہیں۔

والدہ صاحبہ میں کمال کا حوصلہ تھا۔ میں تو اس کلمہ کو سنتے ہی زمین پر گر پڑی۔ والدہ صاحبہ نے مجھ کو سنبھالا اور کہا۔ بیٹی! خیال تو کرو۔ کہ وہ جب تمکو بیٹا تصوّر کرتے ہیں۔ تو اب بیٹا ہی بنکر دکھاؤ۔ ابھی تو تجہیز و تکفین تمہارے سر پر ہے۔ ہوش کرو۔ اپنے والد کے پاس بیٹھو۔ خدمت کو غنیمت سمجھو۔ والدہ صاحبہ نے آنکھوں میں آنسو

پھیر کر کہا - اب یہ بھی تمہارا ساتھ چھوڑ رہے ہیں - یہ سنکر انہوں نے مُنہ دوسری طرف پھیر لیا - کیونکہ وہ آب دیدہ ہو رہی تھیں - میں والدصاحب کے پاس آکر بیٹھ گئی - کبھی ان کے خوبصورت ہاتھ دبائی - کبھی نرم ریشم کی طرح لمبی لمبی انگلیاں اپنی آنکھوں سے لگائی - والدصاحب نے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے میرے سر کو چھاتی سے لگالیا - اور حسرت بھری نگاہوں سے دیکھنے لگے - ملازمین چاروں طرف مغموم بیٹھے تھے - مگر ہم دونو ماں بیٹیاں بیقراری کے ساتھ اپنی بیکسی پر آنسو بہارہی تھیں - والدصاحب کو ڈاکٹر نے پھر کچھ طاقت کی دوائی پلادی - ہمیں دوائی پلانے میں تکلیف سمجھتی تھی - ڈاکٹر صاحب نے کہا - بی بی کمزوری میں بات نہیں کر سکتے - شاید تم سے کوئی بات کرنے کی ضرورت محسوس ہو تو بات کر سکیں - اس دوائی کا واقعی اثر ہُوا - والدصاحب نے میری طرف دیکھا اور اُن کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے - کانپتا ہُوا ہاتھ میری طرف بڑھایا میرے سر کو اپنی چھاتی کے قریب کرکے کہا - بیٹی تمہارا خدا حافظ و ناصر - والدہ صاحبہ نے مجھے اشارہ کیا - کہ خبردار مت رونا - اب کلمہ شریف کا ذکر شروع کرو - میں چاہتی تھی - کہ کلمہ پڑھوں مگر ضبطِ گریہ سے میری آواز بند تھی - والد صاحب کے ساتھ لگی ہوئی بار بار ان کے چہرے کی طرف دیکھ رہی تھی - والدصاحب نے خود ہی مجھے کہا - کہ بیٹیا ! اب کچھ سناؤ - میں نے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں سورۃ یٰسین سنائی اور والدصاحب نے کلمہ شہادت پڑھا - پھر میری طرف متوجہ ہوکر کہا " سواری آگئی ہے

دروازہ کھول دو۔ میرے بھائی باہر کھڑے ہیں۔ میں نے تعجب سے پوچھا۔ ابا جان کونسی سواری ہے؟

والد صاحب نے فرمایا اونٹ ہیں!

والدہ صاحبہ کی آنکھوں سے اس وقت آنسوؤں کا تار بندھ گیا۔ یہ دیکھ کر میں لرز گئی۔ معلوم ہوا حج کا سچا عشق تھا۔ رات جوں توں کر کے بسر ہوئی۔

صبح کے پانچ بجے جب والد صاحب کی روح عالم بالا کی تیاریاں کر رہی تھی۔ میں نے آبِ زمزم اور شہد کا ایک چمچہ منہ میں ڈالا۔ لمحہ بہ لمحہ حسرتناک صبح ہو رہی تھی۔ آسمان پر ستارے ڈوبے جا رہے تھے۔ آخر چاند کی روشنی بھی پھیکی پڑنے لگی۔

والد صاحب کی ایک آنکھ بند ہو گئی تھی اور دوسری سے آنسوؤں کا تار جاری تھا۔ کچھ کہنے کی کوشش کرتے۔ مگر الفاظ ٹوٹ پھوٹ کر رہ جاتے چاروں طرف اداسی چھا رہی تھی۔ تمام عالم پر سناٹا طاری تھا میرے دل کی دنیا اندھیر ہوئی جاتی تھی۔ آخر والد صاحب نے ایک ہچکی لی۔ اور چہرے پر سرسوں کے پھولوں کی سی زردی چھا گئی ایک آہ کے ساتھ دم رخصت ہو گیا۔ اِنّا لِلّٰہِ و اِنّا الیہ راجعون ط

میری تلخ زندگی کا یہ سہارا بھی میرے بختِ سیاہ نے مجھ سے علیحدہ کر دیا۔ ناظرین خود ہی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ کہ یہ کتنی قیامت تھی۔ میں نے سمجھا تھا۔ کہ والد صاحب کے زیرِ سائے میری کٹھن زندگی

سکون سے گزر جائے گی۔ میرا اضطراب گھٹ جائے گا۔ مگر والد کی موت پر میری عجیب حالت تھی۔ ناز اُٹھانے والے ابّاجی مجھ کو اس ڈانواں ڈول زندگی میں پوری طرح لاوارث کر گئے۔ مجھے کچھ بھی اطمینان نہ دلایا۔ میرے والد صاحب بزرگوار دن رات دلاسا دیتے ہوئے میری دل بستگی کے سامان سوچتے رہا کرتے تھے۔ کہ کسی طریقہ سے میں مطمئن ہو جاؤں مگراب میری ناز برداریاں کون کریگا؟ میری یہ کیفیت تھی۔ کہ میں والد صاحب کی میّت کو دیکھنے کی تاب بھی نہ لاسکتی تھی۔ زمین پر ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہی تھی۔ دل مجروح تھا۔ اور جگر پارا پارا۔ بیقراری کی انتہا میں تسکین کی کوئی صورت نہ رہی۔

میری چچی مجھے بار بار گود میں لیتیں۔ والدہ صاحبہ کو تسلی دیتیں۔ مگر یہ وقت ایسا نازک اور پُر درد تھا۔ کہ پناہ بر خدا۔ اگرچہ دنیا کے حادثات بے اندازہ ہیں۔ مگر میری ذات کے لئے یہ کافی مصیبت تھی۔ اس کے متعلق جو کچھ بھی بیان ہو کم ہے۔ شہر میں خبر ہوگئی۔ اُس دن ماہ رجب کی ۱۴ تاریخ تھی۔

جنازے میں شامل ہونے، میّت کو سنبھالنے اور غسل کا انتظام کرنے والا نہ کوئی چچازاد نہ کوئی ماموں زاد نہ کوئی خالہ زاد ہی تھا۔ میرے دم کے سوا ہر دو چچا صاحب بھی وطن میں موجود نہ تھے۔ بس چاروں طرف غیر ہی لوگ تھے۔ میرے والد صاحب کے بہت سے دوست شیخ اور سیّد صاحبان دروازے پر آکر کہنے لگے۔ بیٹی! ہم تمہارے تابعدار ہیں تم

ہرگز متفکر نہ ہونا - ہم سب انتظام کریں گے - میاں صاحب بھی بہت سے کام ہمارے سپرد کیا کرتے تھے - اپنی شادی کا وقت یاد کرو جب بھی ہم لوگ تمہاری شادی کے اہتمام میں منتظم تھے - ہم تمہارے خیر خواہ ہیں - تم ہمارے مہربان دوست کی بیٹی ہو - یعنی ہماری اپنی بچی -

میں نے اِن ہموطن بزرگ اور معززین کا شکریہ ادا کیا - اور اپنے بیکس ابّا جان کی میّت کو غسل دلانے کے واسطے ان کے سپرد کر دیا - معزز مہربان باہر لے گئے - اور مجھ سے جدا کر کے تختِ غسل پر والد صاحب کو غسل دینے لگے -

میں نے اکثر والد صاحب کی زندگی میں سنا تھا - کہ جب کبھی موت کا ذکر آتا - تو کہتے - کہ اگر میں وطن میں انتقال کر دں - تو مجھے میری چھوٹی لڑکی طاہرہ سلطان کے پاس دفن کرنا - چنانچہ میں نے خود قبرستان جانے کا ارادہ کیا - ابھی میں نے باہر قدم رکھا ہی تھا - کہ بہت سے معززین میرے والد صاحب کے دوست جو صفِ ماتم پر مردانے صحن میں بیٹھے تھے - انہوں نے مجھے روک دیا - کہ ہم سے کہو - ہم خود جائیں گے - میں نے عذر پیش کیا - کہ ممکن ہے جگہ کی غلطی ہو جائے لہذا میں قبر کی جگہ تبلانے خود ہی جاؤنگی -

اس پر میرے ساتھ چند معززین گئے - اور قبر کی جگہ بتلا کر میں واپس گھر آگئی - لوگ ابا جان کو غسل دے چکے تھے - کفن پہنایا جانا تھا - میت تیار کر کے جب میرے پاس لائے تو میں نے جو دل میں آیا - آخری بار

جی کھول کر بیان کیا اور گریہ وزاری کی۔ بہت سی عورتیں میرے چاروں طرف کھڑی تھیں۔ مگر یہ سب غیر تھیں۔ میں ان کی ہمدردی کی بہت شکر گذار ہوئی۔ والد صاحب کا جنازہ سینکڑوں کی تعداد میں شہر کے معززین نے اُٹھایا۔ وطن کی بے شمار عورتیں۔ ہم ماں بیٹیوں کے پاس بیٹھی تھیں

میرے سسرال والوں کو بھی موت کی خبر بذریعہ تار دی گئی تھی۔ وہ سب لوگ یکے بعد دیگرے افسوس کو آنے لگے۔ مجھ بدنصیب اور بیکس کے گھر میں چند دن تک والد صاحب کی موت کا ہنگامہ محشر بپا رہا۔ اپنے بیگانے سب میرے حال پر کفِ افسوس ملتے تھے۔ صدمہ پر صدمہ پہنچ کر میری طبیعت میں ایک دیوانگی سی پیدا ہو گئی۔ کہ اب مجھے دنیا میں کوئی ہمدرد دکھائی نہ دیتا تھا۔ میں اپنے دل میں کئی قسم کی باتیں سوچا کرتی تھی۔ کبھی میں قبرستان میں جاتی اور کبھی گھر سے باہر نکل جاتی۔ اگر میں تعلیم یافتہ ہوتی۔ تو تعلیم میری طبیعت کی برگشتگی اور تنہائی کا سہارا ہوتی۔ میرا دماغ عقلِ سلیم سے کام لیتا۔ میرے دل کو کسی طرف سے ذرہ بھر حوصلہ نہ تھا۔ میں زمانے کی اُلجھنوں اور بے رُخی پر گھبرا جاتی اور مستقبل کی تاریکیوں کو دیکھتی۔ غرضیکہ کہ ایک خلش تھی۔ درد تھا۔ غم تھا۔ پریشانی اور جان لیوا آفت۔ تاہم ان دنوں مجھے اس قسم کے اشعار سے تسکین ہوتی تھی ؎

مہمان میرے گھر میں ہیں رنج و غم صبح شام
آرام کی امید مجھے ہے خیالِ خام
مانندِ موجِ بحر پریشاں ہوئی ہوں میں

بس مبتلائے حسرت و ارماں ہوئی ہوں میں
گرداب بحرِ زخمِ جگر کی مثال ہے
موجوں کا اضطراب میرے دلکا حال ہے

اس مصیبت میں میرا وقت انتہائی بیقراری میں گزرتا رہا۔ میرے چچا صاحب قبلہ میاں فیض محمد صاحب (یہ اُن کا اصلی نام ہے) جو کچھ عرصہ سے والیئے ریاست پونچھ مہاراجہ بلدیو سنگھ صاحب (جو میرے سسرال والوں کے قدیمی مہربان تھے) اُن کے پاس ملازم تھے۔ چچا صاحب قبلہ کو میرے تمام ددہال میں صرف مجھ سے دِلی اُنس تھا۔ اگرچہ میرے والدین سے ان کی کشیدگی تھی۔ مگر اس کے باوجود وہ ہمیشہ آیا کرتے تھے میرے والد صاحب کی خبرِ انتقال سے چچا صاحب قبلہ کو از حد رنج ہوا۔ خاصکر اس وجہ سے کہ والد صاحب کی موت ان کی عدم موجودگی میں واقع ہوئی تھی۔ چچا صاحب نے مجھے نہایت محبت سے خط لکھا۔ اور ان کے شفقت بھرے الفاظ سے میری خاطر خواہ تسلی و تشفی ہوگئی کیونکہ اب مجھے بھی چچا صاحب کی مہربانی کا ہی سہارا تھا۔

ایک دن ان کا تار آیا۔ کہ میں بیمار ہوں۔ اور مہاراجہ صاحب سے رخصت لیکر براستہ جہلم ریاست پونچھ سے آرہا ہوں۔ میری چچی صاحبہ تار لے کر آئیں۔ چچا صاحب قبلہ تار کے چار یوم بعد وطن میں تشریف لے آئے۔ انہوں نے آتے ہی مجھے چھاتی سے لگایا۔ اور دیر تک روتے رہے مگر افسوس صد افسوس! میرے چچا صاحب بھی صرف چند یوم کے مہمان

نظر آنے تھے۔ سول سرجن شمشیر سنگھ صاحب خلف الرشید راجہ ہرنام سنگھ کپورتھلہ بہ ہسپتال ہم پر مہربان تھیں۔ سرجن شمشیر سنگھ صاحب نے معائنہ کر کے کہا "کہ گردن میں شانوں کے اوپر "کاربنکل" نکلا ہے۔ جس کا زہر تمام جسم میں سرایت کر چکا ہے۔"

ہم سب اس خبر کو سنکر پریشان ہو گئے۔ چچا صاحب قبلہ کی زبان زہریلے اثر سے پھٹ کر زخمی سی ہو گئی تھی۔ مگر وہ میرے ساتھ ویسے ہی مشفقانہ لہجے میں میٹھی میٹھی باتیں کرتے اور ہر جُملے کے بعد مجھے پانی پلانے کی فرمائش کرتے تھے۔ ان کا بار بار کہنا "بیٹی پانی پلا دو" کبھی نہیں بھولتا۔ تمام جسم میں آگ لگی ہوئی تھی۔ دوائی پلانے وقت بہت عاجزی سے دست بستہ ہو کر کہتے "بیٹی تم بھی میرے ساتھ ظلم کرتی ہو مجھے پانی پلا دو۔ دوائیاں پی پی کر مجھے آگ لگ گئی ہے۔ میں اب چند گھڑیوں کا تمہارے پاس مہمان ہوں۔ میرے پاس بیٹھی رہو۔" دو دن تنہا میں چچا صاحب کے پاس بیٹھی رہی۔ دوسرے دن میرے چھوٹے چچا صاحب کا لڑکا میاں الطاف محمد بھی میرے ساتھ تیمارداری میں شریک ہو گیا۔ پھر ہم دونوں تمام رات بیٹھے رہے۔ چچا صاحب کے دوسرے بیٹے میاں سلطان محمد بھی تشریف لے آئے بھائی سلطان محمد صاحب اپنی ملازمت کی وجہ سے جہاں جہاں ان کی تبدیلیاں ہوا کرتیں۔ وہاں رہا کرتے انہیں چچا صاحب کے پاس زیادہ رہنے کا اتفاق نہ ہوتا تھا۔ چنانچہ عرصہ کے بعد باپ بیٹے کی آخری وقت پر ملاقات ہوئی۔ وہ ایک درد انگیز نظارہ تھا۔ بھائی صاحب سلطان محمد چچا صاحب

کو اس حالت میں دیکھ کر اس قدر روئے کہ دونوں آنکھوں سے آنسوؤں کی نہریں جاری ہوگئیں۔ ادھر چچا صاحب دم توڑ رہے تھے۔ نزع کی تکلیف شروع تھی۔ دیکھتے دیکھتے چند گھنٹوں میں میرے چچا صاحب نے بھی مجھے اپنی بزرگانہ شفقت سے محروم کر دیا۔ مجھ ناشاد و نامراد.... کو چچا صاحب قبلہ کی صورت دیکھ کر والد صاحب مرحوم مغفور کی جدائی کا صدمہ قدرے کم ہونے لگا تھا مگر میری بدبختی اور شومئے قسمت سے یہ حوصلہ بھی جاتا رہا۔ میں چچا صاحب قبلہ کی صورت دیکھ کر تڑپ رہی تھی۔ چچا جان کی وفات سے میرے زخم چھل گئے اور والد صاحب قبلہ کی یاد پھر تازہ ہوگئی۔ میں چچا صاحب قبلہ کے پاس بیٹھی زار و قطار رو رہی تھی۔ شیش محل میں چاروں طرف اداسی چھا گئی۔ در و دیوار سنسان و پریشان دکھائی دینے لگے۔ چچا صاحب قبلہ کو غسل دے کر جنازہ تیار کیا۔ پھر شہر کے معززین چچا صاحب کو قبرستان کی طرف لے گئے۔

اس جانکاہ صدمہ سے میرا دل بیٹھا جاتا تھا۔ میں نے شیش محل کی کھڑکیاں کھول دیں۔ اور جدھر چچا صاحب قبلہ کا جنازہ گیا تھا۔ دیر تک اس طرف دیکھتی ہوئی۔ اپنی بدنصیبی پر خوب جی بھر کر روئی۔ کہ دادا صاحب کے خاندان میں سب سے زیادہ شفقت کرنے والے میرے بزرگوار چچا بھی میرا ساتھ چھوڑ گئے۔ کیا میرے پروردگار کو یہی منظور تھا؟ کہ میرے دل کو سہارا دینے والا دنیا میں کوئی نہ رہے؟ والد صاحب کے

انتقال کو ابھی ڈیڑھ ہی برس کا عرصہ ہوا تھا۔ کہ چچا صاحب کی موت واقع ہوگئی
والد صاحب قبلہ کا صدمہ ابھی کم نہ ہوا تھا۔ کہ دل کے زخم تازہ کرنے کا اور
سامان پیدا ہو گیا ؎

اٹھ گئی ہیں سامنے سے کیسی کیسی صورتیں!
روئیں کس کس مہرباں کو کس کا ہم ماتم کریں!

میری والدہ اور چچی صاحبہ مجھ کو ہمیشہ دلاسے دیا کرتی تھیں۔ مگر
میرا دل کچھ اس قدر بیزار رہنے لگا تھا۔ کہ مجھے کسی چیز میں دلچسپی ہی باقی
نہ رہی۔ کیونکہ دلِ خانہ خراب پر ایسے ایسے چرکے لگ رہے تھے۔ جن کا
وہم و گمان بھی نہ تھا۔ مگر میں خدا کے خوف سے اکثر لرز جاتی اور دعا
کرتی تھی۔ کہ الہٰی تو رحم کر۔ اور مجھے صبر کی طاقت دے۔ اے الرحم الرحمین
تو مالک ہے۔ جو چاہے کرے۔ مجھے دم مارنے کی مجال کہاں؟ ۔ تو
قہار ہے، جبار ہے رحیم ہے کریم ہے۔ تو جو کچھ بھی کرے تیرے شایان
شان ہے۔ جس حال میں رکھے تیری مہربانی ہے تیری رضا کے سامنے
سر تسلیم خم کرتی ہوں۔ میرے روز و شب اسی کا وش میں بسر ہوتے رہے
کچھ عرصہ کے بعد ہم نے یہ خبر بھی سُن لی۔ کہ سجادہ بیگم کا فرخ سیر سے نکاح
ہو گیا ہے۔ اور وہ دونوں خوش آباد ہیں۔ اس خبر سے گو مجھے کوئی خوشی
نہ تھی۔ مگر میرے سب عزیز خوش تھے لہذا مجھے بھی خاموشی اختیار کرنی
پڑی۔ چونکہ سجادہ بیگم میرے ہر رنج و مصیبت میں میرا ساتھ دیا کرتی
تھی۔ اس لئے مجھے اس کی ذات سے کوئی رنج نہ تھا۔ لہذا کبھی کبھی میں

بھی اُس کے پاس چلی جاتی تھی مگر دل ہمیشہ اداس رہتا۔ کیونکہ میری دنیا بدل گئی تھی۔ کسی کا کوئی لختِ جگر۔ کسی کا کوئی نورِ نظر۔ مگر میرا یہ عالم تھا۔ کہ

"نہ ہم کسی کے نہ کوئی ہمارا!"

۱۹۱۵ء میں جنگِ عظیم کی وجہ سے تمام کاروبار خطرہ میں تھے۔ لہذا اندیشہ تھا۔ کہ بنک دیوالیے نہ ہو جائیں۔ اس خیال سے میرے مہربان بھائی ذوالفقار صاحب نے ساری رقم نکلوا کر مجھے بھیجدی۔ بھائی سردار خاں لاکر میرے سپرد کر گئے۔ "کہ تم خود اس کی حفاظت کرو۔ یہ تمہارا مال ہے شاید کمپنیاں اور بنک اس جنگِ عظیم میں محفوظ نہ رہ سکیں۔ مگر تمہارا گذران تو اسی رقم پر ہے" اب میرے لئے روپیہ پاس رکھ کر اس کی حفاظت کرنا ایک مصیبت ہو گئی۔ یہ بھی شومئی قسمت تھی۔ کہ جب میں نے روپیہ بینک میں دکھا۔ تو بنیک بھی خطرے میں پڑ گئے۔ آہ! اپنی طرف سے تو میں بہتری کی تدبیر کرتی رہی۔ مگر حالات کی بدبختی میری کب پیش جانے دیتی تھی۔

ستم دیدہ ہوں ویرانہ کی ہیں خاک پریشاں ہوں
سراپا درد ہوں اک ہستیٔ محرومِ درماں ہوں

اے ذوالجلال! کیا میری زیست کا حشر اسی طریقہ پر منظور تھا۔ آہ میں کن کن مصیبتوں کا ازالہ کروں۔ یا خدا تو رحم کر۔ میرے دل کو صبر وتسکین دے۔ کاش میں تعلیم یافتہ ہوتی۔ کاش کہ میں دینیات کی عالم ہوتی۔ تو مجھے بھی علم ہوتا۔ کہ میرا پیدا کرنے والا کس کام پہ خوش

ہوتا ہے۔ تاکہ وہی کام کرتی۔ کاش کہ میری دنیا وی تعلیم کی تکمیل ہوتی تو کسی سکول میں ملازمت کر لیتی۔ لڑکیوں کو پڑھایا کرتی۔ اس طرح میری طبیعت دوسری طرف مائل ہوکر میرے غم میں کچھ فرق آجاتا۔ چرخ ستمگا نے ایسی آفتیں اور اذیتیں دیں۔ کہ چاروں طرف بیابان نظر آتا ہے۔ ہائے میرا دل اس لئے بنا تھا۔ کہ خدا اسے بگاڑے۔

حال زار دل ناشاد دکھاؤں کسکو

ماجرائے رنج و الم اپنا سناؤں کسکو!

آہ سب عزیزوں نے رُخ پھیر لئے۔ جو کچھ بھی تھا۔ میری شگفتگی سے تھا۔ اب نہ کوئی بہن نہ سہیلی نہ کوئی ہمدرد نہ غمخوار۔ یہ سب کچھ دنیاوی تفریح کے لوازمات تھے۔ سب مجھ سے کوسوں دور بھاگ گئے۔ میرا دل و دماغ غم کے سمندر میں غرق ہو گیا۔ میں پہروں سوچتی رہتی معلوم ہوتا تھا کہ دنیا کی سب پیاری چیزیں دھوکا ہیں۔ ایک دلچسپ فریب ہے۔ وہ کیا تھا اور یہ کیا ہوگیا۔ پھر اپنے مسرت کے زمانہ کو یاد کرتی تو یہی معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ ایک دلکش خواب تھا۔ دل میں سوچتی۔ کہ کیا دلکش خوابوں کی یہی تعبیر ہوا کرتی ہے؟ کیا میں ہمیشہ کے لئے ایسی ہی غمزدہ رہوں گی؟ میرے دل کی دھجیاں اُڑتی جاتی ہیں۔ میرا جگر پارا پارا ہو رہا ہے۔ اے خدا شکر ہے تیرا۔ وہ مسرت چند دن کی چاندنی بنکر آئی تھی۔ مگر اب اندھیری رات ہے۔ میری زندگی بیکار اور میں دنیا کا کوئی کام کرنے کے قابل نہیں ہوں۔ صرف ایک ہی چیز شاید اس شب تاریک میں مجھے روشنی کیطرف

لے جاتی۔ مگر میں اس سے محروم ہوں۔ ہائے جہالت کی زندگی کس قدر برباد کن ہے۔ کاش کہ میں تعلیم یافتہ ہوتی ؎

کیا شبِ تاریک میں رنگ سحر پیدا کروں
بے خبر ہوں کس طرح اپنی خبر پیدا کروں

خاندانی پابندیوں میں آواز کو بھی پردہ تھا تحریر کو بھی پردہ۔ کہیں جانے آنے کی سخت پابندی۔ نہ گھر میں کوئی آتا۔ نہ میں کسی کے جاتی ؎

زندگی بے کار دنیا کی تمنائیں فضول
اس سیاہ خانہ میں کیا دیوار و در پیدا کروں

سوائے اپنے رنج راحت کو یاد کرنے اور کھانے پہننے کے اور کوئی کام نہ تھا۔ رہ رہ کر گذشتہ زمانہ کی یاد دل میں تازہ ہوتی تھی۔ ان خوشگوار مناظر کے تصور میں میری زندگی کا ہر لمحہ بیت رہا تھا۔ کوئی ایسی سوسائٹی نہ تھی جس سے کوئی سبق حاصل ہوتا۔ دقیانوسی خیالات کی عورتیں جتنی باتیں کرتیں۔ رنج میں غرق کرنے والی۔ غرضیکہ دن رات بیکاری اور خاموشی تھی۔ گویا ؎ "خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا"

جس وقت دل زیادہ گھبرا جاتا۔ تو والد صاحب قبلہ کی قبر پر چلی جاتی۔ وہاں جانے سے مجھے کوئی نہ روکتا تھا۔ یہ میری تفریح تھی۔ اور یہی میری سیر۔ میرے سسرال والے اگرچہ میری عزت کرتے۔ اور مجھے ہر ایک غم اور خوشی میں شامل کرتے۔ مگر میرا دل بے قابو ہو چکا تھا۔ کچھ عرصہ کے بعد معلوم ہوا۔ کہ سجادہ بیگم کے بچہ پیدا ہوا ہے۔ مگر میری عجیب حالت تھی

دن کے وقت تو کوئی نہ کوئی آجاتا تھا۔ مگر رات کو میں کتابوں کا مطالعہ کیا کرتی تھی۔ اس طریقہ پر نماز اور قرآن مجید کی تلاوت کے علاوہ والدہ صاحبہ کی خدمت میں دل لگائے رکھتی۔ ایک دن ایک ملازم نے مجھے کہا۔ کہ بی بی صاحبہ تمہاری چچا زاد بہن اور بھاوجہ تم سے ملنے کے لئے بہت تڑپتی ہیں۔ مگر بڑی بیگم صاحبہ "شہزادی" اُن کو روکتی ہیں۔ میرے ہر دو چچا کی بیگم صاحبان بھی شاہ ایوب خاں کی اولاد میں سے تھیں۔ میں نے سوچا کہ اگر میرے چچا زاد بہن بھائی مجھے ملیں۔ تو کونسی بُرائی ہے؟ میں کسی وقت اُن کے جایا کرونگی۔ وہ میرے ہاں آیا کریں گے۔ میری تفریح کا کچھ سامان ہو جائے گا۔ غیروں کے آنا جانا تو عیب سمجھا جاتا ہے۔ لہذا اتنا ہی غنیمت ہوگا۔ میں نے والدہ صاحبہ سے دریافت کیا۔ تو والدہ صاحبہ نے فرمایا۔ کہ بیٹی! یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے تمہارے والد صاحب کے ساتھ کبھی نیک برتاؤ نہیں کیا تھا مگر میں نے کہا۔ اب آپ میری خاطر اجازت دے دیجئے۔

والدہ صاحبہ نے فرمایا۔ بیٹی! تمہاری خوشی سے میری خوشی ہے آخر اپنے ہیں۔ اگر تمہیں عزیز سمجھیں۔ تو اُن سے بہتر کون ہو سکتا ہے! مگر یہ ذرا مشکل ہے دیکھ لو۔ سمجھ لو۔ یہ سنکر میں نے اُس ملازمہ سے جو مجھے اُن کا پیغام دیا کرتی تھی۔ کہدیا۔ کہ وہ لوگ شوق سے میرے پاس آجا سکتے ہیں۔ میں نے والدہ صاحبہ سے اجازت لے لی ہے۔ چنانچہ وہ تشریف لے آئیں۔ میری چچا زاد بہن اور چچی دیر تک

روتی دھوتی رہیں۔ گذشتہ اور پیوستہ کے شکوے شکایات ہو کر آخر صلح صفائی ہو گئی۔ میں اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کے لئے ابتدا ہی سے دل میں تڑپ رکھتی تھی۔ مجھے اپنے ہر دو چچا صاحبان سے بھی از حد محبت تھی۔ مگر شرا کت، کنبے داری اور کچھ خاندان کی کاوشیں چلی آتی تھیں۔ یہ میرے چچا (مرحوم) کی اولاد تھی جو بڑی مدت کے بعد ہم سے ملے۔

اس کے بعد آمد و رفت کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ مگر بقول والدہ ماجدہ کچھ عرصہ کے بعد جب میں نے چند ایک ان کی پھبتی اور ہتک آمیز باتیں سنی تو میرا دل ڈوب گیا۔ اور پھر اس کے بعد ہمارے تعلقات ختم ہو گئے اس کے بعد میں نے چاہا کہ علی گڑھ سکول میں جا کر داخل ہو جاؤں۔ اور دینیات کی تعلیم حاصل کروں۔ مگر والدہ صاحبہ کی جدائی کے علاوہ میری اپنی صحت اس قابل نہ تھی۔ کبھی سر درد۔ کبھی نزلہ۔ زکام اکثر دائمی بیماریاں تھیں جو میرے دماغ کو آئے دن بیکار کر رہی تھیں۔ آخر یہ ارادہ بھی فسخ ہو گیا۔ پھر وہی تعلیم کا سودا اور ساتھ ہی مایوسی کی انتہا۔ سکول کی دو چار استانیاں میرے پاس آیا کرتی تھیں۔ میں نے اُن سے مشورہ کیا۔ کہ لڑکیوں کی دینی تعلیم کے لئے کوئی مدرسہ قائم کرنا چاہیئے۔ مگر افسوس! کہ میرے ساتھ اور کوئی نہ تھا۔ تنہا عورت اس کام کو انجام نہ دے سکتی تھی۔ اس لئے اس خیال کو بھی عملی جامہ نہ پہنا سکی ان معاملات میں صلاح مشورہ دینے والا کوئی ایک نفس بھی نہ تھا۔ والدہ

صاحبہ کے خیالات بالکل پُرانے تھے اور ویسے بھی انہیں ہمیشہ آرام و سکوت سے واسطہ رہا تھا۔ میں جس وقت کوئی تجویز پیش کرتی۔ تو فرما دیتیں "بیٹی! بھلا تمہیں کیا مصیبت پڑی ہے۔ کہ اپنے آرام کی زندگی میں خلل پیدا کر رہی ہو۔ اِن معاملات میں تمہیں مردوں کے دوش بدوش چلنا پڑے گا۔ اس صورت میں بدنامی پیدا ہونے کا اندیشہ ہے"۔ یہ سنکر میری جرأت ختم ہو جاتی۔ پھر کچھ وقت خاموشی سے گزر جاتا۔

اکثر طبیعت میں ولولہ پیدا ہوتا۔ کہ شہر کی عورتوں میں کوئی انجمن قائم کرکے اس میں اپنے خیالات کا اظہار کروں۔ اس طرح شریف زادیوں کے لیے ایک سوسائٹی قائم ہو جائے گی۔ مگر میرے تو خیالات ہی میری مہربان ہستیوں کے بالکل خلافِ طبع تھے۔ اگرچہ اس زمانہ میں نئی روشنی پھیل رہی تھی۔ مگر میرے وطن میں ہر قوم اپنے رواج کی پابند تھی۔ نئی چیز اُن کی نگاہوں میں فضول تھی۔ میرے خیالات کو آزادی پر محمول کیا جاتا تھا۔ مجھے اکثر لڑکیوں کو دیکھنے کا اتفاق ہوتا۔ جو بڑی سمجھدار، ہوشیار اور با لیاقت معلوم ہوتیں۔ میں اُن کے حالات کا اندازہ لگا کر سوچا کرتی تھی۔ کہ اِن بچیوں کو ذرہ بھر بھی توجہ دلائی جائے۔ تو یہی ایک دن قابلِ فخر عورتیں دینیات کی عالم۔ قوم کی کارکن بن سکتی ہیں۔ مگر میں وطن شریف کی پابندی اور قومیت کے رواج کی زنجیریں جکڑی ہوئی تھی۔ چاروں طرف دقیانوسی طرزِ معاشرت کا تاریک پہلو دکھائی دیتا تھا۔ ان وجوہات اور پابندیوں سے تنگ آکر اکثر یہ خیال آتا

تھا۔ کہ اگر مجھے خبر ہوتی۔ کہ میری بربادی کے دوسرے برس ہی میرے والد صاحب قبلہ بھی میرا ساتھ چھوڑ جائیں گے۔ تو میں وطن میں ہرگز نہ آتی۔ کیونکہ لاہور میں عورتوں کے لئے بڑی بڑی تفریح گاہیں اور دل لگانے کے سامان موجود تھے۔ ہر ماہ "انجمن خواتینِ اسلام" کے جلسے ہوتے تھے۔ عورتوں کی تقریریں ہوتیں۔ نئے نئے رسالے عورتوں کے لئے اجرا ہوتے۔ اکثر تہذیب و تمدن کی حفاظت کیلئے عورتوں کو کمیٹیاں کرنے اور ریزولیشن پاس کرنیکا وقت ملتا تھا۔ گو والد صاحب کی زندگی میں بھی اگرچہ میرے خیالات اسی قسم کے تھے۔ مگر اُن کی محبّت اور شفقت مجھے کبھی دوسری طرف توجہ دینے کا موقعہ ہی نہ دیتی تھی۔ کاش کہ میرے والد صاحب بھی اور دس بارہ برس زندہ سلامت رہتے۔ تو شاید میرے یہ جذبات کمزور ہو کر بے حس ہو جاتے۔ میں ہر وقت غور کرتی۔ کہ ہر ایک مذہب کی عورتیں ترقی کے میدان میں آرہی ہیں۔ جو جگہ بجگہ کالجوں اور مدرسوں میں تعلیم پاتی ہیں۔ اپنے حق اور فرائض کو سمجھ کر اپنی زندگی کو مردوں کی جوتی پر قربان نہیں کرتیں۔ بلکہ مردوں کے برابر کماتی ہیں۔ مگر ہمارے یہاں تو جانوروں سے بدتر حالت تھی۔ میں دنیا کا کوئی بھی کام انجام نہ دے سکتی تھی۔

ہر چیز کی ترقی کا زینہ علم ہے۔ تباہی سے بچانے والی۔ غلامی سے آزاد کرنے والی۔ مشکل سے مشکل امور میں امداد دینے والی جو کچھ بھی ہے۔ تعلیم ہے۔ بے علم تو خدا کو بھی نہیں پہچان سکتا۔ کسی نے خوب کہا ہے۔

"کہ بے علم نتواں خدا را شناخت"

اسی کشمکش میں میاں قمرالزماں کی وفات کو پانچ سال کا عرصہ گذر گیا۔ ایک طرف تو میرے خیالات تعلیم کی کمی کا ماتم کر رہے تھے۔ اور دوسری طرف میرے والد صاحب قبلہ کے انتقال کے بعد چاروں طرف سے لوگوں نے میری لاوارثی کو محسوس کرتے ہوئے نکاح کے لیے پے در پے پیغام بھیجنے شروع کر دئے۔ مگر میری یہ حالت تھی۔

ایک بار ذکار غم میں کسی خاکسار کے
مجبوریوں میں شان ہے یہ اختیار کے
بلبل قفس کو رنگ دے ٹکرا کے سر کو اب
گل سیر کرنے آئے ہیں فصل بہار کے

ان حالات میں میرے دل و دماغ پر کڑک کڑک کر بجلی گری اور جگر کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ لہذا ان پریشانیوں کے لازوال ہجوم میں اکثر اپنے ٹوٹے پھوٹے خیالات کو مجتمع کر کے رسالہ "عصمت" میں بھیجا کرتی تھی۔ مگر ان دنوں میرے نام کو بھی پردہ تھا۔ کھلے بندوں لکھنے کی ممانعت تھی۔ اس لیے نام کی جگہ دو حرف لکھ دیتی۔ بزرگوار علامہ راشد الخیری کو خدا غریق رحمت کرے۔ صرف اُن سے میری خط و کتابت تھی اور ان کو میرے پورے حالات کا علم تھا۔ انہوں نے بھی ایک افغان کا پیغام دیا۔ جو ریاست بھوپال میں ایک افسر تھا۔ اُس کے دو لڑکیاں تھیں۔ بیوی گزر چکی تھی۔ انہوں نے نہایت شفقت و بزرگانہ اخلاص سے

مجھے سمجھایا۔ اور مطمئن کیا اور نکاح کے متعلق کئی مسئلے تحریر کر کے مجھ سے جواب طلب کیا۔ مگر یہ سب کچھ محض میری خود مختاری اور لاوارثی ہی کا باعث تھا۔ خیر میں محترم موصوف کو جو مناسب سمجھا۔ جواب دیکر ٹال دیا۔ اسی طرح اور کئی جگہ سے پیغام آئے اور میں ٹال مٹول کرتی رہی۔ رونا تو مجھے ہر وقت کا تھا۔ مگر اپنی اِس "فریاداری" پر اکثر مجھے افسوس کے ساتھ ہنسی بھی آجاتی۔ میں خود ہی اپنے خونچکاں حالات سے مذاق کرتی کہ خود کو کسی نیلام گھر کے سپرد کیوں نہ کردوں۔ تاکہ طلبگاروں کو خط لکھنے اور لفافوں کی قیمت خرچ کرنے کی دِقت نہ ہو۔ جو کوئی میرے حسب منشا بولی دے۔ میرے سوالوں کو پورا کردے۔ تو میں اُسے قبول کرلوں۔ میں ہمیشہ پریشان رہتی تھی۔ کہ الٰہی یہ دنیا والے میرے پیچھے کیوں پڑ گئے ہیں۔ مجھ میں کونسی خوبی ہے۔ یا مجھ میں کونسی بُرائی ہے۔ میں کیا کر رہی ہوں؟ باوجود پھونک پھونک کر قدم رکھنے کے اس قدر آزادی سے لوگ میرا چرچا کیوں کر رہے ہیں۔ ان کو جرأت کیونکر ہوئی جاتی ہے؟ آہ میری لاوارثی ہی میری بدبختی کا باعث تھی کاش۔ کہ میں تعلیم یافتہ ہوتی تو اس وقت ان تمام مردوں کو کسی تقریر میں جواب دیتی۔ کہ خدارا میرا دامن چھوڑ دو۔ ایسے لاکھوں ولولے دل میں اُٹھتے تھے۔ مگر ؎

چاک کو تقدیر کے ممکن نہیں کرنا رفو!
سوزنِ تدبیر گو ساری عمر سیتی رہے

افسوس! عورت کی ذات سے جو چیزیں دشمنی کرنے والی ہیں وہ میرے پاس تھیں۔ میں نے ایک کتاب میں پڑھا تھا۔ کہ ایک عالم کا قول ہے۔ کہ چار چیزیں عورت کی دشمن ہوتی ہیں۔ جوانی۔ جہالت۔ دولت اور لاوارث ہونا۔ پھر اس صورت میں دنیا کب چین لینے دیتی۔ خدا کا شکر تھا۔ کہ میرے وطن کے سب لوگ امیر و غریب خورد و کلاں میری عزت کرتے تھے۔ اس لئے یہاں سے کسی نے جرأت نہ کی۔ مگر دور و دراز جگہوں سے برابر میرے خون کی قیمت پوچھی جا رہی تھی۔ سوائے ذاتِ باری تعالیٰ کے میرا کوئی رازدار نہ تھا۔ وہی دگرگوں حالات میں میری امداد کر کے اپنی حفاظت میں رکھتا تھا۔ اسی کشمکش میں زندگی کے کئی برس گزر گئے۔ مگر پھر بھی بربادی سائے کی طرح میرا تعاقب کئے جا رہی تھی۔ دل چاہتا تھا۔ کہ کسی ایسی جگہ جا کر رہائش کروں جہاں کوئی میرا نام نہ لے۔ چاروں طرف گمنامی ہی گمنامی ہو۔ دنیا والے اپنے ہر کام کو انجام دے لیتے ہیں۔ مگر کسی خود رفتہ اور پریشان حال کا علاج کسی کے پاس نہیں۔ کون ایسا بہادر ہو۔ جو کسی مایوس کی ڈھارس بندھائے یا ایسے بدنصیب جو دنیا کے رنج میں گرفتار و سرگردان ہو اُس کا ہاتھ پکڑ کر راستے پر لگانے کی ہمت کرے۔ سب لوگ خود غرض ہیں۔ میرے تلخ تجربات نے مجھے یہ کہنے پر مجبور کر دیا۔ کہ عورت کا وقار اسی میں ہے کہ وہ خاوند کے زیر سایہ رہے میں اسکو تسلیم کرتی ہوں کہ یہ شریعت کے لحاظ سے بھی درست ہے دنیا کے عقلمند اور عالمِ دین بھی یہی راستہ بتاتے ہیں۔ مگر خاندانی لوگوں

نے محض عورتوں کی بربادی کے لئے قانون بنا رکھے ہیں۔ اگر ایسی کمزور ہستیوں کیواسطے تعلیم یا کوئی محنت مشقت کا انتظام ہو جائے جس سے زندگی کو سہارا ملجائے۔ تو پھر عورت کو شادی نکاح کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہو سکتی یا کوئی ایسا شغل جس کے ذریعہ دل لگی رہے۔ کیونکہ محنت ایک مفید چیز ہے۔ جو انسانی دماغ کو مغموم اور پریشان کن خیالات سے محفوظ رکھتی ہے۔ انسان کے دل سے افکار و آلام کو بھلاتی اور عالم تنہائی میں اسکی مونس وغمخوار بن کر مطمئن کرتی ہے۔ بیکسی کی کٹھن گھڑیوں میں ہمدم و رفیق بنتی ہے۔ اس کے علاوہ محنت سے انسانی جسم دل و دماغ کو بہت سی آفتوں سے بچاتا ہے۔ انسانی جسم جو قدرتی کل ہے اسکی معتدل رفتار سے اچھے سے اچھے کام ہو سکتے ہیں۔ اس کی طاقت اور دل و دماغ کے ذریعے دنیا میں بڑے سے بڑے کام اور نئی سے نئی ایجادیں ہوتی ہیں۔ یہ سب محنت کے پھل ہیں۔ انسانی صحت کے ساتھ محنت مشقت کا بہت گہرا تعلق ہے۔ بیکار انسان کبھی بشاش نہیں رہ سکتا۔ ایک فارسی کی مثال جو اکثر میں والدہ صاحبہ مرحومہ مغفورہ کی زبانی سنا کرتی تھی۔ کہ ۔

آدمی زادہ چوں شود بیکار
یا شود دزد یا شود بیمار

مجھے ابتدا سے اب تک اُن لوگوں سے واسطہ رہا۔ جو سوائے کھانے پہننے اور آرام کرنے کے کچھ بھی نہ جانتے تھے۔ میں اپنی بیکسی و تنہائی کی زندگی میں بہت کچھ سوچتی اور اپنی حالت پر غور کرتی۔ کہ میری

زلیست بالکل حیوانوں کی طرح گزر رہی ہے جس انسان میں کوئی جوہر نہیں۔ وہ واقعی حیوان سے بدتر ہے۔ اُس زمانے میں بھی بہت سی کارکن خواتین تھیں۔ مگر ہمارے دونوں خاندان یعنی میکے اور سسرال میں عورتوں کیلئے بہت بیکاری تھی۔ جس نے کئی زندگیاں تباہ و برباد کر رکھی تھیں۔ اگرچہ میں پردے کی مخالف نہیں ہوں۔ کیونکہ حدِ اعتدال تک پردہ عورت کی ذات کے لئے ضروری ہے۔

میری طبیعت میں ایک نقص بھی تھا۔ کہ میں بلا وجہ ہر انسان سے اپنی امید وابستہ کر لیتی۔ مگر انجام کار مایوس ہو کر شکستہ دل ہونا پڑتا تھا۔ گو یہ میرا قصور نہ تھا۔ کیونکہ تعلیم کی کمی اور تجربہ نہ ہونے کی وجہ سے انسان کہاں تک دماغ سے کام لے سکتا ہے؟ تاہم میں حتی الامکان اپنے دل کو مضبوط کرنے کی کوشش کرتی تھی اور ماضی کے رنجیدہ واقعات کو بھلا کر مستقبل کے خیالی خطروں کو نظر انداز کرنے کی جد وجہد کرتی۔ مگر بے سود۔ چاہتی تھی۔ کہ لوگوں سے امیدیں وابستہ کرنا چھوڑ دوں۔ شاید میری ناشاد و نامراد زندگی اگر خوشگوار بن نہ سکے تو کم ازکم موجودہ مصائب کو اطمینان اور صبر سے برداشت کر سکوں۔ دل میں جس وقت جذبات کا سمندر موجیں مارتا اس وقت میں دنیا کی ہر چیز سے بے نیاز ہو جاتی۔ کیونکہ میری نگاہوں میں کائنات کی تمام رنگینیوں اور دلچسپیوں کا مرکز فقط تعلیم یافتہ ہونا تھا۔ لیکن میں اس سے محروم تھی۔ میں اپنے غم کو غلط کرنے کی کوشش تو بہت کرتی۔ مگر آرزوؤں کا خون چین نہ لینے دیتا تھا۔

میں ایک عرصہ سے اسی اُدھیڑ بُن میں غرق رہی۔ آخر ایک دفعہ میری والدہ صاحبہ کی ایک سہیلی جن کا نام حیدری بیگم تھا۔ وہ تعلیم یافتہ اور بہت روشن خیال خاتون تھی۔ میرے پاس آئیں۔ اور مجھے مغموم دیکھ کر نہایت نرم لہجہ میں کہنا شروع کیا "کہ میری عزیز بیٹی! مجھے ڈر ہے۔ کہ اس قدر پریشان رہنے سے تم کسی مرض کا شکار نہ ہو جاؤ۔ ابھی دنیا کا تمہیں تجربہ نہیں۔ یہاں ایسی ہستیاں تو بہت ہی کم ہوں گی۔ جو حقیقی خوشی سے شاد کام ہوں۔ مسرت کی زندگی تو شاذ و نادر ہی کسی کی ہو گی۔ تمام عالم طرح طرح کی الجھنوں میں ہی گرفتار ہے۔ انسان تو حتی الوسع اسی کوشش میں رہا کرتا ہے کہ میں مسرت کی زندگی بسر کروں۔ مگر

وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے

اس میں شک نہیں۔ کہ آرزوؤں کی شکست درد انگیز اور ہماری ناکامیاں ہوشربا اور روح فرسا ہوتی ہیں۔ لیکن اگر ہم ہر گھڑی دل کو خنجرِ غم سے مجروح کرتے رہیں۔ تو زندگی خراب اور بے کیف ہو کر رہ جائے گی زندگی ایک نعمت ہے۔ اس کی قدر کرنی چاہیئے۔ اس عطیہ کی ناشکری کفرانِ نعمت ہے۔ اس لئے ہمیں چاہیئے۔ کہ ہر وقت خدا کی عنایات پر نگاہ کر کے مایوسی سے حتی الامکان اجتناب کریں۔ نوشتۂ تقدیر کو تو کوئی نہیں مٹا سکتا۔ لیکن صبر آزمایوں اور خندہ پیشانیوں کے نشتر سے دردِ مصیبت کا حملہ کچھ کمزور ہو جایا کرتا ہے۔ ہمیں اس دنیائے ناپائیدار میں ٹھوکر لگاتے اور رنج و راحت برداشت کرتے ہوئے دنیا سے رخصت ہو

جاتا ہے۔ شکر صبر نہ کیا جائے تو خداوند کریم ناراض ہوتا ہے۔ اپنے کو دُکھیا قرار دینا نند رسنی پر تشدد کر کے گویا قدرت سے جنگ کرنا ہے۔ جب ہمیں علم ہے کہ تقدیر کے معاملے ازل ہی سے طے پا چکے ہیں۔ اور ہماری آہ وزاری نظام کائنات میں کسی قسم کی تبدیلی پیدا نہیں کر سکتی۔ ہماری ضد اور ہٹ بے سود ہے۔ تو اپنی نباہی کو ترقی دینا اور آہ و بکا کے نعرے لگانا بے فائدہ ہے۔ انسانی روح اور صحیح دماغ ہمیشہ اور ہر حال میں احساسات کی عجیب و غریب نوعیت کا تجربہ کرتے ہوئے محویت کے عالم میں آسمانی بلندیوں تک پہنچ سکتا ہے۔ انسان اُس وقت مکمل انسان ہوتا ہے۔ جب وہ یہ جان لے کہ میں کون ہوں؟ اور مجھے کیا کرنا چاہیئے۔ صوفی لوگ فرماتے ہیں ؎

پی کے ہم بادۂ عرفاں کو اگر دیکھتے ہیں
جلوہ اپنا نظر آتا ہے جدھر دیکھتے ہیں

ہر وقت غم کی سرگردانی سے خدا کی یاد بھول جاتی ہے۔ بلکہ غموں میں انسان بعض وقت اپنے پیدا کرنے والے سے بدگمان ہو کر جہنم کا ایندھن بن جاتا ہے۔ اس لئے ہمیشہ صبر شکر کرنا چاہیئے۔"

خالہ جان کی شفقت میں ڈوبی ہوئی حقیقت آفریں نصیحت نے میرے دل پر کافی گہرے نقوش چھوڑے۔ مجھے ان کی باتوں سے روحانی تسکین ہو رہی تھی۔ دل چاہتا تھا۔ کہ وہ ایسی عالمانہ باتیں کرتی رہیں اور میں سنتی رہوں۔ ورنہ میرا دل سخت گھبرایا ہوا تھا۔ فضول یا وہ گوئی

کی ہمدردیاں مجھے بہت ناپسند تھیں

میرا دل ایسی باتوں سے نفرت کیا کرتا تھا لہذا میں کسی کے کہنے سننے یا کسی کی ہدایت کی بھی پرواہ نہ کرتی تھی۔ محض اس لئے کہ میں خود کو کسی جنجال میں پھنسانا نہ چاہتی تھی۔ میرے دل میں کوئی امنگ اور امید ہرگز نہ تھی۔ بلکہ طرح طرح کی کاوشیں اور رنگ برنگ کی الجھنیں آئینہ دل کو چور کر چکی تھیں۔ یہی جی چاہتا تھا۔ کہ کسی کی تابعداری کا جھگڑا نہ ہو۔ کیونکہ باوجود نازپروردہ ہونے کے جس قدر میں نے خاوند کی تابعداریاں کی تھیں میرا ہی دل جانتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں پابندیوں سے سخت گھبراتی تھی۔ کیونکہ بقول شخصے ؎

ہو گی نہ قدر جان کو قرباں کئے بغیر
ملتے ہیں دام جنس کو ارزاں کئے بغیر؟

جب تک قربانی نہ کی جائے۔ انسان کبھی کامیاب نہیں ہوسکتا۔ مگر آہ! یہ دنیا دارالمحن ہے اور بیشک مصائب کا گھر۔ ایک طرف تو میری تباہ حالیاں مجھے سکون نہ لینے دیتی تھیں۔ اس پر عزیزوں کی موت اور بیماریوں نے میری رہی سہی کمر ہمت توڑ دی تھی۔ ابا جان کے بعد چچا جان چل دئے آخر اُن کے بعد میری والدہ ماجدہ بھی بستر علالت پر دراز ہوگئیں۔ ان کو جگر کا عارضہ ہوگیا۔ حالات دن بدن خطرناک صورت اختیار کر رہے تھے۔ ڈاکٹر حکیم روزانہ سینکڑوں روپے لے جاتے۔ ان کی دوائی اور تیمارداری سے مجھے ایک منٹ کی بھی فرصت نہ

ملتی تھی۔ اب نہ دماغ میں کوئی سوچ تھی اور نہ کوئی ہلچل۔ صرف ایک دھن تھی وہ یہ کہ اماں جان اچھی ہو جائیں۔ میری والدہ صاحبہ کی طبیعت مجھ سے بالکل مختلف تھی۔ وہ حاکمانہ طبیعت کی مالک اور میں بقیرارسا دل رکھتی تھی۔ لہذا میرا یہ وقت سب سے زیادہ کٹھن تھا۔ گردش میرے عزم کو جنبش دے کر میرے استقلال کو جڑ سے اکھاڑنے کی کوشش کر رہی تھی ؎

اے گردش تقدیر تو کیا کیا نہ کرے گی
کب تک تو میرا حال پریشان کرے گی
حیران ہوں کیا کیا میں کروں تیری شکایت
ڈر ہے کہ تو ہر حال میں ہی ساتھ رہے گی

میں نے والدہ ماجدہ کے علاج میں کوئی دقیقہ باقی نہ رکھا۔ چند خدمتگاریں میرے ساتھ ان کی خدمت میں رات دن رہتیں۔ رشتہ دار تو سب ہی خواب و خیال ہو چکے تھے۔ بیماری پر دھڑا دھڑ روپیہ خرچ ہو رہا تھا۔ ان دنوں مجھ میں نہ رونے کی ہمت تھی۔ نہ واویلا کرنے کی طاقت۔ وقت ہوا کے گھوڑے پر سوار اڑا جا رہا تھا۔ میں نہیں جانتی تھی۔ کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیئے۔

ایک دن شام کے وقت میں اپنے حال و مستقبل پر غور کر رہی تھی۔ کہ یکایک میری ملازمہ نے ایک پیغام دیا۔ کہ بی بی صاحبہ ایک سفید ریش سفید پوش آدمی آپ سے ملنے آیا ہے۔ میں اپنی والدہ صاحبہ کے پلنگ

پر بیٹھی اُن کو آہستہ آہستہ دبا رہی تھی۔ یکدم اٹھی اور کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھتے ہی میں نے پہچان لیا۔ کہ یہ بزرگ میرے سسر صاحب یعنی قمر الزماں کے والد صاحب کے دوست ہیں۔

شاہ صاحب ریاست جموں کے باشندے تھے۔ اور ہمیشہ میرے سسرال والے ان کو اپنی ہر رنج و راحت میں شریک کیا کرتے تھے۔ وہ منتظم بھی تھے اور صلاح کار بھی۔ میری شادی کے زمانہ میں بہت سے کام اُن کے ہاتھ سرانجام پائے تھے۔ میں نے ان کو اندر بلا کر ایک کرسی پر بٹھا دیا۔ اور آپ پردے کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی۔ ان کا اسم گرامی محمد شاہ تھا۔ میرے سلام کے جواب میں بہت ہی شفقتانہ لہجہ میں دعائیں دیکر انہوں نے میری خیریت دریافت کرتے ہوئے کہا بیگم! میں کشمیر گیا ہوا تھا۔ تھوڑا ہی عرصہ ہوا۔ جب میں ریاست جموں اپنے گھر میں آیا۔ تو میاں بخت نصر صاحب کی بیماری کا حال معلوم ہوا۔ انہیں دیکھنے امرت سر آیا۔ تو ان کی موجودہ حالت دیکھ کر بہت صدمہ ہوا۔ دماغ کی بیماری کے علاوہ اور بھی کئی بیماریاں لاحق ہیں۔ پھر آپ کے متعلق دریافت کیا۔ تو معلوم ہوا۔ کہ آپ کے والد صاحب بھی اس دنیا فانی سے رخصت ہو گئے ہیں۔ مجھے سخت رنج ہوا۔ آپ کی بیکسی پر رہ رہ کر افسوس آتا ہے۔ خدا مرحوم محترم کو غریق رحمت کرے۔ ان کی نیک مزاجی کا مجھے خوب اندازہ ہے۔ کہ کیسے نیک اور شریف تھے۔ کاش! وہ چند برس اور زندہ سلامت رہتے۔ ابھی ان کی کوئی بڑی عمر بھی نہ تھی۔ بہت بیچ

اور افسوس کا مقام ہے۔"

مَیں اُن کے اظہارِ افسوس پر شکریہ ادا کرتے ہوئے آنسو بہا رہی تھی۔ اُنہوں نے صبر کی تلقین کی۔ پھر پریشانی کے لہجہ میں کہا "معلوم ہُوا ہے۔ کہ آپ کی والدہ صاحبہ بھی کچھ عرصہ سے بیمار ہیں۔"

مَیں۔" جی ہاں! اُن کی بیماری نے تو مجھے اس قدر حیران کر رکھا ہے۔ کہ پناہ بر خدا۔ میری دنیا تاریک سے تاریک تر ہوتی جا رہی ہے۔"

محمد شاہ۔ بھلا بیٹی یہ کوئی ایسی تکلیف ہے؟ کیا مصیبت پر مصیبت دیکھ رہی ہو؟ آخر بیماری ہی ہے۔ رفع ہو جائے گی۔ گھبراؤ مت۔

مَیں۔ جی والدہ کو جگر کا عارضہ ہے۔ ان کا کھانا پینا کئی ماہ سے بند ہے۔ صرف دودھ اور یخنی پر گزر ہوتا ہے۔ نہ چل سکتی ہیں۔ نہ پھر سکتی ہیں۔ ان کو اپنی بیماری سے زیادہ میرا فکر رہتا ہے۔

محمد شاہ۔" بیشک۔ اُن کے سوائے اب اور کون فکر کرنے والا ہے؟ افسوس صد افسوس! آپ کی حالت اس وقت قابلِ رحم ہے۔" یہ کہکر وہ بھی آب دیدہ ہو گئے۔ اور کہا۔" اچھا بیٹی! خدا آپ کا نگہبان رہے۔ مجھے اجازت دیجئے۔

مَیں۔ آپ چائے پی لیجئے!

میری ملازمہ نے چھوٹی میز سامنے لا کر رکھ دی۔ میرے اصرار پر وہ چائے پینے لگے۔

میں نے کہا۔ رات کو آرام یہاں ہی فرمائیگا۔ مردانہ کمرہ وہ سامنے

ہے۔

محمدشاہ۔ بیٹی میں تو ایک بیرسٹر صاحب کے ہاں ٹھہرا ہوا ہوں۔ کچھ عرصہ ہوا۔ وہ مجھے امرتسر میں انجمن کے ایک اجلاس پر ملے تھے۔ بہت شریف مزاج اور بااخلاق آدمی ہیں۔ اُنہوں نے یہاں آنے کا وعدہ لے لیا تھا۔ چنانچہ میں نے اب آپ کو ملنے آنا تھا۔ مگر آپ کے مکان کا مجھے مکمل پتہ نہ تھا۔ اس لئے میں پہلے بیرسٹر صاحب کے دفتر میں چلا گیا تھا۔ اور اُن سے آپ کا پتہ دریافت کیا۔ وہ آپ کو جانتے ہیں۔ آپ بھی شاید اُن کو جانتے ہونگے؟

میں۔ وہ بیرسٹر صاحب کون ہیں؟؟

محمدشاہ۔ سید عطاءاللہ صاحب!

میں۔ میں تو انکو نہیں جانتی۔ البتہ والد صاحب کے بہت سے اہل سادات انتہائی مہربان و دوست تھے۔

محمدشاہ۔ انہوں نے بھی یہی بتایا تھا۔ جب کہ میں نے آپ کے والد صاحب معظم کا نام لیا۔ تو بیرسٹر صاحب نے کہا تھا۔ کہ ہمارے سب بزرگوں کی اُن سے خوب واقفیت تھی۔ اور میں بھی ان حضرات کو بچپن سے جانتا ہوں۔ اور یہ بھی بتایا کہ وہ لوگ آج کل اس مکان میں رہا کرتے ہیں۔ بلکہ سڑک تک مجھے خود بیرسٹر صاحب چھوڑنے آئے تھے۔

میں۔ شہرداری کے باعث واقفیت تو سب کی والد صاحب سے

ہے۔ نہ جانے اور کن کن لوگوں سے ہو گی۔

محمدؐ شاہ۔ کیوں نہیں۔ میاں صاحب ایک مشہور و معروف انسان اور شہر کے رئیس اعظم تھے۔ میں تو ان کے اخلاق کو بھول نہیں سکتا۔ آپ کی شادی کے سلسلے میں میں اکثر میاں بخت نصر صاحب کے ساتھ آیا کرتا تھا۔ خدا مغفرت کرے۔ بہت ہی فرشتہ سیرت انسان تھے۔ اچھا بیٹی اب مجھے اجازت دیجئے۔ میں صبح کو پھر آؤں گا۔ خدا آپ کی والدہ کو شفا بخشے! میری طرف سے ان کی خدمت میں سلام عرض کرتے ہوئے ان کی احوال پرسی کرنا۔"

مجھ سے رخصت ہو کر محمدؐ شاہ سیدھے بیرسٹر صاحب کے پاس پہنچے۔ شام ہو چکی تھی۔ بیرسٹر صاحب کے گھر سے کھانا آیا۔ تو بیرسٹر صاحب نے کہا۔ آیئے شاہ صاحب۔ کھانا تناول فرمایئے۔

محمدؐ شاہ۔ بھائی تمہارے کھانے کی خاطر میں نے بڑے اصرار سے رخصت حاصل کی ہے۔

بیرسٹر۔ ہاں نو شاہ صاحب کیا آپ کو وہ بی بی ملیں ہیں؟

محمدؐ شاہ۔ کیا کہوں مجھ میں اُس بی بی کے حالات بیان کرنے کی طاقت نہیں۔ کہ کس قدر پریشانی اور مصیبت میں گرفتار ہے۔ آہ! خدا بہت بے نیاز ہے۔

بیرسٹر صاحب۔ اوہو! ایسی کیا پریشانی ہے؟

محمدؐ شاہ۔ بھائی! مجھے تو ان کے سب حال کی پورے طور پر خبر

ہے۔ اس لئے مجھے اُنہیں موجودہ صورت میں دیکھ کر بے حد صدمہ ہو رہا ہے"

بیرسٹر صاحب (ذرا توجہ سے) موجودہ صورت کیا ہے؟

محمد شاہ۔ بیچاری کا خاوند جوان مرگ ہوا۔ اس صدمہ کو سنبھالا نہ سکی تھی کہ والد صاحب کا انتقال ہو گیا۔ یہ صدمہ اور رنج و ملال ابھی زائل نہ ہوئے تھے۔ کہ چچا صاحب گزر گئے۔ اب والدہ قریب المرگ ہو رہی ہیں۔ ادھر سسرال میں میاں نجنتہ نصر صاحب جو خاندان کے سرپرست یعنی وزیر صاحب میاں نظام الدین مرحوم کے بڑے بیٹے ہیں۔ وہ بھی کئی برسوں سے بیمار پڑے ہیں۔ یہ غریب نوجوان لڑکی والدین کی نازنہ پروردہ دکھ درد میں مبتلا ہو گئی ہے۔ اللہ رحم کرے اور اس کی والدہ ماجدہ کو صحت کلی عطا کرے" کھانے سے فارغ ہو کر بیرسٹر صاحب نے اول سے لیکر آخر تک میری کہانی محمد شاہ کی زبانی سنی اور سنکر بے حد پریشان ہوئے۔

بیرسٹر صاحب۔ اس تنہائی و بیکسی میں خدا ان کی والدہ کو سلامت رکھے اگر کوئی ایسا وقت آگیا۔ تو کیا ہو گا؟

محمد شاہ۔ بھائی اُن کے لئے اُن کے ایک رشتہ دار نے بڑی کوشش کی تھی۔ مگر اسوقت انکے والد صاحب زندہ تھے اس وجہ سے اس شریف لڑکی نے اسے قبول نہ کیا۔

بیرسٹر صاحب۔ جب میاں صاحب کا انتقال ہو گیا تھا۔ تو اُن

لوگوں نے پھر کوشش کیوں نہ کی؟

محمد شاہ۔ معلوم نہیں۔ شاید کوشش کی ہو گی۔ مگر یہ محض اس خیال سے نفرت کرتی تھیں کہ وہ صاحب بھی شراب خور تھے۔

بیرسٹر صاحب۔ ٹھیک۔ تو اُن کے علاوہ پھر اور کسی نے پیغام نہیں بھیجا؟

محمد شاہ۔ میں تو بہت دیر کے بعد آیا ہوں۔ معلوم نہیں اور کسی نے پوچھا ہے یا نہیں؟

بیرسٹر صاحب۔ بھلا آپ کوئی ایسی بات اُن سے دریافت کرنے کی جرأت کر سکتے ہیں؟

محمد شاہ۔ میں یُوں تو ہر بات بے تکلف کر سکتا ہوں۔ مگر ایسی بات پوچھتے ہوئے اندیشہ ہی ہے۔

بیرسٹر صاحب۔ آپ کوشش کیجئے!

محمد شاہ۔ آپ کا خیال کس کے متعلق ہے؟

بیرسٹر صاحب۔ (سینہ پر ہاتھ رکھ کر) بے شک۔ شاید یہی خاکسار ان کی خدمت کے لائق ہو سکے۔

محمد شاہ۔ واہ صاحب! آپ کا تو خوب حوصلہ ہے!

بیرسٹر صاحب۔ اس میں حوصلہ کی کونسی بات ہے۔ اظہار خیال ہے متفق ہونا یا نہ ہونا فریق ثانی کی مرضی پر منحصر ہے!

یہ سنکر محمد شاہ صاحب زیر لب مسکرائے۔

بیرسٹر صاحب - آپ متغیر کیوں ہو رہے ہیں ؟

محمد شاہ - نہیں - کچھ نہیں -

جب بیرسٹر صاحب نے اپنے تمام حالات بیان کر دیئے تو اسپر محمد شاہ نے وعدہ کر لیا - کہ اچھا میں کوشش کرونگا - اگر ہو سکے تو بہتر ہے" - دوسرے دن بیرسٹر صاحب اپنے کام میں مصروف ہو گئے - محمد شاہ پھر میرے مکان پر آئے - میں نے اُن کو بلایا - اور پردے میں بیٹھ گئی - خیریت دریافت کرنے کے بعد محمد شاہ نے کہا - بیٹی سنا ہے آپ کی والدہ بزرگوار کی طبیعت کیسی ہے ؟

میں - جی وہی حال ہے ؟

محمد شاہ - آج کل علاج کس کا شروع ہے ؟

میں - ڈاکٹر کا - اس سے پہلے حکیم اور وید کا بھی کر چکے ہیں -

محمد شاہ - کچھ افاقہ کی صورت بھی نظر آتی ہے ؟

میں - ابھی تو حالت میں کوئی تغیر نہیں ہوا - بیماری لگاتار بڑھتی چلی جا رہی ہے - جگر پتھر کی طرح سخت ہو گیا ہے - روزانہ کئی کئی قسم کے پلستر بدلے جاتے ہیں - اور دوائیاں پلائی جاتی ہیں -

محمد شاہ - بیٹی میں ایک عرض کرنا چاہتا ہوں بشرطیکہ آپ مجھے وزیر صاحب مرحوم (میاں قمر الزماں کے والد) کا دوست سمجھ کر اپنا بزرگ جانیئے کیونکہ میاں صاحب کے ہاں جو عزت میری تھی - اس کا اندازہ آپ بخوبی کر سکتی ہیں - ان تعلقات کو مدنظر رکھتے ہوئے امید ہے

کہ آپ کوئی بُرا خیال نہ فرمائیں گی۔

میں اس تمہید کا مقصد معلوم کرنا چاہتی تھی۔ لہذا میں نے کہا۔ آپ بیان فرمائیے کیا حکم ہے؟

محمد شاہ۔ نہیں بیٹی۔ یہ ایک عرض ہے۔

میں۔ جب آپ مجھے اپنی اولاد کی طرح سمجھتے ہیں۔ تو حکم کرنے میں کیا حرج ہے؟

محمد شاہ۔ بیٹی۔ خدا آپ کو حفظ و امن نصیب کرے۔ میرا مطلب یہ ہے۔ کہ خدانخواستہ اگر آپ کی والدہ ماجدہ کی طبیعت دن بدن ایسے ہی کمزور ہوتی گئی۔ تو پھر آپ کو اپنی بیکسی کا اندیشہ نہیں؟ آپ اتنی دانا اور سمجھدار ہو کر بھی اپنے مستقبل کو مدِ نظر نہیں رکھتیں۔

میں یہ گفتگو سنکر سناٹے میں آگئی۔

محمد شاہ۔ بیٹی! کیا آپ نے میری عرض پر غور فرمایا؟

میں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ میں کیا کروں! موجودہ صورت نے تو میرے حواس باختہ کر رکھے ہیں۔

محمد شاہ۔ درست ہے۔ آپ کا رنج ہی ایسا ہے کہ سننے والے بھی حواس باختہ ہو جاتے ہیں اور جو انسان خود اس میں غلطاں ہو۔ اس کی کیا حالت ہوگی۔ تاہم آپ کو سوچنا چاہیئے۔

میں۔ میری حالت کو آپ خدا کے سپرد کیجیئے۔ جو میری قسمت میں ہوگا۔ ہوتا رہیگا!

محمد شاہ - بیٹی یہ تو صحیح ہے! اور خدا کے سپرد تو سب ہی کا حال ہے - ایک آپ کا نہیں - مگر دنیا کے مکروہات کو بھی دیکھنا چاہیئے - آپکی عمر تنہا رہنے کی نہیں - سر پر کسی نہ کسی کا سایہ ہونا چاہیئے -

میں - وہ تو اُٹھ گیا - اب میں کس کا سایہ "تلاش کروں؟

محمد شاہ - بیٹی - دیکھو! انسانی زندگی سب سے بڑی ہیبتناک منزل ہے -

مَیں دل ہی دل میں اندازہ کر رہی تھی - کہ یہ بھی ضرور کوئی پیغام لائے ہیں - مگر معلوم نہیں کس جگہ سے؟ کیونکہ وطن کے کسی بشر پر مجھے امید نہ تھی - کہ یہاں کوئی ایسی جرأت کرنے والا ہو - اکثر باہر کے لوگوں نے پیغام بھیجے تھے جب سے والد صاحب کا انتقال ہُوا - یہ سلسلہ برابر جاری تھا - سوچتی تھی - کہ یا الہیٰ یہ نئی فرمائش کس کی ہے؟ مگر خاموش تھی - سوچا کہ اگر ان کو زبان سے کچھ کہنے کی جرأت نہ دی جائے تو بہتر ہے - یہ سوچ کر میں نے کہا بزرگوارم میں نے اپنی "تقدیر کو اچھی طرح دیکھ لیا ہے کہ میری خوشیاں خوش بختی کے زمانے میں بالکل مصنوعی تھیں - میں دیکھنے والوں کو بے حد خوش نظر آیا کرتی تھی - مگر میری روح اضطراب و اضطرار کے جھولے میں جھول جھول کر برابر نئے سے نئے رنگ دکھاتی رہتی - آہ اس جہنم کدۂ زیست کے سکون سوز شعلوں میں آجتک اپنے کو جلتے ہی پایا ہے - مگر دل ہی قدرت نے ایسا دیا ہے - کہ جو تمام رنج کی گھڑیاں خوشی سے گزار دیتا ہے - بقول شاعر

دل دے تو اس مزاج کا پروردگار دے جو رنج کی گھڑی ہو خوشی سے گذار دے

میری زندگی کی مصیبتوں نے مختلف منازل طے کر کے اب دل کو صبر سکون کا مسکن بنالیا ہے۔ نہ مجھے رنج سے کوئی خاص تکلیف محسوس ہوتی ہے۔ اور نہ خوشی سے کوئی خاص راحت۔ میری روح مطمئن ہو رہی ہے۔ کہ دنیا میں سوائے رنج کے اور کچھ بھی نہیں۔ تو پھر جد وجہد کرنا۔ اور دوسروں کی تابعداری میں اپنی دکھیا جان کو جکڑ بند کرنا بے سود ہے۔ کیونکہ اب میری روح میں وہ ہمت اور بالیدگی ہی باقی نہیں رہی۔

محمد شاہ نے یہ سنکر منہ میں انگلی دبالی۔ اور سمجھ لیا۔ کہ میرا اصل مطلب معلوم ہوگیا ہے۔ مگر وہ بھی پرانا زیرک تھا۔ اور تجربہ کار۔ اپنے دلائل میں مستعد رہا۔

محمد شاہ۔ بیٹی! آپ جو کچھ فرما رہی ہیں۔ اس میں کچھ بھی شک نہیں کہ اس ۲۶-۲۷ برس کی عمر میں کیا کیا دکھ بھگتنے پڑے۔ یہ آپ کی عقلمندی و دانشمندی تھی۔ میں سب کچھ اندازہ کر چکا ہوں۔ اور آپ کے حالات سے واقف ہوں کہ آپ اپنے نازک دل پر بہت سی کلفتیں برداشت کر چکی ہیں۔ مگر اب جو صورت ہے۔ یہ اور بھی خطرناک پہلو اختیار کر رہی ہے۔ بہتر یہ ہے کہ آپ کسی شریف خواہشمند اور قدردان کو اپنا مونس بنا لیجئے۔ ایسے شخص کو جو آپ کے حسب منشا ہو۔

میں۔ مجھے تو کوئی ایسا انسان ہی نظر نہیں آتا جو میرے حسب منشا ہو۔ دنیا میں ہر شخص غرض کا غلام ہے۔

محمد شاہ - یہ تو درست ہے۔ مگر ہمیشہ دنیا میں دونوں طرف غرض ہی ہوتی ہے۔ اسی طرح یہاں تمام انسان مل جل کر دنیا کے کام انجام دیتے ہیں۔

میں - درست۔ لیکن اگر ایک طرف کچھ خواہش اور دوسری طرف سے کچھ اور جذبہ ہو۔ تو پھر کیسے نبھا ہو سکتا ہے؟

محمد شاہ - دیکھو بیٹی! خدارا میری بات پر غور کیجئے۔ اگر کوئی ضرورتمند پورے طور پر آپ کی تابعداری کرنے کا وعدہ کرے تو آپ اُس کی جائز پابندی سے کیوں گھبراتی ہیں؟ کم از کم اُسے مشکور ہونے دیں۔ یہ جو بیرسٹر صاحب ہیں۔ کیا آپ کو اُن کے حالات معلوم ہیں؟

میں - مجھے کوئی علم نہیں۔

محمد شاہ - ان کی بیوی تین برس ہوئے انتقال کر گئی ہے۔ ایک بچہ پانچ چھ برس کا ہے۔ اور شاید ایک لڑکی اس بچے سے بڑی ہے۔ یہ صاحب بہت پاکیزہ خیالات اور روشن ضمیر بزرگوں کی اولاد میں سے ہیں۔ حسب نسب پاکیزہ۔ دنیا داری کے لحاظ سے بھی صاحب حیثیت ہیں۔ بیرسٹر ایٹ لا خوبصورت جوان۔ غالباً آپ ہی کی عمر کے ہوں گے۔ ان کی خواہش ہے۔ زمانہ حال کی پڑھی لکھی عقلمند اور لائق بیوی کی تلاش کریں۔ اب تک بیرسٹر صاحب نے اپنی والدہ کا کہنا بھی نہیں مانا۔ کیونکہ ان کی برادری کا حال تو آپ کو معلوم ہی ہوگا۔ یہ لوگ غیروں میں شادی نہیں کرتے۔ اپنی جدوکف کا اہل سادات کو بہت خیال ہوا کرتا ہے۔ اِس لئے انہوں نے اپنی خواہش کا اظہار کیا ہے۔ اور تمام شب اس

کہانی میں صرف ہوگئی۔ وہ محض تابعداری کے خوگر ہیں۔ اور کسی بات کی طمع ان کے دل میں نہیں۔ دوسرے وہ آپ کی عزت و توقیر کو بخوبی سمجھتے ہیں۔ کسی غیر کو تو حال سنکر خبر ہوگی مگر یہ تمام اہل سادات آپ کی قدر کرتے ہیں۔ آپ خود ہی ذکر کرتی تھیں۔ کہ ان لوگوں نے والد صاحب کی موت پر میری حوصلہ افزائی کی تھی۔ موجودہ صورت اور آپ کی بیکسی میں یہ شخص آپ کی حفاظت کے لئے نہایت موزوں ہوگا۔ آئندہ آپ مالک ہیں۔ آپ کو اختیار ہے۔

میں نے کہا۔ آپ کی مہربانی کی مشکور ہوں۔ کہ میرے رنج و مصیبت سے آپ کو اسقدر ہمدردی ہے۔ میں ان تمام صاحبان کو بخوبی جانتی ہوں۔ فی الحال تو میں اپنی مصیبت میں ایسی گرفتار ہوں۔ کہ مجھے کچھ بھی نہیں سوجھتا۔ والدہ صاحبہ کی بیماری نے میری دنیا بدل ڈالی ہے۔ میرا تمام وقت والدہ صاحبہ کی تیمارداری میں گزرتا ہے۔ دعا کیجئے کہ خدا والدہ صاحبہ کو اس مصیبت سے رہائی دے۔ اور وہ جلد اچھی ہو جائیں۔

محمد شاہ۔ آمین۔ بیٹی۔ میری اس عرض کو مدنظر رکھئیگا۔ شاید میں آج چلا جاؤں۔ مگر چلتے وقت آپ کو ضرور ملنے آؤنگا۔

کھانا تیار تھا۔ میری ملازمہ نے کھانا لاکر سامنے رکھ دیا۔ وہ کھانا کھانے لگے۔ تو میں والدہ صاحبہ کو دیکھنے ان کے کمرے میں آگئی۔

والدہ صاحبہ نے پوچھا۔ یہ کیوں اس قدر کہانیاں سناتے تھے؟

میں نے یوں ہی کہکر ٹال دیا۔ اور سوچنے لگی ۔ کہ آج تک تو اپنے شہر میں محفوظ بیٹھی تھی۔ مگر اب یہاں بھی خریداری شروع ہونے لگی ہے۔ اس کا کیا علاج کیا جائے ۔ میرا دل عجیب وغریب خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ آخر سب خیالات کو برطرف کرکے میں نے والدہ صاحبہ کا لباس تبدیل کیا ۔ ملازمہ کو صفائی کا کام سپرد کرکے ان کے لئے پرہیزی کھانے پکانے میں مصروف ہوگئی ۔

محمدؐ شاہ صاحب پھر بیرسٹر صاحب کے پاس پہنچے اور کہا۔ صاحب آپ تو واقعی کرامت والے ثابت ہوئے ۔

بیرسٹر صاحب ۔ کیسے ؟

محمدؐ شاہ ۔ میں نے پہلے تو اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کردیں۔ میری جرأت کہاں تھی ۔ کیونکہ میرے لئے وہ ایک با ادب ہستی ہیں۔ میں نے اُن کے گھروں میں اُن کی مہربانی سے بہت آرام کئے ہیں۔ وہ لوگ سب ہی میرا ادب کرتے ہیں ۔ مگر وہ تو اسقدر دانائی کے ساتھ سنجیدہ گفتگو کرتی ہیں جسکا جواب دینا ہی مشکل ہوجاتا ہے ۔

بیرسٹر صاحب ۔ پھر آپ نے کیسے جرأت کی ؟

محمدؐ شاہ ۔ جب میں نے ہمدردی کے انداز میں اُن کو آپ کا حال سنایا۔ تو خاموشی سے سنتی رہیں ۔ آخرکار کہنے لگیں "کہ میں اپنے شہر کے اہلِ سادات سے اچھی طرح واقف ہوں۔ اکثر گھرانوں نے والد صاحب کی علالت اور وفات کے موقعہ پر انتہائی ہمدردی اور خلوص کا اظہار کیا تھا" یہ سُنکر میں نے کچھ اور

کہنے کی جرأت نہ کی۔ اس میں شک نہیں۔ کہ ایسی مصیبتوں کو حوصلے سے برداشت کرنا آسان کام نہیں۔ میں اُن کی انتہائی عقلمندی کی بے حد تعریف کرتا ہوں۔

بیرسٹر صاحب۔ آخر اُن کی گفتگو سے آپ نے کیا اندازہ کیا؟

محمد شاہ۔ وہ اپنی پریشانی کا اظہار کچھ ایسے طریقے پر کر رہی تھیں جو آپ کے لئے تسلی بخش کہا جا سکتا ہے آئندہ آپکی قسمت!

بیرسٹر صاحب۔ بخدا اُن کی پریشانیوں کا اندازہ کر کے میں خود حیران ہوں۔ کہ ایسی سمجھدار بی بی جسکا مفصل حال آپ کی زبانی معلوم ہوا پانچ چھ برس سے یہاں شہر میں زندگی بسر کر رہی ہے مگر کسی کو معلوم تک نہیں ہوا!

محمد شاہ۔ میں نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ اب آپ جانیں اور آپ کے شہر والے۔ آپ اس تگ و دو میں لگے رہیئے۔ خدا کارساز ہے شاید مصیبت میں کچھ بن پڑ جائے۔ کیونکہ مصیبت کے وقت شیر بھی لومڑی بن جایا کرتا ہے۔ ان کے حالات حقیقت میں سخت پریشان کن ہیں۔

بیرسٹر صاحب۔ اچھا جو خدا کو منظور ہو گا۔ اتنا کہہ کر خاموش ہو گئے۔

اسی شام کو شاہ صاحب بیرسٹر صاحب سے رخصت ہو کر حسب وعدہ میرے پاس آئے اور فی امان اللہ کہکر روانہ ہو گئے۔

اس واقعہ کے بعد بیرسٹر صاحب اس کشمکش میں رہنے لگے۔ نہ اس معاملہ کے متعلق وہ کسی سے اظہار خیال کر سکتے تھے اور نہ کہیں صلاح و مشورہ۔ آخر کار انہوں نے پھر محمد شاہ کو لکھا "کہ میں کوئی تدبیر

نہیں سوچ سکتا۔ کیونکہ وہ ایک خاندانی خاتون ہیں۔ یہ معاملہ کس طرح سرانجام ہوگا۔ میں آپ کی توجہ کا محتاج ہوں۔ گو ہم ایک ہی شہر کے باشندے ہیں۔ مگر ایک دوسرے سے پوری واقفیت نہیں رکھتے۔ آپ کی پرانی بے تکلفی اور راہ رسم ہے۔ نیز وہ لوگ آپ سے بہت مانوس ہیں لہذا مہربانی کرکے آپ تشریف لے آئیے۔ تاکہ سلسلہ جنبانی ہو سکے۔

آخر ہماری بھی شہرداری ہی تھی۔ تمام لوگ حالات سے خوب اچھی طرح واقف تھے۔ اس دوران میں بیرسٹر صاحب نے یہ طریقہ اختیار کیا۔ کہ میرے واقف کاروں کے علاوہ شہر کی مختلف سوسائیٹیوں میں آمد و رفت کا سلسلہ بڑھایا۔ اور جہاں کہیں ہماری بابت ذکر شروع ہو جاتا۔ بیرسٹر صاحب کوئی نہ کوئی بات نکال کر غیریت ہی کے پردے میں برابر اپنی معلومات بڑھاتے رہے۔

گیارھواں باب

والدہ صاحبہ کی بیماری اور سخت نا اُمیدی

ایک شب نہایت سنسان اور تاریک ترقی۔ میں والدہ صاحبہ کے سرہانے عالمِ یاس میں بیٹھی خدا جانے کیا سوچ رہی تھی۔ یکایک میری اللہ صاحبہ کے چہرے پر ایک تغیر واقع ہوا۔ میں یہ دیکھ کر ہراساں سی ہو گئی۔ فی الفور منہ میں عرق ڈالا۔ اور طاقت کی دوائی دی۔ ذرا دیر بعد والدہ صاحبہ نے آنکھیں کھولدیں۔ تو میری جان میں جان آئی۔ خدا کا شکر ادا کرنے کی غرض سے ملازمہ کو والدہ صاحبہ کے پاس بٹھا کر نمازِ نفل ادا کرنے کیلئے اپنے کمرے میں چلی گئی۔

رات کے دو بجے کا وقت تھا۔ نماز ادا کر کے والدہ صاحبہ کو دیکھا تو وہ سو رہی تھیں۔ میں نے ملازمہ کو کہا کہ تم بھی سو جاؤ میں والدہ صاحبہ کے

پاس بیٹھوں گی ۔ گویا میرا دل پے درپے صدمات سے پتھر کی سل بن چکا تھا۔
اور سخت سے سخت ترین مصیبت میں بھی میں ہمت مردانہ سے کام لینے
کی عادی تھی ۔ مگر والدہ صاحبہ کی مسلسل بیماری اور نقاہت نے میری دنیا
پلٹ دی۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا ۔ جیسے اب والدہ صاحبہ کا سایہ
بھی سر سے اُٹھ رہا ہے ۔ میں عالم یاس میں سوچنے لگی ۔ کہ اگر انہوں
نے بھی مجھے تنہا چھوڑ دیا ۔ تو دنیا میں میرا کون ہے ؟
اسی ادھیڑ بُن میں والدہ صاحبہ کے قریب میں دوسری چار پائی
پر لیٹ گئی ۔ مگر میری آنکھوں سے نیند کافور ہو چکی تھی ۔ میرا دل بے طرح
دھڑک رہا تھا ۔ میری آنکھوں کے سامنے الماری میں طرح طرح کی
دوائیوں سے شیشیاں بھری پڑی تھیں ۔ کمرے کے ایک طرف کئی قسم
کے ظروف رکھے تھے ۔ اس کمرے کے سامان سے یوں معلوم ہوتا تھا ۔ کہ
یہاں کوئی برسوں کا بیمار ہے ۔ میں تفکر بھری نگاہوں سے چھت کی طرف
دیکھ رہی تھی ۔ کہ یکایک میرے دل پر ایک خاص ہی قسم کا جذبہ بے
اختیار طاری ہو گیا ۔ آہ ! میرا عیش ختم ہو چکا تھا ۔ میرے دل میں ایک
اضطرابی کیفیت پیدا ہو گئی ۔ میں کیا چاہتی تھی ؟ صرف اپنی ماں کی زندگی !
مگر نا امیدی کے خیال سے دل بیٹھا جا رہا تھا ۔ آخر میں نے خود کو ملامت
کی ۔ کہ اب اس فکر سے کیا حاصل ہے ؟ دنیا تاریک ہو جائے گی ۔ یا تنہا
رہ جاؤں گی ۔ میرا کوئی ہمدم نہیں ہے ۔ بے شک میں تنہا ہوں ۔
بالکل بے یار و مددگار ۔ آہ ! میری زندگی میں یہ پہلا دن تھا ۔ کہ میں نے

اپنی طبیعت کی کمزوری کو محسوس کیا۔ ورنہ ہر حالت اور ہر مصیبت کے موقعہ پر میں نے سینہ سپر کئے رکھا۔ اور کبھی کسی کی پرواہ تک نہ کی تھی۔ اس وقت مجھے ایک ہمدرد کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ آخر اسی حالت غنودگی میں میری آنکھ لگ گئی۔

صبح کو پھر طبیعت بحال سی ہوگئی۔ مگر والدہ صاحبہ کی علالت کا فکر میری جان کو روگ بنکر لگ گیا تھا آخر کار والدہ صاحبہ کی کمزوری اور جگر کی کیفیت دگرگوں صورت اختیار کرنے لگی۔ میں پھر بھی اس حالت میں اپنی ہستی سے بے پرواہ تھی۔ اس اثنا میں ایکدن میری ایک قریب رشتہ دار کی ملازمہ امرت سر سے خط لیکر آئی۔ اس کا نام عائیشہ تھا۔ خط پڑھکر میری عجیب کیفیت ہوگئی۔ میرا دل و فورِ غم سے بے قابو ہونے لگا۔ کیونکہ اس خط میں مجھ پر ایک ناروا الزام لگایا گیا تھا۔ مصلحت سمجھ کر میں نے ضبط اور صبر سے ہی کام لیا۔ اور اپنے ہی دل سے پوچھا۔ کہ جن عزیزوں نے مجھے ناحق دکھ پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ اس سے اُن کا کیا مقصد ہے؟ مگر سوائے اپنی برگشتہ قسمتی کے میں اس معاملہ کو سمجھ نہ سکی۔ مجھے افسوس تھا۔ تو صرف اتنا۔ کہ مجھ پر قصور ثابت کرنے سے پہلے اگر حقیقت حال دریافت کرلی ہوتی تو کیا عجیب تھا۔ کہ یہ خانگی تنازعہ اس قدر طول نہ کھینچتا۔ خیر میں نے اس کے متعلق عائیشہ کو معقول جواب لکھ دیا مگر صدمہ سے میری طبیعت اس قدر خراب ہوگی۔ کہ میں نے بمشکل دل کو سنبھالا۔ مگر عالم اضطراب میں باربار اپنے حسب حال یہ شعر گنگناتی تھی ؎

گرچہ الطاف کے قابل یہ دلِ زار نہ تھا
لیکن اس جور و جفا کا بھی سزا وار نہ تھا

آخر میں نے طبیعت کو سنبھالا۔ اور دل میں کہا۔ خدا جانے ابھی اور ایسی کتنی مصیبتیں برداشت کرنی ہونگی۔ جن کا مستقبل روشن ہو۔ وہ تو رنج کریں مجھ خانماں برباد کا کیا ہے۔ جس نے گزشتہ زمانہ کی یاد ہی میں زندگی بسر کرنی ہے۔ بقول کسے ؎

جو مستقبل کے شائق ہیں انہیں الجھن مبارک ہو
ہمیں تو صرف اب گذرا زمانہ یاد کرنا ہے۔

میری وہ عزیزہ جس نے مجھ پر الزام دے کر مجھے روحانی صدمہ پہنچایا تھا۔ جب سے اب تک اس پر کئی ایسے حادثات گزر چکے ہیں۔ جن کی وجہ سے ان کی شادمان زندگی میں بھی ایک انقلاب آگیا ہے۔ میں اس خط کو بجنسہ یہاں نقل کر دیتی۔ مگر پھر خانگی کشمکش شروع ہو جانے کے خیال سے نہیں لکھتی۔ تاہم مجھے امید ہے کہ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد میری عزیزہ کو میری باتوں کا یقین آجائے گا۔ اور وہ حقیقت حال سے خود ہی آگاہ ہو جائینگی۔ کیونکہ ؎

زندگی تلخ ہے اب ضبط کئے کیا حاصل
صبر کرتے تھے رہے، صبر کے جب تک قابل

ایک طرف تو والدہ کی بیماری نے مجھے حیران کر رکھا تھا۔ دوسرے دل دکھانے کا یہ تازہ سامان پیدا ہو گیا۔ مگر میں نے حتی المقدر ضبط سے کام لیا۔ اور دل کو سمجھایا کہ ؎

غم ہے اس میں کیا بے سروسامانی کا
ناخدا خود ہے خدا کشتیٔ طوفانی کا

آخر انہی ایام میں ایک لائق ڈاکٹر نے مشورہ دیا۔ کہ اپنی والدہ صاحبہ کو علاج کے لئے دہلی لے جاؤ۔

میں نے والدہ صاحبہ سے ذکر کیا۔ تو انہوں نے کہا "بیٹی تمہیں سفر کی مصیبت ہو گی۔ یہاں تو گھر میں ہزار طرح کے آرام مہیا ہو سکتے ہیں۔ وہاں عالم تنہائی میں کیا کرو گی۔ یہاں ہی بہتر ہے"۔ آخر میں نے ایک اور سول سرجن کو بلا لیا۔ اور اسکا علاج شروع کر دیا۔ مگر یہ سول سرجن صاحب امرتسر کے رہنے والے تھے۔

ایک دن والدہ صاحبہ کی دوائی کے لئے (جو وطن میں مل نہ سکتی تھی۔ نیز ڈاکٹر صاحب سے مریضہ کی حقیقت بھی بیان کرنی تھی۔) میں ایک ملازم کو ہمراہ لیکر امرتسر چلی گئی۔ میاں بخت نصر کے ہاں ٹھہری۔ یہاں میاں بخت نصر صاحب کو علیل اور کمزور دیکھ کر میرا دل اور بھی پریشان ہو گیا۔ ایک طرف والدہ صاحبہ کی بیماری کا فکر تھا۔ اس پر اُن کی حالت نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔ دوران گفتگو میں بھابی آصف جہاں نے ہمارے شہر کے سید عطاء اللہ صاحب بیرسٹر کی دیانت داری کا ایک طویل قصہ سنایا۔ مگر میں نے نہایت لاپروائی سے سُنا۔ کیونکہ مجھے ان باتوں سے دلچسپی نہ تھی۔ میرا دھیان والدہ صاحبہ کی طرف تھا۔ بھابی آصف جہاں کا خیال تھا۔ کہ مجھے اس واقعہ کا علم ہو گا۔ اس لئے

میں نے دلچسپی نہیں لی۔ مگر جب انہوں نے میری حالت کا اندازہ کیا۔ تو بہت پریشانی کا اظہار کرتے ہوئے مجھے تسلی دی۔ کہ گھبراؤ نہیں۔ والدہ صاحبہ جلد اچھی ہو جائیں گی۔ اتنے میں میرا ملازم ادویات لیکر آگیا۔ بھابی آصف جہاں نے نہایت شفقت و پیار کے ساتھ دعائیں دیکر مجھے رخصت کیا۔

گھر پہنچتے ہی میں نے والدہ صاحبہ کو دوا دی۔ اور پرہیز سے آگاہ کیا۔ اور حسب دستور اپنے فرائض میں منہمک ہوگئی۔ مگر کسی کسی وقت بلا ارادہ مجھے بیرسٹر صاحب کی دیانتداری کا دھیان آجاتا تھا۔ کیونکہ بھابی آصف جہاں نے کچھ ایسے انداز میں بیرسٹر صاحب کی تعریف کی تھی۔ کہ مجھے خواہ مخواہ خیال سا ہوگیا۔ اس ہفتہ میں ایک دن ایک عورت کی زبانی معلوم ہوا۔ کہ سیّد صاحب کی برادری میں کسی کے ہاں ایک نوجوان خوبصورت عورت ہزاروں کا زیور لے کر کسی شخص کے بھروسہ پر آگئی تھی۔ وہ عورت امرت سر کے کسی امیر کبیر گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ جب اسے یہاں آکر معلوم ہوا۔ کہ وہ شخص جس کے لئے وہ گھر بار چھوڑ کر آئی تھی ہنوز نہیں پہنچا۔ تو اس نے واپس چلی جانا چاہا لیکن جن کے گھر میں ٹھہری ہوئی تھی۔ وہ لوگ اُسے جانے نہ دیتے تھے۔ چنانچہ جب اس معاملہ کا علم بیرسٹر صاحب کو ہوا۔ تو انہوں نے فوراً معاملہ کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ چونکہ وہ لوگ بھی ان کے عزیزوں میں سے تھے۔ اور بیرسٹر صاحب سے کوئی پردہ نہ تھا۔ اس لئے انہوں نے اندر جاکر اس عورت کا بیان

لیا۔ اور پھر اُسے بمع زیورات کے اپنی ہمشیرہ کے حوالے کردیا۔ اس کے بعد لڑکی کے بتائے ہوئے پتہ پر خط لکھدیا۔ پھر حفیظ اللہ نامی پولیس انسپکٹر کو بلاکر تمام زیورات اور لڑکی اس کے سپرد کردی۔ تاکہ وہ اسے بحفاظت اس کے گھر پہنچا دیں۔

اس واقع کے بعد ہمارے شہر اور امرتسر میں لوگ جگہ بجگہ بیرسٹر صاحب کی دیانتداری کا چرچا کرنے لگے۔ اسی دوران میں الیکشن شروع ہوگئی۔ بیرسٹر صاحب ایک اور وکیل کے مقابلہ میں کھڑے ہوئے۔ شہر کے تمام لوگوں میں بیرسٹر صاحب کے لئے ہمدردی تھی۔ جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ آخرکار بیرسٹر صاحب مقابلہ میں کامیاب رہے۔ اس الیکشن کے بعد مجھ پر بیرسٹر صاحب کی پوزیشن اچھی طرح واضح ہوگئی۔ اور میں نے ان کے اخلاق حمیدہ کا بھی ایک حد تک اندازہ کرلیا۔ کیونکہ وہ ہمیشہ قومی جلسوں اور ہر انجمن کے اجتماعوں میں اکثر بہت پرزور تقریریں کیا کرتے تھے۔ غرضکہ ان کا شمار بھی شہر کے سرکردہ امیر کبیر لوگوں میں ہوتا تھا۔

سید محمد شاہ کے چلے جانے کے بعد پھر بیرسٹر صاحب کی طرف سے بھی بالکل خاموشی تھی۔ مگر میں نے باوجود تنہائی کا فکر کرتے رہنے کے اس خیال کو کبھی ٹھنڈے دل سے نہ سوچا تھا۔ کہ مجھے مستقبل کے لئے کیا کرنا چاہیئے۔ میرے دماغ میں صرف ایک چیز سمائی ہوئی تھی۔ وہ یہ کہ کسی کی تابعداری کرنی محال ہے۔ بہرکیف کچھ ایسا ہی جذبہ تھا

جس کے تحت میں زندگی کے انجام سے بالکل غافل تھی۔ اور ایک پتھر کے بُت کی طرح خاموشی میں وقت گزارے جا رہی تھی۔ مگر نہ جانے کیوں میرا تمام وقت اسی طرح سے گزرتا رہا۔ ادھر والدہ صاحبہ کی بیماری اور کمزوری بدستور تھی۔ مجھے ایک ڈاکٹر صاحب کے علاج سے اطمینان نہ ہوتا تھا۔ لہٰذا میں نے گھبرا کر پھر ایک اور نئے ڈاکٹر کا علاج شروع کر دیا۔ جس نے ایک دن معائنہ کرنے کے بعد کہا۔" شہزادی صاحبہ کے جگر میں بیحد نرمی پیدا ہو رہی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ پیپ بننی شروع ہو جائے۔

میں ڈاکٹر کی زبانی یہ الفاظ سنکر بے حد متفکر ہو گئی۔ اور دریافت کیا کہ پیپ بننے کی علامت کیا ہوتی ہے؟ اور اس کا اندازہ کس طرح لگایا جا سکتا ہے؛

ڈاکٹر۔ مریض کو بخار کے ساتھ اسہال بھی شروع ہو جاتے ہیں۔ بعض دفعہ اگر دست نہ بھی آئیں تو بخار لازمی طور پر ہو جاتا ہے۔

میں۔ ڈاکٹر صاحب! والدہ صاحبہ کو صاحبِ فراش ہوئے سال بھر سے زائد ہو گیا ہے۔ مگر بخار تو ایک دن بھی نہیں ہوا۔ اور نہ کبھی اسہال ہوئے ہیں۔ البتہ شروع شروع میں چند ماہ تک جگر میں خفیف درد ہوتی رہی ہے۔ مگر پھر رفتہ رفتہ بھوک اور پیاس بند ہو گئی۔ جب سے اتبک برابر علاج جاری ہے۔

ڈاکٹر۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ دوا اور پرہیز جاری رکھئے۔ جلد آرام آ جائیگا۔

میں۔ مگر انہیں تو اناج کھائے تقریباً دس ماہ ہو گئے ہیں۔

ڈاکٹر۔ پرہیز اور دوائی کا سلسلہ باقاعدہ جاری رہا۔ اسی لئے اتنا عرصہ گذر گیا۔ ورنہ یہ عارضہ سخت خطرناک ہوتا ہے۔

یہ کہکر ڈاکٹر تو چلا گیا۔ مگر میرا دل اندر ہی اندر گھٹنے لگا۔ میں لوٹ کر جب والدہ

صاحبہ کے پاس گئی۔ تو انہوں نے پوچھا "ڈاکٹر کیا کہتا تھا؟"

میں نے کہا آپ کے متعلق تاکید کی ہے کہ ہر ممکن طریق سے دوا اور پرہیز کو قائم رکھا جائے۔ اگر بدپرہیزی ہو گی تو جگر میں پیپ پیدا ہو جانیکا اندیشہ ہے۔ یہ سنکر والدہ صاحبہ بھی بے چین ہو گئیں۔ کیونکہ جگر میں پیپ کا ہو جانا مرض کی انتہا سمجھی جاتی ہے۔ میں نے والدہ صاحبہ کو تسلی دی۔ کہ کوئی خطرہ نہیں ہے۔ آپ وہم نہ کریں۔ اطمینان رکھیئے خدا فضل کر دے گا۔ والدہ صاحبہ نے آنکھوں میں آنسو بھر کر مجھے گلے سے لپٹا کر بہت سا پیار کیا۔ پھر کہنے لگیں "بیٹی! میں تو تمہارے لئے زندگی کی ضرورت محسوس کرتی ہوں۔ ورنہ اپنا تو مجھے کوئی خیال ہی نہیں۔ آخر ایک دن اس دنیا سے جانا ہی ہے"

اگرچہ میرا دل خود بیٹھا جاتا تھا۔ مگر والدہ صاحبہ کو اطمینان دلانا بھی ضروری تھا لہذا میں نے کہا "آپ بہت جلد اچھی ہو جائیں گی۔ بیماریاں بھی انسانوں ہی کو آیا کرتی ہیں" یہ کہکر میں نے کسی جذبہ بے اختیار کے تحت میں نے یہ شعر گنگنانا شروع کر دیا ؎

آرزوئیں کچھ نہیں جن کا لقب ہے کامیاب
مشکلیں کیا خاک ہونگی جو کہ آساں ہو گئیں

غرضیکہ میں والدہ صاحبہ کا دھیان تبدیل کرنے میں ایک حد تک کامیاب ہو گئی۔ مگر میرے دل کا خدا ہی حافظ تھا۔ مجھے تو اس بے کسی میں کوئی دلاسا دینے والا بھی نہ تھا۔ غرضیکہ میرے روز و شب اس الجھن میں بیت رہے تھے۔ ہفتہ عشرہ کے بعد ڈاکٹر صاحب کسی ضروری کام کے لئے شہر سے باہر چلے گئے۔ جہاں انہوں نے دو چار روز وہاں قیام کرنا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی غیر حاضری میں والدہ صاحبہ کو بخار کی شکایت ہو گئی۔ بخار کا

ہونا تھا۔ کہ بس میری آنکھوں میں دنیا تاریک ہوگئی۔ میں نے اس وقت شہر کے ایک اور ڈاکٹر کو بلوایا۔ انہوں نے جگر دیکھ کر کہا۔ ابھی ہیپ تو پیدا نہیں ہوئی۔ مگر اندیشہ بہت زیادہ ہو رہا ہے۔ ڈاکٹر نے خون۔ پیشاب اور پاخانہ ٹسٹ کیا۔ مگر سب کچھ لا حاصل تھا۔ آخر ہمیں اس مصیبت میں مبتلا ہوئے پورا ایک سال ہو گیا۔ حتیٰ کہ ناامیدی کے آثار نمودار ہونے لگے۔

اس عالم یاس میں میں نے اپنی ایک سہیلی سکینہ خانم کو جو خود بھی مصیبت زدہ تھی اپنے پاس بلا لیا۔ وہ میری مونس اور والدہ کی تیمارداری میں میرا ہاتھ بٹاتی تھی۔ انہی ایام میں ایک دن والدہ صاحبہ نے بخار کی غنودگی میں گذار دیا۔ میں نے رات کو انہیں بمشکل دوائی کی ایک خوراک پلائی تھی۔ کہ والدہ صاحبہ بخار کی شدت میں بیہوش ہو گئیں۔ والدہ صاحبہ کی اس حالت سے میں بے حد بےچین ہو رہی تھی۔ میری ملازمہ جب اُن کے پاس ڈیوٹی پر بیٹھ گئی۔ تو میں نے سکینہ خانم سے اپنے مستقبل اور تنہائی پر اظہار تفکر کیا۔ سکینہ خانم مجھ سے عمر میں دو برس چھوٹی مگر نہایت دور اندیش اور عقلمند لڑکی تھی۔ لیکن میرے لئے یہ وقت ایسا ہیبتناک اور زلزلہ خیز تھا جسے میں ہی جانتی ہوں۔ عالم تنہائی بیکسی و بےبسی کا ہجوم چاروں طرف سے مجھے گھیرے ہوئے تھا۔

والدہ صاحبہ کی خطرناک حالت سے میرے دل میں ایک دہشت و خوف پیدا ہو رہا تھا۔ مستقبل کو بھیانک تصور کرتے ہوئے میں نے سکینہ خانم سے کہا۔ "خدا نہ کرے۔ اگر ماں کا آسرا بھی جاتا رہا۔ تو میری زندگی کا کیا حشر ہوگا؟ ساری دنیا مجھ سے منہ موڑ چکی ہے۔ "وہ دنیا کے ہر تعلق میں چاہے کوئی کیسا ہی بےغرض کیوں نہ ہو۔ مگر حالات کے تواتر سے مجھے یقین آ گیا ہے کہ اس میں نفسانیت کو دخل ضرور رہوگا۔

سکینہ نے کہا۔ آپا جان معاف کیجیئگا۔ آپ نے کبھی کسی کے کہنے سننے کی پرواہ بھی کی ہے؟ یہی ہیبتناک وقت سب کو دکھائی دے رہا تھا۔ مگر آپ نے اس حالت کو کبھی مدنظر نہ رکھا۔

میں خاموش تھی اور سکینہ خانم کی باتوں پر دل ہی دل میں پیچ وتاب کھانے لگی۔

سکینہ خانم۔ آپا جان! حوصلہ کرو۔ اتنا وقت تو آپ نے زبردستی کرتے ہوئے ختم کر دیا پتھروں سے لعل توڑے۔ میرے پیسے اب کیوں بے دل ہو رہی ہیں؟ اپنے آپ کو سنبھالو۔ خدا کوئی سبیل بنا دے گا۔

میں۔ سکینہ خدا کیا سبیل بنائے گا۔ اب تو میری دنیا تاریک ہو رہی ہے۔

سکینہ۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ دنیا خود نہیں روشن ہوتی۔ بلکہ کی جاتی ہے۔

میں۔ میری تو سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔

سکینہ۔ سمجھ میں کیوں نہیں آتا؟ اگر والدہ صاحبہ کی موت واقع ہو گئی۔ تو اب تمہیں تمہارے سسرال کی خدمت میں وقت گزارنا پڑے گا۔ یا پھر اپنے وطن میں تنہا رہ کر خطرہ میں دن رات زندگی بسر کرنی پڑے گی۔ ممکن ہے کوئی ایسا وقت آ جائے کہ یہ چار پیسے تمہارے پاس ہیں۔ جنکو پانچ برس سے بیٹھی کما رہی ہو۔ ان کی خاطر کوئی تمہاری جان ہلاک کر دے۔ (کفِ افسوس ملکر) ہائے تقدیر! اب تک بھی تمہاری قسمت سے اس موقع پر دلوا لیئے ہو گئے۔ کاش کہ یہ روپیہ ہی کہیں حفاظت میں رہتا۔ روپیہ کا پاس رکھنا بھی ایک جوان تنہا عورت کے لئے زہر قاتل ہے!

حقیقت تو یہ ہے۔ کہ سکینہ خانم کے دل میں میرے لئے ایک خاص ہمدردی تھی۔ لہذا میں اس حقیقت پر غور کرنے لگی۔ سکینہ خانم کی زبان سے مجھ پہ سرال

کے تمام حالات مجھ پر واضح ہو گئے۔ اُس نے کہا ذرا خیال تو کیجیئے؟ میاں بخت نصر صاحب زندہ درگور۔ میاں فرخ سیر، سجادہ اور بچے کی ملک سے اپنا گزر اوقات کر رہے ہیں نابالغ بچہ کے خود مختار ہونے کے بعد اگر جائداد بچی تو پھر تقسیم ارث کے بعد میاں فرخ سیر کو بھی حصّہ مل جائیگا۔ ورنہ سر دست تو وہ خود ہی محتاج ہیں۔ اور دوسروں کے دستِ نگر۔ رہیں زاہدہ بیگم اور زہرہ بیگم۔ وہ اس وقت اپنے اپنے گھر کی مالک ہیں۔ آپ کی جو رشتہ داری ہے۔ وہ تو بدستور قائم رہے گی۔ البتہ آڑے وقت میں ان کا سہارا ابھی تلاش کرنا فضول ہے۔ کوئی عزیز کسی سے زندگی بھر امداد کا وعدہ نہیں کر سکتا۔ اور ہاں ایک دن آپ نے سید عطا واللہ صاحب بیرسٹر کا ذکر کیا تھا۔ کہ اُن کے ہاں سے بھی ایک پیغام آیا ہُوا ہے۔ کیا آپ نے ان کی بابت کوئی فیصلہ نہیں کیا ابھی؟؟

میں۔ کیا فیصلہ کروں سکینہ! مجھے تو کچھ سمجھ ہی نہیں آتا۔

سکینہ۔ اگر دل کو مضبوط نہ کیجیئے گا تو طبیعت اور بھی منتشر ہوتی جائے گی۔ میرے خیال میں تو سید صاحب نہایت شریف نیک مزاج اور معقول انسان ہیں اور ان میں وہ بد عادات بھی نہیں ہیں۔ جن سے آپ کو سخت نفرت ہے ممکن ہے کہ وہ آپ کی منشا کے مطابق آپ کے لائق ہو سکیں۔

میں۔ کیا کوئی میری طبیعت کی وارفتگی کو برداشت کریگا؟

سکینہ۔ یقین تو ہے۔ کہ وہ آپ کی بے حد قدر کریں گے!

میں۔ مگر دنیا مجھے کیا کہیگی؟؟

سکینہ۔ بلا سے دنیا کو بکنے دیجیئے۔ آپ کو اس قدر کمزور دل نہ ہونا چاہیئے

حالات بہت نازک اور خطرناک ہوتے جا رہے ہیں۔ آپ ان باتوں کی پرواہ نہ کریں۔
مَیں۔ نہیں سکینہ! لوگوں میں عجیب عجیب چہ میگوئیاں شروع ہو جائیں گی۔
سکینہ۔ ایسے معاملات میں، دنیا باتیں بنایا ہی کرتی ہے۔ لوگ تو سخت سے سخت مصیبت پر بھی ہمدردی کی بجائے کچوکے ہی دیا کرتے ہیں۔ کسی کی مجبوری کا اندازہ کوئی بھی نہیں کر سکتا۔ مگر خدا تو بہتر جاننے والا ہے۔ سو ایسی باتیں بنانا دنیا والوں کا شیوہ ہی ہے۔ خلوص کا احساس کسی کو کم ہی ہوتا ہے۔ بقول شاعر ؎

یہ دنیا رنج و راحت کا غلط اندازہ کرتی ہے
اس پہ خوب روشن ہے کہ جس پر جو گذرتی ہے

مَیں سکینہ کی باتوں پر غور کرنے لگی۔ اور اس سے کہہ دیا کہ اچھا سوچونگی اسے۔ مگر دل پریشان اور دماغ بیکار سا ہو چکا تھا۔ میں اپنے بستر پر لیٹ کر نیند لانے کی ناکام کوشش کرنے لگی۔ میرے کمرے سے ملحق والدہ صاحبہ کا کمرہ تھا۔ اس کا دروازہ کھلا ہونے کے باعث والدہ صاحبہ کا پلنگ مجھے صاف نظر آ رہا تھا۔ ابھی مجھے نیند نہ آئی تھی۔ یکایک میری والدہ صاحبہ کے کراہنے کی آواز نے مجھے دھچکا سا دیا۔ میں بدحواس ہو کر اُٹھی۔ اور بھاگ کر والدہ صاحبہ کے سرہانے پہنچ گئی۔ پیشانی پر ہاتھ رکھکر دیکھا۔ تو شدت کا بخار تھا۔ انہوں نے کروٹ بدلتے وقت نقاہت سے کراہنا شروع کر دیا تھا۔ مگر ذرا دیر میں پھر غنودگی کے عالم میں خاموش ہو گئیں۔ یہ دیکھ کر مجھ میں اپنے کمرہ میں جانے کی ہمت نہ رہی۔ والدہ صاحبہ کی پائینتی کی جانب ایک اور پلنگ پڑا تھا۔ اس پر لیٹ گئی۔ مگر نیند نے اسدن قسم کھا رکھی تھی۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں تین بج گئے۔ آہ وہ رات کس قدر ہولناک اور مایوس

کن تھی۔ آہ! جس کا اظہار کرنے سے قاصر ہوں۔ اندھیری رات میں ہوا کی سرسراہٹ سے میرے دل پر چوٹ لگ رہی تھی۔ میں اپنی تقدیر کے نشیب و فراز پر غور کرنے لگی۔ دل و دماغ کی دگرگوں کیفیت نے میرے حواس کھو دئے۔ میں خود کو مخاطب کر کے کہتی تھی ؎

نہ ہمت ہے نہ جرأت ہے نہ ہے تاب و تواں باقی
فقط حسرت سے تکنے کے لئے ہے آسماں باقی

میں نے تمام رات اسی التجا میں بسر کر دی۔ کہ یا الٰہی! میری والدہ کو میری بیکسی اور بے بسی کی خاطر ہی زندگی اور صحت دے۔ جو میرے مغموم دل کے لئے باعثِ قرار ہے اسکو بہت دیر تک میرے سر پر سلامت رکھ۔ میری تنہائی میں میری والدہ جو میرے لئے ہر حال میں سینہ سپر کرتی ہے۔ ان سے بڑھکر اور کوئی ہستی نہیں ہو سکتی جس پر میں یقین کروں۔ آہ! ان کے بعد میری امداد کرنے والا کوئی نہ ہوگا۔ اے خدا! مجھ دل شکستہ ناتواں پر رحم کر۔ والدہ کی بیماری کے تفکرات نے ایک وحشت کا عالم بپا کر رکھا ہے۔ اس شدتِ غم نے مجھ سے تیمار داری کی ہمت بھی چھین لی ہے ؎

التجا کرتی ہوں تجھ سے اے میرے کون و مکاں
آسرا دنیا میں ہے تیرے سوا میرا کہاں
بیکسی میری کا ہے اک تُو جہاں میں دادگر
میں تیرے قربان میری یہ دعا مقبول کر

میں دل شکستہ و ناتواں ہوں عاجز و لاچار ہوں۔ اے خدا کیا یہ وقت میری تقدیر میں تغیر و تبدل کر رہا ہے؟ کبھی سوچتی تھی۔ کہ کیا میرے دل کے جذبات فنا ہو گئے ہیں۔ جو میں اس قدر کمزوری محسوس کر رہی ہوں۔ اور اس قدر خوفزدہ ہوں کہ کوئی

میرا ہاتھ پکڑے جس کی حفاظت میں میری جان مال و عزت آبرو محفوظ ہو کر زندگی کے بقایا دن اطمینان سے گزر سکیں۔ یاس کے عالم میں بیکسی چھائی ہوئی تھی۔ کیا اس کو نوشتہ تقدیر کہتے ہیں؟ جس بات کو میں نے مردانگی سمجھ رکھا تھا۔ وہ کافور ہو رہی تھی بہت لوگوں کی تمناؤں کو میں نے پاؤں تلے روندھا تھا۔ کہ مجھے تمہاری ہمدردی کی ضرورت نہیں۔ میں تنہا رہ کر اپنی زندگی آرام سے گزار دونگی آج اس زندگی کا حشر یہ ہو رہا ہے؟ میرا دماغ ایسی الجھنوں میں گرفتار تھا! ور میں کسی فیصلہ پر پہنچ ہی نہ سکتی تھی۔

غرضکہ پے درپے صدمات نے زندگی تلخ کردی تھی۔ نہ جانے کیوں۔ اس دن مجھے ایک عزیز کا خیال آیا۔ اس کی مہربانیاں یاد آئیں تو میں بیتاب سی ہو گئی۔ مگر پھر میں نے دل کو سنبھالا اور خود کو ملامت کی۔ کہ آخر اب مجھے کیا حق ہے۔ کہ میں کسی پر کوئی توقع رکھوں۔ خیر جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا۔ اس کا غم کرنا ہی فضول ہے کیونکہ ؎ "آب رفتہ بجو نمی آید"

لیکن انسان سوچتا کچھ ہے اور ہوتا کچھ۔ دراصل میری قسمت برگشتہ ہو چکی تھی اور صبر و سکون ہمت و استقلال سب جواب دے چکے تھے۔ کبھی میں ان تمام عزیزوں کو اپنے تصور میں لا رہی تھی۔ جن کی ستم ظریفیوں سے میرے قلب کے زخم بار بار چھل چکے تھے۔ میرا دل ٹوٹ چکا تھا۔ میں اب ان کا نام لیکر بھی دکھ ہی محسوس کرتی تھی۔ لیکن میں نے پھر سوچا۔ کہ آخر ان پر افسوس کرنے سے کیا فائدہ؟

؎ جب توقع ہی اٹھ گئی غالب
کیا کسی پر گلہ کرے کوئی!

غرضکہ میں اپنے ستم رسیدہ دل پر انتہائی صبر کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ سچ

پوچھو تو میری روح سراسر حسرت و یاس کا مدفن بن گئی تھی۔ آخر گھڑی نے پانچ کا آلارم بجایا۔ میں رات بھر بغیر آنکھ جھپکے اپنے بستر سے اُٹھی۔ سکینہ کو جگایا۔ اور ملازمہ کو آواز دیکر کہا "تم ذرا والدہ صاحبہ کے پاس بیٹھو۔ میں نماز ادا کرنے جارہی ہوں" میں نے نماز کے بعد خدا سے برتر سے نہایت رجوع اور خشوع کے ساتھ دعا مانگی اس سے میرے دل کو ذرا سی تقویت ہوئی۔ مگر دماغ کی قوت زائل ہوتی جارہی تھی۔ اور میں اس دن کچھ ایسی وحشت زدہ اور مایوس ہوگئی تھی۔ کہ پناہ بخدا۔ گویا والدہ صاحبہ کی طویل بیماری نے میری جان پر بنا رکھی تھی۔ بس یہی خیال آتا تھا ؎

نہ تعلق ہے کسی سے نہ شناسائی ہے
انجمن میں ہوں مگر عالم تنہائی ہے

کسی نے سچ کہا ہے۔ کہ شب غم کی سحر نہیں ہوتی اور مصیبت میں دکھ کا احساس دوگنا ہو جاتا ہے۔ میں اپنے خیالات میں مستغرق ابھی جائے نماز پر ہی بیٹھی تھی۔ کہ سکینہ کی آواز آئی۔

"آپا جان! والدہ صاحبہ بلا رہی ہیں"

میں جلدی سے والدہ صاحبہ کے پاس گئی۔ انہوں نے کہا "میں بے حد کمزوری محسوس کر رہی ہوں۔ ذرا سے عرق کے ساتھ مجھے یاقوتی کھلا دو" میں نے یاقوتی کھلائی۔ بخار اس وقت بھی ایک سو کے قریب تھا۔ سکینہ اور میں دونوں والدہ صاحبہ کے پاس بیٹھی اپنے اپنے نشیب و فراز پر غور کر رہی تھیں تھوڑی دیر بعد سکینہ نے پھر سلسلہ گفتگو شروع کر دیا۔ اس نے مجھے بہت تسلی دی اور میری ہر طرح ڈھارس بندھاتے ہوئے کہا ؎

پست ہمت روتے رہتے ہیں سدا تقدیر کو
صاحب ہمت ہمیشہ کرتے ہیں تدبیر کو

میرے لئے سکینہ خانم کی ہمدردی ایک نعمت غیر مترقبہ تھی۔ مگر میں نے اسوقت اس کی بات کا جواب نہ دیا۔ اور سب کچھ خاموشی سے سنتی رہی۔ اس پر سکینہ نے بے چین ہو کر کہا۔

" آپا جان! آپ خاموش کیوں ہو گئیں؟ اگر میری کوئی بات ناگوارِ خاطر ہوئی ہو۔ تو میں وعدہ کرتی ہوں۔ کہ پھر کبھی ایسی بات نہ کہوں گی۔ یہ بھی محض آپ کی محبت کا تقاضا ہے۔ کہ جو دل میں آتا ہے اُسے عرض کئے بغیر رہ نہیں سکتی۔ کیونکہ مجھ سے ہر وقت آپ کی پریشانی نہیں دیکھی جاتی۔

میں نے کہا۔ سکینہ! تم خواہ مخواہ وہم کر رہی ہو۔ مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں۔ بلکہ میں تمہاری ہمدردی اور محبت کی ممنون ہوں۔ کہ اس مصیبت میں میرا ساتھ دے رہی ہو۔ خدا انہیں اس کا اجر دے۔ مگر آج رہ رہ کر مجھے عزیزوں کی باتیں یاد آ رہی ہیں۔ جنہوں نے مجھے بلا وجہ دکھ پہنچایا تھا۔

سکینہ۔ جانے بھی دیجئے ان خیالات کو وہ لوگ مغرور اور کچھ ایسی ہی فطرت کے مالک تھے۔ انہوں نے اپنی امارت کے نشہ میں چُور ہو کر ایسی حرکت کی۔ چلئے جانے دیجئے اب اس قصّہ کو ؎

" ملا نہیں صحرا نوردی پاؤں کی ایذا نہیں؟
دل دکھا دیتا ہے لیکن ٹوٹ جانا خار کا "

اصل رشتہ یا تعلق جو خون کے ساتھ ہوتا ہے۔ وہ تو والدہ صاحبہ کی ذات

کے سوائے اب آپ کا کوئی نہیں ہے۔ ورنہ جسکی لیئے آب حیات
اس نے اس سعادتمندی کے باعث بہتر سمجھا جو لوگ اچھا کہتے رہتے۔
یہ سب آپ کے اپنے اخلاق کا پھل تھا۔ حقیقت میں اپنا وہ ہوتا ہے۔ جو
عزیز کی غلطی کو درگزر کرے۔ سختی کو خندہ پیشانی سے سہہ لے۔ عیب
کو چھپائے۔ اور ہنر کی تعریف کرے۔ دنیا میں دکھ سکھ۔ بیماری وتندرستی
کامیابی وناکامی انسانی زندگی کے لاکھوں ناہموار راستے ہیں جن پر سفر
کرنے والے کو مختلف منزلیں اور کئی مقام ایسے پیش آتے ہیں۔ کہ ان
سے صرف حکمت عملی کے ساتھ گزرنا پڑتا ہے جس انسان کو تعلق یا
محبت قائم رکھنے کی خواہش ہوتی ہے۔ وہ کسی صورت میں بھی جدائی
گوارا نہیں کرسکتا۔ اور کسی قسمت پر بھی اپنے عزیز کا ساتھ نہیں چھوڑتا۔
معاف کیجیئے گا آپا!! یہ صرف دلی کمزوریاں ہیں جو آپ کو خواہ مخواہ
تنگ کر رہی ہیں۔ ورنہ آپ خود مختار ہیں۔ انسان دنیا کے سمندر میں ایک
بے دست وپا تنکے کی طرح بہتے چلے جانے کے لیئے پیدا نہیں ہوا۔ بلکہ وہ
ملاح کی طرح موجوں کا مقابلہ کرنے کے لیئے بنا ہے"

میں نے کہا۔ سکینہ! میں سب کچھ جانتی ہوں۔ مگر سردست کوئی فیصلہ
نہیں کرسکتی۔ میں نے اپنے جذبات کو اس قدر کچل ڈالا ہے۔ کہ اب نہ تو
ابھارنے سے وہ ابھرتے ہیں اور نہ زیادہ دبانے کی اب مجھ میں ہمت ہے
سکینہ! دل کمزور ہو چکا ہے۔ اور طبیعت بے قابو سی رہنے لگی ہے
اب میں ہر معاملہ میں "دیکھا جائیگا" کہکر سکون حاصل نہیں کرسکتی۔

پست ہمت کی عقل بھی قائم نہیں رہتی۔ بیشک انسان کو چاہئے کہ وہ ہمیشہ دل و دماغ کو عقل کی سان پر رگڑتا رہے۔ ورنہ یہ چیزیں بھی بیکار رہ کر زنگ آلودہ ہو جاتی ہیں؟"

سکینہ خانم (ٹھنڈی سانس بھر کر) آپا جان! بے شک۔ آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ ہم اپنے قیمتی وقت کو اگر رنجیدہ ہوئے تو پریشانی میں۔ اور خوش ہوئے تو غفلت میں ضائع کر دیتے ہیں۔ بے شک ہمیں اپنی زندگی کے ہر لمحہ کی قدر کرنی چاہیئے۔

غرضکہ ہم دونوں بہت دیر تک ایسی ہی باتیں کرتی رہیں۔ آخر والدہ صاحبہ کی دوائی کا وقت ہو گیا۔ میں نے انہیں دوائی پلائی۔ اور ان کے لئے غذا تیار کرنے میں مشغول ہو گئی۔ مگر میرے دل میں جو وسوسے پیدا ہو گئے تھے۔ وہ مجھے کسی پہلو بھی چین نہ لینے دیتے تھے۔ میرا حوصلہ دن بدن پست ہوتا جا رہا تھا۔ اور میری مایوسیاں لمحہ بہ لمحہ بڑھتی چلی جا رہی تھیں۔ آہ! بیکسی کی انتہا تھی ؎

"رہ گئے پاؤں جہاں ہے بس وہی منزل میری"

باہتمام لالہ کیشب چندر ہانڈہ بی۔ اے منیجنگ پروپرائیٹر ہانڈہ الیکٹرک پریس جالندھر شہر میں چھپی۔ اور سید ذکاء اللہ شاہ نے جالندھر شہر سے شائع کی ؛

تشنگان علم تصوف کے لئے آبحیات
سالکانِ منزل بقا کے لئے رہبرِ اعظم
یعنی
آفتابِ چشتیہ ماہتاب قادریہ قطب الاقطاب حضرت سید علیم اللہ شاہ
صاحب فاضل جالندھری الحسنی الحسینی القادری قدس سرہٗ
کی
معرکتہ الآرا تصنیف

نزہتہ السالکین

کا

اُردُو ترجمہ

از
سید عطاء اللہ شاہ صاحب بیرسٹرایٹ لا

نزہتہ السالکین آنحضرت موصوف کی قلمی تصنیف ہے۔ حضرت موصوف شیخ المشائخ والاولیا حضرت ثانی میر محمد سعید المعروف سید میراں شاہ بھیکھ رحمتہ اللہ علیہ کے خلفائے خاص میں سے تھے۔

نزہتہ السالکین کا مطالعہ سالکان راہ طریقت کے لیئے روشنی کا موجب ہوگا۔

مولانا مرتضیٰ احمد خانصاحب اپنے روزنامہ "شہباز" میں لکھتے ہیں۔ نزہتہ السالکین دین و تصوّف اور تزکیہ نفس کا شوق رکھنے والے اشخاص کیلیئے روح کی تسکین اور وجدان کی روشنی کی موجب ہوگی۔"

حضرت مولانا مولوی عبدالحق صاحب عباس بانی مدرستہ البنات و صدر انجمن اشاعت اسلام شہر جالندھر اپنے رسالہ مسلمہ ماہ دسمبر ۴۲ء میں لکھتے ہیں۔

" یہ کتاب مستطاب حضرت قدوۃ العارفین، سوۃ الواصلین پیر طریقت پناہ شیخ حقیقت آگاہ سید علیم اللہ شاہ الحسنی الجشتی القادری قدس سرہٗ کی تصنیف منیف ہے حضرت المصنف رحمۃ اللہ علیہ اپنے عصر کے ممتاز علمائے شریعت صاحب کرامت اولیاء اللہ میں سے تھے۔ آپ کا مزار مبارک شہر جالندھر میں مرجع خواص و عوام اور بہشتی دروازہ کے نام سے مشہور بین الظاہر ہے۔ حضرت ممدوح کی متعدد تصانیف تو فن طباعت کے اجراء کے ساتھ ہی طباعت سے آراستہ ہو کر موت سے نایاب بھی ہو چکی ہیں۔ اور بعض گرانقدر مصنفات اشاعت و طباعت ارباب ذوق کیلئے اتنک مرکز اشتیاق اور محور انتظار رہی ہے جنہیں سے ایک نفیس انیق تحفہ یہی نسخہ ہدایت آئین نزہتہ السالکین ہے جو گرم رواں سالک فنا اور زود رساں منازل بقاء کیلئے خضر رفیق اور منارِ طریق ہے ہم ذات جالندھر کے جلیل الشان خاندان الحسنی، البلخی کے سپل نہیل فدائے ملت بنیطا سید عطاء اللہ صاحب بیرسٹرایٹ لاکے صمیم قلب سے شکر گذار ہیں کہ آں محترم نے علم تصوف کی اس جامع کتاب اردو میں ترجمہ فرماکر اسکے فوائد کو عام کردیا۔ حجم ۲۷۶ صفحات عبارت سلیس و عام فہم۔ قیمت ایکروپیہ چارآنہ۔

ملنے کا پتہ: ۔ سید ذکاء اللہ شاہ کوٹ پشکہ جالندھر شہر

نثر الجواھر یعنی سیرت نبویؐ

اُس جلیل القدر انسان کی سیرت جسے رب العزت نے رحمۃ للعالمین کا خطاب دیا
اُس پاک و برگزیدہ ہستی کی سیرت جسکی زندگی کا ایک ایک لمحہ قرآن کریم کی تفسیر عملی ہے

یعنی

سیرت پیغمبر آخر الزماں سید المرسلین خاتم النبیین

محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کو ایک عربی کی مستند قلمی کتاب سے شہرۂ آفاق عالم و صوفی قطب الاقطاب حضرت سید علیم اللہ شاہ صاحب فاضل جالندھری قدس سرہٗ نے فارسی میں ترجمہ کیا۔ عامۃ المسلمین کو حضور پرنور صلعم کے متعلق مستند و با تفصیل حالات سے آگاہ کرنے کیلئے فارسی سے سلیس اردو میں ترجمہ کروایا گیا ہے۔ اس سے پیشتر اتنی مساوٗ اور عام فہم کتاب اردو میں پیش نہیں کی گئی حجم ۱۸۴ صفحات سائز ۲۰×۲۶/۸ کتابت و طباعت عمدہ۔ قیمت صرف ایک روپیہ (عہ/ ر)

ملنے کا پتہ:۔ سید ذکا اللہ شاہ حسنی۔ کوٹ پشکہ جالندھر شہر

زبدۃ العارفین قدوۃ السالکین قطب الاقطاب حضرت میر محمد سعید المعروف
میراں سید بھیکھ صاحب گھڑامی رحمۃ اللہ علیہ
کے

معرکۃ الآرا کلام

گیان لہر - گیان پرکاش - سی حرفی کے گراں مایہ نسخوں کا مجموعہ
جو مدت سے نایاب ہو گئے تھے۔ اور جس کے لئے ارباب
ذوق نہائت بےتابی سے محو انتظار تھے
شیخ المشائخ حضرت قبلہ عبدالغنی شاہ صاحب مدظلہ العالی
سجادہ نشین درگاہ آنحضرت موصوف ٹھسکہ میراں جی کے
ارشاد گرامی کی تعمیل کرتے ہوئے نہایت احتیاط اور
اہتمام سے طبع کر دیا گیا ہے۔ اس کا مطالعہ سالکان
راہِ طریقت کے لئے ذوق و وجدان میں اضافہ کا موجب
ہوگا۔

ملنے کا پتہ

سید ذکاء اللہ شاہ - کوٹ پشکہ - جالندھر شہر